قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جون 2016، قیمت -/15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

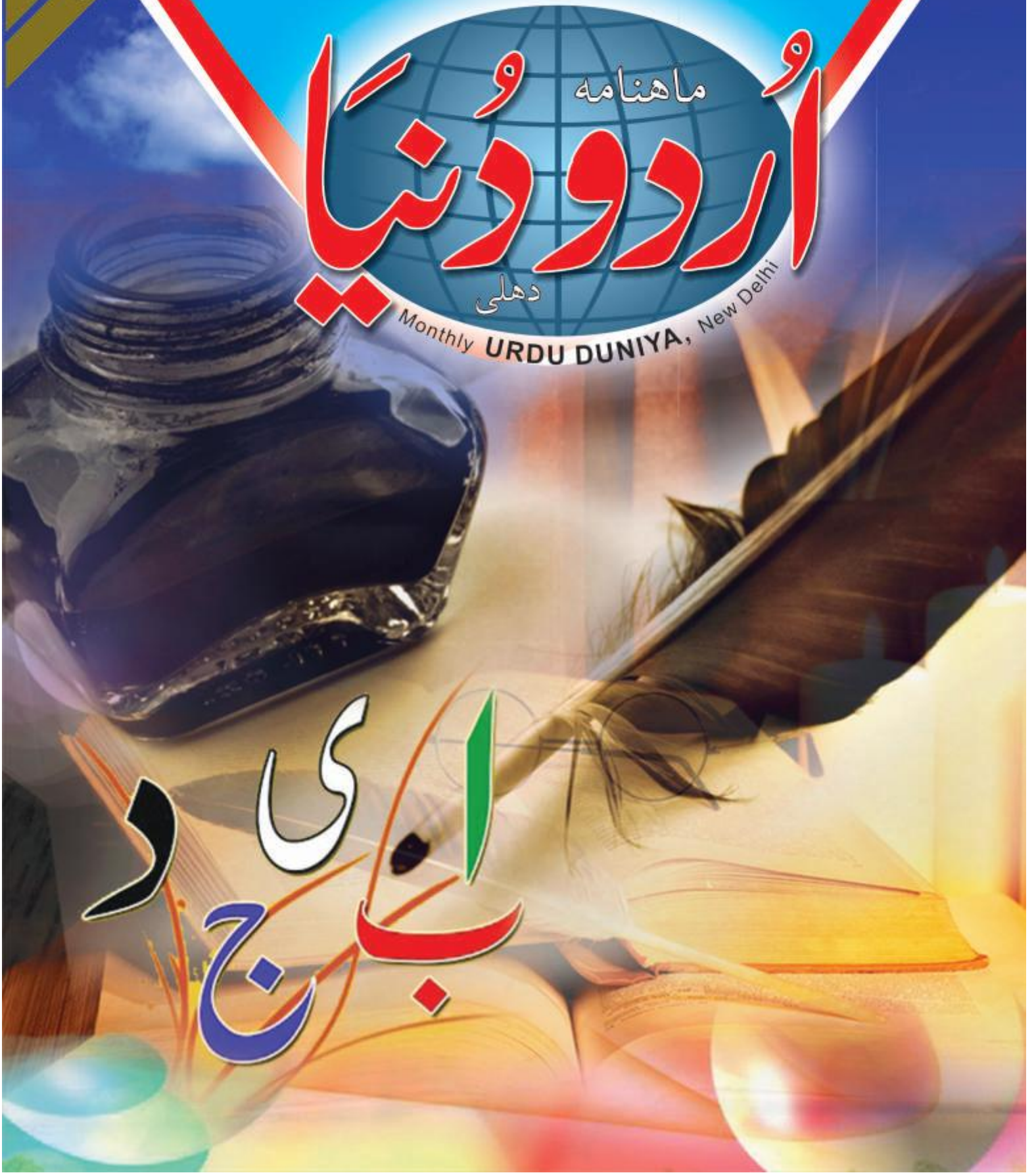

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:18، شمارہ:6، جون 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-1-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
آپ اہل زبان ہیں تو پھر اردو زبان کو زندہ رکھیے: اقبال مہدی محمد غالب نشتر 8

زبان و تعلیم
اردو زبان کے موجودہ مسائل محمد سہیل انور 12

ادبی مباحث
راشد کی فکری اور فنی جہات
اورنگ آبادیاتی مضمرات ابوالکلام قاسمی 14
جدید اردو غزل میں 'زلزلہ' مناظر عاشق ہرگانوی 17
اردو شاعری میں خط کا ذکر نذیر فتح پوری 19
ہندی زبان و ادب میں صنف غزل کا مقام احترام اسلام 22
مولانا آزاد کے افکار و نظریات ماجد دیوبندی 24
شاہنامہ کا بین الاقوامی علمی سفر محمد ذاکر حسین 26

سلسلۂ صحافت
اردو کی ادبی صحافت کا تدریجی ارتقا عزیز نبیل 29

خراج عقیدت
پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی یاد میں قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی 36
یادیں پال انکل کی محمد بشیر مالیر کوٹلوی 38

جوگندر پال کا تخلیقی کمال اسلم جمشید پوری 40

نگر نگر اردو
پٹیالہ میں اردو عابد علی خان
لداخ میں اردو محمد سجاد

ہم نے جنھیں بھلا دیا
حفیظ ہوشیار پوری: شاعر شہر محبت محمد علی اثر 47

محسنین اردو
منشی نول کشور حسین الحق 49
لالہ رام نرائن لعل نجمے کمار 51

تہذیب و ثقافت
ہندوستان اور ازبکستان کے درمیان
سماجی اور تہذیبی روابط ابوسعد اعجاز 53
موسیقی اور ہماری زندگی اختر آزاد 55

معاشیات
ہندوستان میں غربت و افلاس کا تصور اطہر رضا بلگرامی 57

صحت
دانہ پانی جمال نصرت 61

فلم
موتی لال انیس امروہوی 63

کوئز
ادبی کوئز غلام نبی کمار 65

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 67

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 78

ہماری بات

گلوبلائزیشن اور عالمی سطح پر تبدیلیوں کے عمل نے ہمارے طرزِ فکر کو متاثر کیا ہے۔ بہت سی سطحوں پر ہماری ترجیحات تبدیل ہو چکی ہیں۔ نئے عہد کے مسائل اور موضوعات ہمارے روبرو ہیں۔ ان مسائل پر غور و فکر کی راہیں ہموار ہو رہی ہیں۔ کچھ ادبی مجلّات بھی اس ڈسکورس میں شامل ہیں مگر زیادہ تر ادبی مجلوں کی اشاعت کے جواز پر سوالات بھی قائم کیے جا رہے ہیں۔ نئے سائنسی، سماجی علوم کے دور میں ادب کو بھی افادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش جاری ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ آج کے عہد میں ادب کی معاشرتی افادیت کیا ہے؟ اور رسائل کس حد تک معاشرتی مطالبات سے ہم آہنگ ہیں۔

ادبی رسائل کی عمومی راہ و روش کچھ ایسی ہے کہ وہ کچھ ایسے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں جن کی موجودہ عہد میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ اب نئے عہد کے تقاضے تبدیل ہو چکے ہیں اس لیے لازمی ہے کہ ان مسائل پر خاص طور پر رسائل کو مرکوز کیا جائے جو ہماری موجودہ معاشرت، ثقافت اور سیاست سے متعلق ہوں اور جس سے معاشرتی ترقیات کی تصویر سامنے آتی ہو۔ مغرب میں بھی تخلیق اور تحقیق کا منہج تبدیل ہوا ہے اور یہ تبدیلی خوشگوار ہے کہ وہ ان مسائل پر مرکوز ہے جن کا انسانی زندگی سے بنیادی رشتہ ہے۔ پرانے زمانے کے کچھ رسائل انسانی زندگی کے تمام تر معاملات اور مسائل پر محیط ہوا کرتے تھے۔ سائنسی، سماجی اور تاریخی علوم پر بیش قیمت تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ ان رسائل میں ایک طرح کا تنوع تھا جس میں مختلف ذہنی سطح کے قارئین کے ذوق کی تسکین کا سامان موجود تھا۔ ادھر جو ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں ان میں زیادہ تر وہ نظریاتی مباحث ہوتے ہیں جن کی دانشورانہ حلقے میں قدر و ستائش تو ہو سکتی ہے مگر ایک عام انسان کو ان نظریاتی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے اب ادبی رسائل کو بھی اپنا اندازِ نظر تبدیل کرنا چاہیے۔ یہ تبدیلی وقت اور معاشرے کی ضرورت ہے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' نے اپنے اشاعتی سفر میں ان معاشرتی تقاضوں کا خاص طور پر خیال رکھا ہے اور ان موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے جن کا براہِ راست انسانی معاشرے اور اس کی ترقیات سے تعلق ہے۔ خاص طور پر کریئر، صحت، سائنس، معاشیات، سماجیات پر اردو دنیا کا ارتکاز رہا ہے۔ یقیناً اس طرح کے موضوعات سے رسالے کی ایک معاشرتی افادیت سامنے آتی ہے۔ پھر بھی 'اردو دنیا' میں کچھ اور تبدیلیوں کی گنجائش ہے۔ اس لیے اب 'اردو دنیا' کو زیادہ متنوع بنانے کے لیے کچھ ایسے سلسلے شروع کیے جائیں گے جن سے ہندوستانی ثقافت اور معاشرت کے سارے رنگ سامنے آسکیں۔ اب کوشش یہ ہوگی کہ ہندوستان کی معاصر زبانوں کے ادب اور رجحانات سے بھی قارئین کو روشناس کرایا جائے اور ان زبانوں میں اردو کے امکانات کی جستجو کی جائے۔ مثال کے طور پر ہندی، پنجابی، مراٹھی، تیلگو، تمل، کنڑا میں اردو کے تعلق سے اور اردو میں ان زبانوں کے تعلق سے کیا کام ہو رہا ہے، اس پر بھی گفتگو ضروری ہے۔ ان زبانوں کے بڑے تخلیق کاروں سے اردو والوں کو اور اسی طرح اردو کے قلم کاروں سے ان زبانوں کے قارئین کو روشناس کرانا بھی ضروری ہے تاکہ لسانی سطح پر یکجہتی اور ہم آہنگی کی فضا قائم ہو سکے۔ تاریخ، جغرافیہ، مشاہیر کی سوانح عمریاں، سفرنامے، شہرنامے، فنونِ لطیفہ، اطلاقی سائنس، وغیرہ جیسے موضوعات بھی آج کی نئی نسل کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔

ہمارے یہاں ایسے بزرگ قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے پاس معلومات اور تجربات کا خزینہ ہے۔ کوشش ہوگی کہ ان بزرگوں کی یادیں اور باتیں بھی ہمارے قارئین کے لیے محفوظ ہو سکیں۔ قدیم رسالوں نے بہت سے ایسے خصوصی شمارے شائع کیے تھے جو دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، ان رسالوں کے تعارف اور تبصرے کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا جا سکتا ہے۔ زبان فہمی و زبان شناسی جیسے سلسلے کی بھی آج کے عہد میں شدید ضرورت ہے۔

ماضی میں بہت سی ادبی اور ثقافتی انجمنیں متحرک تھیں ان انجمنوں کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے تاکہ ہمیں اردو کے ارتقائی سفر کا صحیح اندازہ ہو سکے اس لیے ہندوستان کی تمام ریاستوں میں اردو کی صورت حال کے حوالے سے ایک سیریز بھی شروع کی جا سکتی ہے اور ان علاقوں میں فروغ اردو کے امکانات بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے نئے موضوعات ہیں جنھیں اب 'اردو دنیا' کا حصہ بنایا جائے گا۔ اس طرح کی تبدیلیاں اس لیے ضروری ہیں کہ رسائل کا کام صرف نظریاتی مباحث میں قارئین کو الجھانا نہیں بلکہ ان کے ذہن کی گرہیں کھولنا اور نئے امکانات سے روشناس کرانا بھی ہے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

اردو دنیا، مئی 2016 کا شمارہ اپنی امتیازی خوبیوں کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ اس کے مندرجہ ذیل محققانہ اور معلوماتی مضامین بہت زیادہ پسند آئے اور ان سے اپنے محدود علم میں اضافہ ہوا: قرۃ العین حیدر سے گفتگو، رپورٹ کے تحت: ممبئی میں صحافت کے دو سو سال۔ مہاراشٹر کے حوالے سے سیمینار، ریڈیو اور ریڈیو نشریات کے تحت: معاشرے کی بیداری میں ریڈیو کا رول، کمیونٹی ریڈیو کی تحریک اور امکانات، ادبی مباحث کے تحت: ابن صفی کے نام سے شائع ہونے والے دو جعلی ناول 'سائے کا قتل' اور 'روشنی کی آواز'، سلسلہ صحافت کے تحت: اردو کے دو عہد ساز ادبی جرائد 'ادب لطیف' (لاہور) اور 'شاعر' بمبئی، کوئز کے تحت اردو کوئز، کتابوں کی اشاعت کے تحت: تبصرہ و تعارف۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی: سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

مئی کا شمارہ حسب معمول دیدہ زیب سرورق اور 'ریڈیو نشریات و اردو' جیسے نایاب موضوع سے متعلق گوشے پر مبنی اعلیٰ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں شہرۂ آفاق لیجنڈری فکشن نگار کے ساتھ آصف جیلانی صاحب کے نایاب مشافہے کو شامل کرنا ادارے کا ہی حصہ ہوسکتا تھا۔ سوال و جواب کے قدیم طریقۂ کار سے الگ ہٹ کر اس میں نیا اسلوب اختیار کرکے بھی ایک مصاحبے کے لیے درکار تمام تر شرائط کو پورا کیا گیا ہے۔ عینی آپا کا یہ ایک اعلان ہی ہے کہ ''میں پلان بنا کر ناول لکھنے کے لیے کسی ملک میں نہیں جاتی اور اگلے ہی کالم میں درج کیا گیا ہے کہ کافی تحقیق کے بعد نئے ناول 'گردش رنگ چمن' کی ریسرچ کے لیے رام پور گئی اور...۔ وہاں رضا لائبریری میں ریسرچ ...سو میں یہاں لندن آئی۔ انڈیا آفس لائبریری سے کچھ میٹریل لیا۔'' وغیرہ اقوال ایک دم متضاد ہی ٹھہرتے ہیں۔

احمد سہیل صاحب کا زیر عنوان 'اردو کے دو عہد ساز....'' مقالہ بھی بلند پایہ و موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرنے والا ہی ہے۔ اسی مضمون کے تحت موقر جریدہ 'شاعر' کی خدمات کو ہر چند نشان زد کیا گیا ہے، تاہم موجودہ مدیر افتخار امام صدیقی صاحب کی صحافتی خدمات کی خصوصی طور پر مزید خط کشی درکار تھی۔

جگر تجمل اسلام صاحب کا شاعرِ اعظم حالی کے 144 اشعار پر مشتمل نظم 'برکھا رت' کا تجزیہ بھی کمال کے اختصار کے ساتھ ہوا ہے۔ اردو و ہندی زبان کے بھی تمام تر طلبا و اساتذہ کے تئیں از حد معلوماتی 'ادبی کوئز' کو آگے بھی جاری ساری رکھیں۔ اگر ممکن ہو سکے تو اسی میں بطور موضوع مقبول عام اشعار، شعرا کے نام، ان کے تخلص و نظموں کے عنوانات وغیرہ کی بابت بھی سوالات شامل کیے جاسکتے ہیں۔

کرشن بھاوک: A-201، گورو نانک نگر گلی نمبر K-18، پٹیالہ

مئی کا شمارہ وقت پر ملا! ریڈیو نشریات پر خصوصی شمارہ بہت خوب اور وقت کی ضرورت کو پورا کرنے والا شمارہ ثابت ہوا۔ تمام مضامین انتہائی معلومات افزا اور ہماری اس تاریخ کا بیان ہیں جب ریڈیو معاشرتی، سماجی، تاریخی، سیاسی غرض ہر سطح پر اہم کردار ادا کرتا تھا۔ لوگ خبریں اور دیگر نشریات سے باخبر اور لطف اندوز ہونے کے لیے بھیڑ کی شکل میں چوک چوراہوں پر جمع ہوتے تھے۔ 'امین سایانی کا انٹرویو' بہت شاندار ہے۔ اس لیے بھی کہ امین صاحب عرصے سے 'ریڈیو سٹی نائنٹی ون پوائنٹ ون' کے لیے فلمی دنیا کی شخصیات کے خود انٹرویو لیتے رہے ہیں۔ ادبی مباحث کے زیر عنوان محمد عارف اقبال کا مضمون 'ابن صفی کے نام سے شائع ہونے والے دو جعلی ناول 'سائے کا قتل اور روشنی کی آواز' بہت خوب اور قابل مطالعہ مضمون ہے۔

عمران عاکف خان: 259 تاپتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

آپ کے ادارے کی جانب سے خاکسار کو اردو دنیا قریب ڈیڑھ برس سے بھیجا جارہا ہے۔ تبصرے کے لیے وقت نکال نہ سکا تھا، اس کے جواز میں 'مکروہات دنیوی' کی اصطلاح کی آڑ لینے کی اجازت دیجیے۔

اردو دنیا کا ہر شمارہ غور سے پڑھتا ہوں، حسن انتظام کی داد دیتا ہوں، مندرجات سے حظ اٹھاتا ہوں، معیار دیکھ کر حیران ہوتا ہوں، قیمت دیکھ کر پریشان ہوجاتا ہوں۔ ہمارے یہاں تو اس قیمت میں اس معیار کا پرچہ نکالنے کی بات کسی سے کہیے تو اگلا دیوانہ سمجھ کر مارنے کو دوڑے۔

اپریل کا پرچہ پڑھا۔ جی خوش ہوا۔ 'سینما اور اردو زبان و ادب' داؤد محسن کا دلچسپ مضمون ہے۔ اس موضوع پر گزشتہ چند برسوں میں ہند سے کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ بھوپال میں ایک صاحب محمد خالد عابدی ہیں۔ یہ نواب سلطان جہان بیگم کے خانوادے سے ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ 'ہماری فلمیں اور ادب' اور 'فلمی انٹرویو'۔

سچ پوچھیے تو میں ہمیشہ 'تبصرہ و تعارف' کا گوشہ سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ نئی کتب سے واقفیت ہوجاتی ہے، فائدہ رہتا ہے۔ ان میں سے کوئی 'انتہائی مطلوب' کتاب برادرم انیس الدین کے ذریعے فوری طور پر منگوا لیتا ہوں اور ان کے اور آپ کے حق میں دعا کرتا ہوں۔ دونوں ملکوں کے مابین کتب و رسائل کی ترسیل میں ڈاک خرچ جس خوف ناک طریقے سے آڑے آیا ہے اس سے ہم سبھی واقف ہیں۔ صفحہ 77 پر ایک انگریزی تحریر کو اردو کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے، عنوان ہے '' اردو کے اشعار دماغ کے لیے آب حیات ہیں''۔ عجب تحقیق ہے صاحب۔ اسے ''صرف اردو کے اچھے اشعار دماغ کے لیے آب حیات ہیں'' ہونا چاہیے۔ موجودہ صورت حال میں تو آج کل جیسی شاعری ہورہی ہے وہ دماغوں یا ذہنوں کے لیے 'آب وفات' کا کام کررہی ہے۔ دونوں ملکوں میں یہی حال ہے۔ مشفق خواجہ نے کیا خوب کہا تھا کہ ''فی زمانہ جس رفتار سے شعرا کرام پیدا ہورہے ہیں، اس کے مقابلے پر قارئین کی شرح پیدائش بہت کم ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ آگے چل کر یہ صنف بالکل ہی معدوم ہوجائے گی۔''

حال ہی میں اردو دنیا کو ندا فاضلی اور زبیر رضوی

سے جدائی کا غم برداشت کرنا پڑا ہے۔ پرچے میں دونوں شخصیات کو یاد کیا گیا ہے۔ ندا فاضلی پر غلام ابن سلطان کا مضمون معلوماتی ہے۔ وقار صدیقی صاحب کا ندا فاضلی سے لیا انٹرویو بھی خاصا دلچسپ ہے۔

حال ہی میں راقم نے دو کتابیں مرتب کی ہیں۔ اردو کے نادر و کمیاب شخصی خاکے، دو جلدوں میں اور مختصر سفرنامے اور رپورتاژ، رسائل و جرائد سے۔ اول الذکر میں ندا فاضلی کا مولانا سہا مجددی پر لکھا خاکہ اور موخر الذکر میں ان کا ایک دلچسپ رپورتاژ 'بمبئی سے اودے پور تک' شامل کیا ہے۔ خیال تھا کہ ان کو یہ کتابیں بھیجوں گا مگر جو خدا کی مرضی۔ زبیر رضوی مرحوم سے دو ملاقاتیں یہاں کراچی میں ہوئی تھیں۔ اور دونوں ملاقاتوں میں ابن صفی مرحوم کا تذکرہ رہا تھا۔ لیجیے، یہ ذکر نکلا تو میں اردو دنیا کے مئی 2016 کے پرچے میں شائع ہوئے ایک مضمون کا ذکر کر کے اجازت طلب کرتا ہوں۔ لکھنؤ سے ڈاکٹر عمیر منظر نے اس کی اطلاع دی تھی۔ یہ عارف اقبال صاحب کا مضمون ہے، عنوان ہے ''ابن صفی کے نام سے شائع ہونے والے دو جعلی ناول۔ سائے کا قتل اور روشنی کی آواز۔''

اردو دنیا میں ابن صفی صاحب کا ذکر خیر ہونے لگا ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے۔ ویسے بھی ہندوستان میں صفی صاحب پر تین بھرپور سیمنار ہو چکے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہندوستان میں ان کے چاہنے اور سمجھنے والے، ان کی قدر کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا جب نکہت الہ آباد سے عباس حسینی ان ناولوں کو شائع کرتے تھے اور ہر سو ان کا چرچا تھا۔ میں نے وہ ناول بغور دیکھے ہیں، ان میں قارئین کے خطوط بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ ان میں بیشتر ہندو اور سکھ حضرات ہوا کرتے تھے جو عباس حسینی کو لکھا کرتے تھے کہ ہم نے ابن صفی کی محبت میں اردو سیکھی۔ میں اس موقعے پر ہندوستان کی جامعات سے وابستہ پروفیسر حضرات سے ایک درخواست کرنا چاہوں گا کہ عباس حسینی مرحوم پر تحقیقی کام نہیں ہوا، براہ کرم اسے ممکن بنائیے۔ اسی طرح اظہار اثر، مسعود جاوید اور اکرم الہ آبادی پر بھی نہ صرف کام ہونا چاہیے بلکہ ان کے ناولوں کی مکمل فہرست بھی بنائی جانی چاہیے۔ نیز جاسوسی ادب کے ارتقا کے موضوع پر بھی کام ہونا چاہیے۔

راشد اشرف: کراچی، پاکستان

'اردو دنیا' اپریل 2016 ہمدست ہوا جس میں معمارِ آئین بھارت رتن ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے بارے میں گرانقدر مضامین شامل ہیں۔ جن میں ص 10 پر دیا گیا خواجہ عبد المنتقم کا مضمون گہرائی او رگیرائی لیے ہوئے

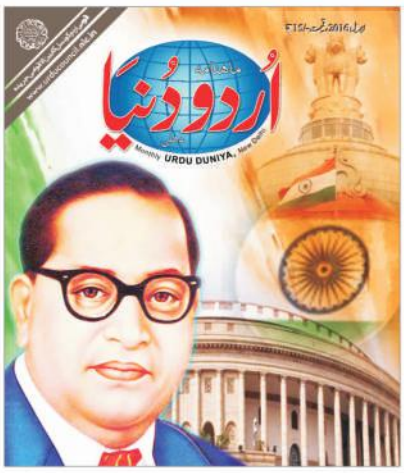

ہے۔ اس کے علاوہ ص 12 اور ص 15 پر بابا صاحب کے بارے میں شامل نگارشات بھی نہایت عمدہ اور معلوماتی ہیں۔

بڑی عنایت ہے کہ آپ نے ص 45 پر مضمون 'قانونی نکات'، 'قانونیات' کے ذیل میں شامل کیا۔ قومی اردو کونسل کے گوشہ قانونیات کی ابتدا گویا اسی مضمون سے ہوئی ہے۔ آپ نے یہ اچھا کیا کہ سابقہ عنوان قانونیات کو 'قانونی نکات' سے بدل دیا کیونکہ قانونیات پوری کتاب کا ٹائٹل ہو سکتا ہے جبکہ مذکورہ مضمون اس کے صرف پہلے باب کا اختصار ہے۔ اس لحاظ سے 'قانونی نکات' موزوں ترین عنوان ہے۔ اس مضمون کی تیاری کے دوران مصنف بستر علالت پر دراز تھا، اس لیے نظر ثانی کے باوجود کامل توجہ مرکوز نہ ہو پائی، اور نتیجتاً چند اغلاط راہ پا گئیں۔ پہلی تو یہ کہ ص 47 پر (Extraversion) جولیس اسٹون کا مجوزہ ایک طریق تحقیق ہے جس کے تحت قانون کے علاوہ دیگر شعبہ جات سے اخذ شدہ عصری علوم کی روشنی میں باریک بینی سے جانچ کی جاتی ہے۔ اس اصطلاح کو اگر اردو میں وضع کیا جائے تو Extra یعنی اضافی اور Version کے معنی گو کہ سبھی انگریزی-اردو لغات میں عموماً ترجمہ، بیان وغیرہ دیے گئے ہیں۔ جو اس موقع پر فٹ نہیں بیٹھتے۔ البتہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی کی جم پاکٹ ڈکشنری 2003 کے ص 487 پر Version کے دیگر معنوں کے علاوہ ایک معنی 'تاویل' بھی دیے گئے ہیں جو مناسبت سے قریب ترین لگتے ہیں۔ اس طرح Extraversion کی اصطلاح اردو میں وضع کی جائے تو یہ 'اضافی تاویل' ہو سکتی ہے اور Extra-Legal-Version کی اردو اصطلاح اضافی-قانونی-تاویل مناسب ترین ہوگی۔ لیکن اس کے بجائے ص 47 پر طریق قانونی تحریک غلط چھپ گیا ہے جس کے لیے مصنف کو بہت افسوس ہے۔ ص 47 پر ہی تخالف کے لیے انگریزی میں Contrast اور معنویات کی بجائے معنویت صحیح ہے۔

ندیم غوری: پلاٹ نمبر 32، ناگسین کالونی، اورنگ آباد

'اردو دنیا' اپریل 2016 کا شمارہ تاخیر سے ملا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ آج امریکہ، کناڈا اور دیگر یورپی ممالک کے علاوہ اسپین سے اردو رسالے اور اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ موصوف کی اس بات میں صد فی صد سچائی ہے مگر جو رسالے مندرجۂ بالا ممالک سے شائع ہو رہے ہیں ان کے پڑھنے والے خود ان کے ممالک میں کتنے ہیں؟ اور یہ اردو رسالے شائع کرنے والے کیا اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دیتے ہیں؟ اس بار مضامین کا حصہ بڑا معلومات انگیز ہے۔

نثار احمد صدیقی نے حمایت علی شاعر مرحوم سے انٹرویو لیتے ہوئے کئی اہم سوال پوچھے ہیں مگر یہ سوال نہیں کیا کہ انھیں ہندوستان چھوڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی—؟ محترمہ عسکری صفدر کا مضمون 'خورشید احمد جامی جدید غزل گو' اطمینان بخش نہیں ہے وہ اس لیے کہ عسکری صاحبہ نے جامی کی شاعری یا غزل گوئی کی آفاقی سمتوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دوسری بات یہ ہے خورشید احمد جامی کی وفات کے چار سال بعد ان کے شاگرد رشید محمود خاور مدیر 'برگِ آوارہ' حیدرآباد نے 1974 میں 'جامی شخصیت اور فن' پر ایک ضخیم نمبر ادارہ برگِ آوارہ کی جانب سے شائع کیا تھا۔ اس نمبر میں خسروانِ مملکتِ ادب کے مضامین جگہ پائے تھے۔ عسکری صاحبہ لکھتی ہیں کہ یہ نمبر کراچی سے شائع ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ محمود خاور نے کراچی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد دوبارہ یہ نمبر کراچی سے شائع کیا ہو۔ ندا فاضلی مرحوم پر تین مضامین ہیں۔ میراجی اور اختر الایمان کے بعد ندا فاضلی اردو نظم کا بڑا شاعر ہے جس کی نظموں میں ایک نیا انسان اور اردو ادب کا نیا ہندوستان سانس لے رہا ہے۔ ندا فاضلی نے گیتوں، دوہوں اور نظموں کی صورت میں دنیائے ادب کو بہت کچھ دیا اور خالص ہندوستانی اردو سے دنیائے شعری ادب کو متعارف کروایا۔

علیم صبا نویدی: فلیٹ نمبر 16، رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی

'اردو دنیا' شمارہ اپریل 2016 میں ندا فاضلی پر دو مضمون ہیں۔ غلام ابن سلطان نے اپنے مضمون میں ندا فاضلی کی پیدائش 2 اکتوبر 1938 میں گوالیار میں ہونا بتلایا ہے جبکہ ان کے دوست شکیل گوالیاری نے اپنی کتاب 'پتھروں کے شہر میں' اور برتر گوالیاری نے گوالیار اور اردو زبان و ادب میں ان کی پیدائش، ان کے ننہیال دہلی میں ہونا تحریر کیا ہے۔ ندا کی والدہ کا نام جمیل فاطمہ اور تخلص مخفی تھا۔ وہ کشمیر کے فاضل علاقے کی رہنے والی تھیں۔ اسی لیے ندا اپنی ماں کی نسبت سے ندا کے ساتھ فاضلی لکھتے

تھے۔ عارف حسین جونپوری نے اپنے مضمون میں ندا کے والد کا نام شفا گوالیاری لکھنے کی بھول کی ہے۔ ندا کے والد کا نام مرتضیٰ حسن اور تخلص دعا ڈبائیوی تھا۔ وہ ہاپوڑ کے قریب ڈبائی کے رہنے والے تھے وہ نوح ناروی کے شاگرد تھے اور وہ ریلوے کی ملازمت کی وجہ سے گوالیار میں مقیم تھے۔

خلیل تنویر: 4/800 گاندھی نگر، اودے پور، راجستھان

اپریل 2016 کا 'اردو دنیا' موصول ہوا۔ خاص کر خورشید سمیع کا مضمون 'البرٹ آئنسٹائن حیات اور افکار' بے حد معیاری اور معلوماتی ہے۔ میری سب سے پسندیدہ مثالی شخصیت آئنسٹائن ہے۔ ان کی زندگی مشکلات سے بھری رہی لیکن آج پوری دنیا انھیں نظریۂ اضافیت کے حوالے سے جانتی ہے۔

محمد شاکر کے: مدرسۃ الامام الربانی، کانتھاپورم، کیرالہ

'اردو دنیا' مارچ 2016 کا شمارہ میرے سامنے ہے جس کا اکثر حصہ پڑھ چکا ہوں، مدیر محترم نے اپنی بات میں کافی باتیں مفید اور حوصلہ افزا لکھی ہیں، لیکن تمام تر امیدوں کے باوجود یہ ایک زمینی حقیقت ہے کہ اردو اور قاری کا رشتہ کمزور پڑ رہا ہے مشاعروں، سمیناروں، مذاکروں، مباحثوں کی کثرت اور ایک مخصوص طبقے کی ان میں شرکت، خوش فہمیوں میں مبتلا کرتی ہے دیکھنا یہ ہے کہ نئی نسل کا کتنا حصہ اردو لکھ رہا اور پڑھ رہا ہے۔ پھر جو اردو کے آفتاب و ماہتاب کہلاتے ہیں انھوں نے لکھنے کے سوا اور کوئی کارنامہ بھی انجام دیا ہے یا نہیں، مقصد میرا یہ ہے کہ خود ان کے اپنے گھروں میں اردو کا چلن ہے کہ نہیں اور ان کے بچے اردو لکھتے پڑھتے بھی ہیں یا انگلش میڈیم اسکولوں میں عصر حاضر کی تہذیب اور طور طریقے سیکھ رہے ہیں۔

محترمہ ترنم ریاض صاحبہ کا انٹرویو صاف گوئی کا پیغام دینے کے ساتھ ساتھ کچھ جارحانہ تیور بھی رکھتا ہے اور چند جگہوں پر تحقیر کا عنصر بھی در آیا ہے۔ جیسے: مولویوں نے بہت شور شرابا کیا، یا ان کی یہ ضد کہ قرۃ العین حیدر سب سے بڑی فکشن نگار ہیں۔ مردوں میں کوئی بھی قرۃ العین حیدر جیسا نہیں ہے۔ یہ بات اگر وہ یوں کہتیں کہ میری نظر میں یا میری رائے میں قرۃ العین حیدر سب سے بلند ہیں، تو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ محترمہ نینا جوگن کا مضمون 'اردو کا نسائی ادب اور خواتین قلم کار' انتہائی مختصر اور تشنہ ہے۔ ایک بات انتہائی ادب و احترام کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ادبی مضامین کا مزاج مزید تحقیقی بنائیے۔

نسیم اختر شاہ قیصر: شاہ منزل محلّہ خانقاہ، دیوبند

'اردو دنیا' مارچ 2016 کے سرورق پر خوبصورت کتابت سے لکھا ہوا 'عالمی اردو کانفرنس' نیز اس سے متعلق مختلف خوب صورت تصاویر کے ساتھ شمارہ نظر نواز ہوا۔

ہماری بات کے موضوع پر اردو زبان سے متعلق پروفیسر محترم ارتضیٰ کریم کی پیش کردہ تحریر بجا اور درست ہے۔ تخیلات کی بلند پروازی حقیقت پر مبنی ہے۔ آج اردو کی سب سے بڑی ضرورت سرکاری سرپرستی کی ہے۔ اگر سرکاری اسکولوں میں پرائمری سطح سے باقاعدہ اردو زبان کی تعلیم کا بندوبست ہو جائے تو اردو کی خاطر خواہ ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ہر اردو داں طبقے کی خصوصی توجہ اور جد و جہد درکار ہے۔ کور اسٹوری میں شامل مضمون 'عالمی اردو کانفرنس' اور صحافت کے دو سو سال ماضی، حال اور امکانات بڑی ہی اہمیت کا حامل ہے۔ شعیب رضا فاطمی صاحب نے اس کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال بڑی ہی عرق ریزی سے قلم بند کیا ہے۔

الحاج شفیق احمد: استاد مدرسہ انوار العلوم رام نگر، بارہ بنکی

'اردو دنیا' مارچ 2016 کا تازہ گلدستہ باصرہ نواز ہوا۔ اداریہ اردو کی حالیہ حالت اور اس کی بقا و حیات پر مشتمل ہے جس کی بابت چند باتیں عرض ہیں۔ مدیر محترم کا یہ فرمانا کہ ''میڈیا میں اردو کا استعمال بڑھ رہا ہے ویب سائٹس اور چینلوں پر چلنے والے سیریل اور سوپ اوپیرا کے ذریعے بھی اردو کو فروغ مل رہا ہے۔ مشاعرے، قوالی اور دیگر ثقافتی پروگرام کے ذریعے اردو کا احیا ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ'' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میڈیا ہو یا مختلف سیریل ان کی اصل زبان آسان ہندی جس میں انگریزی زبان کی اصطلاحیں استعمال کی جا رہی ہیں۔ رہی بات قوالی اور مشاعروں کی ان میں بولی جانے والی تو اردو ہی رہے گی مگر پڑھی اور لکھی جانے والی بھاشا ہندی ہوتی جا رہی ہے۔

خواتین کی ادبی خدمات کے حوالے سے محترمہ شبنم افروز کا ترنم ریاض سے انٹرویو پسند آیا، اردو صحافت کے دو سو سال، پر عالمی اردو کانفرنس صفحہ 11 تا 19 عمدہ کوریج ہے۔ اس میں شریک غیر ممالک کے اردو پروانے بھی قابل مبارکباد ہیں۔ اردو زبان و ادب کی اشاعتی سرگرمیوں کے حوالے سے حیدرآباد نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ یہ سرزمین آج بھی اردو کا گلشن ہے جس کی نظیر ہندوستان بھر میں ملنا دشوار ہے۔ علاوہ ازیں مرحوم انتظار حسین پر نثار احمد ڈار کا مضمون اچھا ہے۔ اردو صحافت میں خواتین کا حصہ، اور شہر ممبئی کا ادبی رسائل سے اٹوٹ رشتہ بہت پسند آئے۔ محترم انیس امروہوی کا ساحر پر مضمون بھی خوب ہے۔

عبداللہ عثمانی: گدیواڑہ، دیوبند، ضلع سہارنپور، یوپی

مارچ 2016 کا شمارہ 'اردو دنیا' نظر نواز ہوا تمام مضامین چاہے وہ ثقافتی ہوں، معلوماتی ہوں یا پھر ادبی سب کو صحیح ترتیب دے کر رسالے کی شکل دینا آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ یوں تو تمام مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں مگر خاص کر 'انتظار حسین کی ناسٹلجیائی حسیت کے تشکیلی اجزا' اور 'بانکا فلمی نغمہ نگار ساحر لدھیانوی' بہت پسند آئے۔ شمارہ اپریل 2015 'اردو دنیا میں عبدالسمیع صاحب کے ذریعے انتظار حسین صاحب سے لیا گیا انٹرویو بعنوان 'میرا دکھ ہجرت کا دکھ ہے' مع تصویر کے شائع ہو چکا ہے۔ انتہائی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ میں نے بار بار پڑھا۔ واہ کیا خوب انٹرویو تھا۔ انھوں نے کتھا سرت ساگر، رامائن، مہابھارت اور مہاتما بدھ کی جاتک کتھاؤں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کراچی (پاکستان) سے ایک اردو رسالہ شائع ہوتا تھا۔ 'فاران' جن کے ایڈیٹر غالباً ماہر القادری تھے ہماری لائبریری میں آتا تھا اس میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں ڈبائی (بلند شہر) کا ذکر تھا کہ وہاں کے لوگ زرق برق رنگ برنگے لباس پہن کر ڈھول بجاتے گاتے بیل گاڑیوں میں سوار ہو کر گنگا میلے میں جایا کرتے تھے لکھنے والے یاد نہیں کہ انتظار حسین تھے یا ماہر القادری بہر حال دونوں ہجرت کے دکھ زندگی بھر بھلا نہ پائے اللہ مغفرت کرے۔ آمین!

سید طاہر ہاشمی: پرنسپل (ریٹائرڈ) شانتی نکیتن، بلند شہر

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے جنوری 2016 کے شمارے میں محترمہ عارفہ بشریٰ کا مضمون کشمیر میں اردو صحافت معیاری اور معلوماتی ہونے کے باوجود تشنہ ہے۔ محترمہ کئی اخباروں کا تعارف کرانے میں قاصر رہ گئیں، روشنی اخبار کا تذکرہ نہیں، اسی کے ساتھ ڈوڈہ سے سترہ سال سے مسلسل نکلنے والے ہفت روزہ اخبار 'صدائے کوہسار' کا ذکر ہی نہیں، وہاں کی موجودہ صحافت کے بارے میں محترمہ نے عرق ریزی سے کام نہیں لیا، جس سے ان اخبارات کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، اور ان کی صحافت کو نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے۔

انصار احمد معروفی: بلوہ، کرتھی جعفر پور، مئو (یوپی)

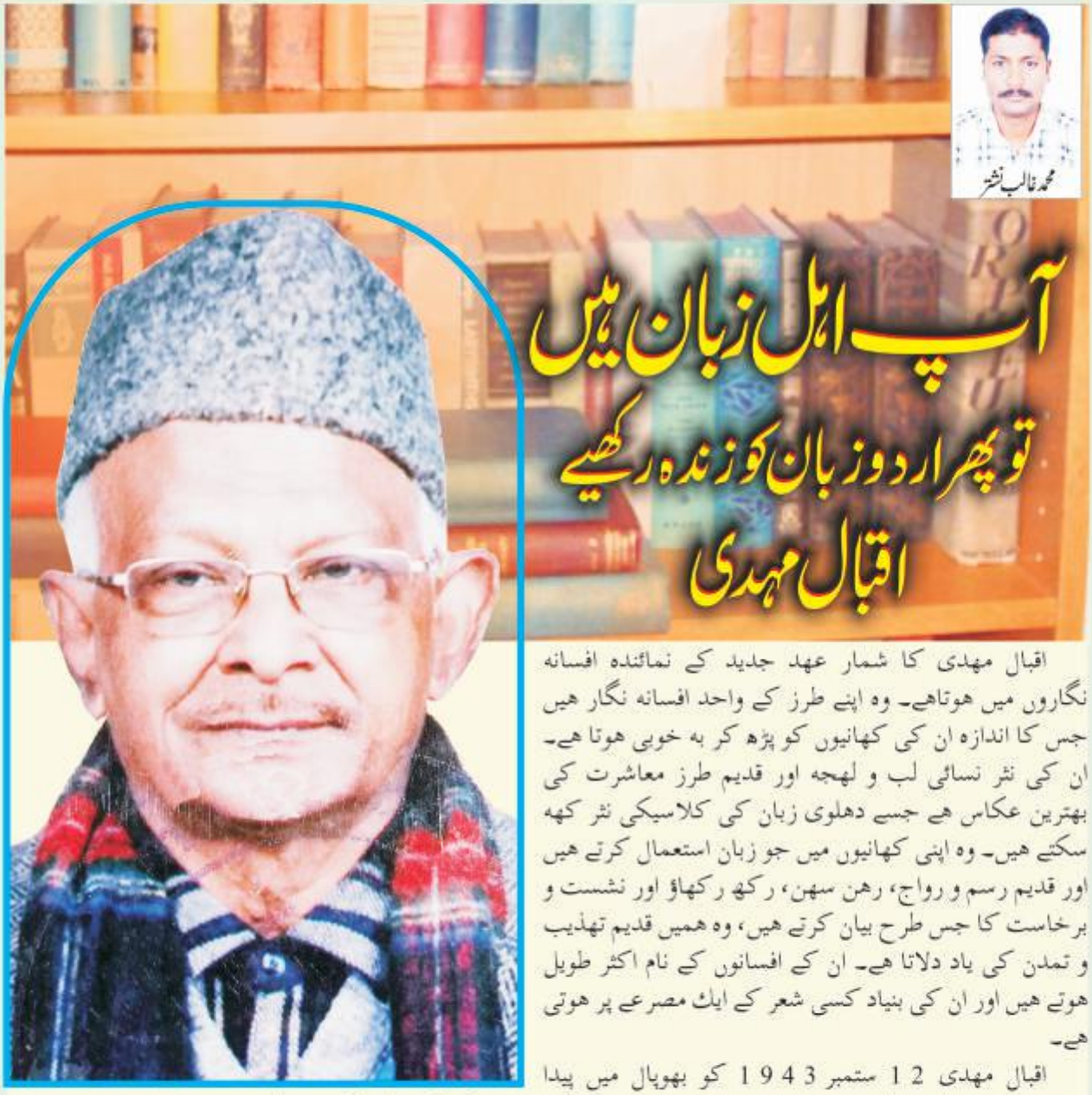

محمد غالب نشتر

آپ اہل زبان ہیں تو پھر اردو زبان کو زندہ رکھیے

اقبال مہدی

اقبال مہدی کا شمار عہد جدید کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتاھے۔ وہ اپنے طرز کے واحد افسانہ نگار ھیں جس کا اندازہ ان کی کھانیوں کو پڑھ کر بہ خوبی ہوتا ھے۔ ان کی نثر نسائی لب و لھجہ اور قدیم طرز معاشرت کی بھترین عکاس ھے جسے دھلوی زبان کی کلاسیکی نثر کھہ سکتے ھیں۔ وہ اپنی کھانیوں میں جو زبان استعمال کرتے ھیں اور قدیم رسم و رواج، رھن سھن، رکھ رکھاؤ اور نشست و برخاست کا جس طرح بیان کرتے ھیں، وہ ھمیں قدیم تھذیب و تمدن کی یاد دلاتا ھے۔ ان کے افسانوں کے نام اکثر طویل ھوتے ھیں اور ان کی بنیاد کسی شعر کے ایک مصرعے پر ھوتی ھے۔

اقبال مہدی 12 ستمبر 1943 کو بھوپال میں پیدا ھوئے۔ابتدائی تعلیم دھلی میں پائی۔1961 میں ھائر سکنڈری پاس کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا1965 میں بایو کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا1966 میں ایم فل اور1969 میں پٹیل چیسٹ انسٹی ٹیوٹ، دھلی یونیورسٹی سے ٹی بی پر پی ایچ ڈی کی اعلا ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کی غرض سے پانچ سال کے لیے امریکا چلے گئے۔1971 میں ھندوستان واپسی پر سینٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ملازمت اختیار کی جو1996 تک رھی۔ 1996 میں دھلی منتقل ھوگئے۔اقبال مہدی اپنی ھمشیرہ پروفیسر صغرا مہدی کے اصرار پر افسانہ نویسی کی جانب مائل ھوئے اور پھلا افسانہ 'بھابی بیگم' لکھا جو 'بیسویں صدی' میں1997 میں شائع ھوا جس نے بے حد مقبولیت حاصل کی اور جس پر پھلی مھر قرۃ العین حیدر کی لگی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ دھلی اردو اکادمی نے 2013 میں ایوارڈ برائے تخلیقی نثر سے نوازا۔ ان دنوں عابد ولا، جامعہ نگر نئی دھلی میں مقیم ھیں۔ افسانوں کے چار مجموعے اشاعت سے ھم کنار ھوچکے ھیں۔ 'درد آتا ھے دبے پاؤں' 1999 میں طبع ھوا۔ 'تجھے اے زندگی لاؤں کھاں سے؟2002 میں، 'تم نے جفا بھی کی تو صنم مدتوں کے بعد2007 میں اور 'یہ کس مقام پہ تنھائی سونپتے ھو مجھے2013 میں اشاعت سے ھم کنار ھوا۔ پیش خدمت ھے ان سے کیے گئے چند سوالات:

محمد غالب نشتر: سب سے پہلے روایتی سوال کرنا چاہوں گا کہ آپ خاندانی پس منظر کا خاکہ بیان فرمائیں تاکہ شخصیت اور فن کی تفہیم ممکن ہو سکے۔ ساتھ ہی زندگی کے ابتدائی ایام کی یاد تازہ کرتے چلیں تو زیادہ موزوں ہو۔

اقبال مہدی: عمر جیسے جیسے بڑھتی ہے یادداشت گلوڑی بھی کسی بیسوا کی طرح بے وفا ہوتی جاتی ہے۔ دماغ پیر کو کھنگالتا ہوں تو مجھے ایک دبلا پتلا، سانولی رنگت کا لڑکا نظر آتا ہے جو بھوپال میں پیدا ہوا جس کے والد تھانیدار تھے اور جو گھر اور باہر ماں بہنوں اور تھانے میں سپاہیوں میں ہاتھوں کا کھلونا بنا رہتا ہے۔ چھ بہنوں کے بعد ایک بھائی تو یوں بھی ہاتھوں کا پھپھولا، پورے خاندان کا لاڈلا، اپنی بڑی بہن کا چہیتا، منجھلی بہن سے لوریاں سنتا..... دیکھا یہ کم بخت یادداشت پھر لڑکھڑائی.... وہ بچہ بڑا ہوتا رہا۔ محلے پڑوس کی نوکرانیاں، خواصیں اور ضرورت مند لوگوں کی گھر میں آمد و رفت سے طرح طرح کی زبان، قصے اور لہجے غیر شعوری طور پر ذہن میں گوشے تلاش کر لیتے تھے۔ ذرا اور بڑا ہوا تو تاریخی عمارتوں، اسکولوں، محلوں، رسم و رواج سے واقفیت ہوتی رہی۔ ننہال کا رجحان سرکاری نوکری کی طرف رہا اور گو کہ ددیہال کے عزیز تعلیم یافتہ تو تھے مگر وہ زمینداری اور جاگیرداری کا مزاج رکھتے تھے۔ ددیہال قنوج اور لکھنؤ تھے۔ وہ لوگ بھی جاگیرداری، جو رفتہ رفتہ دم توڑ رہی تھی، سے گھرے ہوئے تھے۔ بھوپال کی طرح لکھنؤ بھی اک جہان تھا..... پھر بارہ سال کی عمر میں میرے ماموں جان ڈاکٹر سید عابد حسین اور ممانی صالحہ عابد حسین مجھے اپنے ساتھ دہلی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) لے آئے۔ میری تعلیم اب تک گھریلو حد تک تھی مگر دہلی میں میرا داخلہ تیسری جماعت میں ہوا۔ یہاں کی دنیا اور ماحول بالکل ہی مختلف تھے۔ ایسا لگا کہ دماغ پر ایک جھلّی چڑھی تھی، دماغ کھلا اور تازگی کا احساس ہوا۔ اس زمانے میں جامعہ نگر کی آبادی اتنی گھنی نہیں تھی کہ تھالی پھینکو اور آواز نہ آئے کا مصداق ہو۔ چند کوٹھیاں تھیں اور جامعہ نگر کے ابتدائی اور ثانوی اسکول تھے اور ایک جامعہ کالج کی بلڈنگ تھی، ہوسٹل تھے جہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے طلبا پڑھنے آتے تھے اور رہائش پذیر ہوتے تھے۔ یہاں اور پھر اپنے خاندانوں میں تکھائی پڑھائی کا ماحول تھا۔ قصہ مختصر کہ جامعہ سے ہائیر سکنڈری امتیازی نمبروں میں پاس کرنے کے بعد میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی چلا گیا اور پانچ سال بعد ایم ایس سی (بایو کیمسٹری) میں کر کے ایم فل اور پی ایچ ڈی ٹیپل چیسٹ انسٹی ٹیوٹ، دہلی یونی ورسٹی سے کیے اور پوسٹ ڈاکٹریٹ کے لیے امریکہ چلا گیا۔ وہاں سے پانچ سال بعد لکھنؤ میں واپس آ کر ملازمت شروع کی اور 1996 میں اختیاری ریٹائرمنٹ لے کر اپنی کلینک شروع کی جس کا تعلق Infertility سے ہے۔ اس پورے عرصے میں یعنی 1996 تک میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھ میں افسانے اور کہانیاں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔

م غ ن: آپ نے کن حالات میں لکھنے کی ابتدا کی؟ جب کہ آپ نے سائنس کی اعلا تعلیم حاصل کی اور جیسا کہ عام قاری جانتا ہے کہ سائنس اور فکشن دو متضاد علم کا نام ہے۔

اقبال مہدی: جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میرے گھرانے میں پڑھائی لکھائی کا ماحول تھا۔ اردو انگریزی کے اخبارات اور رسائل آتے تھے۔ خواتین کی پڑھائی لکھائی اُردو اور گھر کی چہار دیواری تک محدود تھی مگر مردوں کی صحبت میں رہ کر شد بد فارسی کی بھی آ گئی تھی۔ میری والدہ کو لکھنا بالکل نہیں آتا تھا۔ یہ وقت کی ستم ظریفی تھی۔ مجالس میں حضرت انیس اور حضرت دبیر کے مراثی بڑی دھوم سے پڑھتی تھیں۔ میری بہنوں کو لکھائی پڑھائی سے بہت شغف تھا۔ منجھلی بہن تو با قاعدہ 'سیدہ فرحت' کے نام سے شاعری جناب 'اثر لکھنوی' کی شاگردی میں کرتی تھیں مگر کبھی بھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں گزرا کہ میں کہانیاں اور افسانے لکھوں گا۔ سائنس کا طالب علم سائنسی مضامین ہی لکھتا رہا۔ جس تجربے اور مشاہدے سے وہ گزرتا ہے اُسی کا وہ مختلف کانفرنسوں اور رسالوں میں اظہار کر کے لوگوں کو بتاتا ہے لیکن ایسے شخص سے افسانہ یا کہانی لکھنے کو کہا جائے بلکہ بضد ہو کر لکھوایا جائے تو بڑا ستم ہے اور یہ ستم میری بڑی بہن 'صغریٰ مہدی' نے میرے پیچھے پڑ کر کیا۔ میں اک دم بیزار ہو گیا۔ آخر تھک ہار کر میں نے اپنے مشاہدوں، تجربوں کا ہاتھ پکڑا، تحت الشعور کے خوابیدہ گوشوں کو ٹٹولا اور 'بھائی بیگم' کہانی نے جنم لیا۔ جب یہ کہانی 'بیسویں صدی' میں شائع ہوئی تو میری شامت آ گئی۔ طرح طرح کے خطوط آنے لگے۔ محسوس ہوا کہ میرے چاروں طرف نہ جانے کتنی بھابی بیگمیں بکھری پڑی ہیں۔ سب شکر گزار کہ ان کی زندگی کی دکھ بھری داستان نہ جانے کتنے گھروں پہنچی ہوگی۔ زبان و بیان، شائستگی کی تعریف میں اتنے الزام مجھ پر لگائے گئے، بے گناہی کے انداز جاتے رہے۔ پھر بس اسی طرح اچانک شوق نے پرواز بھری اور میں کہانیاں لکھنے لگا۔ لوگوں کو ایک طرف مجھ سے شکایت رہی کہ آپ کی تحریر میں المیہ بہت ہے بالخصوص خواتین سے متعلق اور اچھی بات یہ لگتی ہے کہ آپ کی کہانیوں کی بامحاورہ زبان پچاس سال پہلے کی زبان کی یاد دلاتی ہے۔ خواتین کی وہ زبان جو آج کل بالکل ختم ہو گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چاہے کوئی بھی کہانی ہو وہ ایک خاص پس منظر میں لکھی جاتی ہے اور میری کوشش ہوتی ہے، وہی ماحول ہو، زبان وہی ہو جو قاری کو باندھے رکھے۔ میں اپنے اوپر درد و غم کا لیبل چسپاں نہیں کرتا میری کہانیوں میں طنز و مزاح کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ بس اس طرح سائنس اور فکشن ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

م غ ن: سائنس اور فکشن میں آپ نے کیسے توازن بر قرار رکھا؟

اقبال مہدی: سائنس اور فکشن میں توازن رکھنا ایسا کوئی مسئلہ تو نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ سائنس کے تجربے کے لیے ایک خاص پلاننگ کی جاتی ہے اور کامیابی یا ناکامی جب سامنے آتی ہے، وہ مشاہدہ کہلاتا ہے اور اس سے جو ہم سیکھتے ہیں وہ تجربہ کہلاتا ہے۔ ہماری زندگی بھی ایک تجربہ گاہ ہے لہٰذا ہمیں افسانہ لکھنا ہو، شاعری کرنا ہو، ہم اپنے آس پاس بکھری ہوئی کہانیوں کو صفحۂ قرطاس پر اُتارتے ہیں۔ جس طرح ہم پوری کائنات کی اَن دیکھی چیزوں کی چھان بین کرتے ہیں اور ایک نئی چیز ایجاد کر لیتے ہیں، اسی طرح سے چھوٹے موٹے واقعات کو اپنے قلم کی نوک سے کہانی تیار کر لیتے ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ آپ کی تخلیقی اڑان کہاں تک ہے جو دل پر اثر تو کرے مگر مبالغہ آرائی نہ لگے۔ ایک حادثہ، مشاہدہ ایک انسان پر گزرتا ہے، اس پر کچھ اثر ہوتا اور دوسرا ان ہی باتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایک سائنس داں اپنے تحقیقی مشاہدے کو ایک کہانی میں منتقل کر دیتا ہے۔ بہت سی کہانیوں میں مختلف بیماریوں مثلاً ایڈز کی بیماری کی وجوہات اور علامات کو سمیٹا ہے (افسانہ 'کس کو آتی ہے مسیحائی' اور 'چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب') دونوں ہی تکلیف دہ کہانیاں ہیں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے۔ اس کی سائنسی وجہ کیا ہے؟ (افسانہ 'بانجھ') اخبار کی نہایت تکلیف دہ خبریں (افسانہ 'محافظ') الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے پیدا ہونے والے بچے کا سیکس پتہ کر لینا اور بچہ ضائع کر دینا (افسانہ 'ریشم کی ڈور')۔ دوسری بات یہ کہ افسانے یا کہانی میں سائنس اس طرح در آئے کہ قلم کار کا

مقصد بھی حل ہوجائے اور کہانی کا کہانی پن بھی ختم نہ ہو۔ آسمانی آفات کا بھی اس طرح ذکر ہو کہ وہ بھی کہانی کا حصہ ہو یعنی حادثہ یا پریشانی نہ ہوتی تو یہ کہانی نہ ہوتی (کہانی 'آواز ٹوٹے ہوئے گھنگھرو کی طرح') گجرات پر کہانی (خنجر کو رگ گلو کی تلاش) وغیرہ۔

م غ ن: کہانی لکھنے سے قبل آپ کو کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے یا اس سوال کو یوں کہہ لیں کہ کہانی کو صفحۂ قرطاس پر اتارنے سے قبل آپ کس طرح کا ماحول کشید کرتے ہیں؟

اقبال مہدی: اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کہانی بلکہ بہت سے پلاٹ ذہن میں گھومتے رہتے ہیں مگر طبیعت کا یکجا نہ ہونا، وقت مصروفیت میں ایسا گندھ جائے کہ کوئی بھی خاکہ لباسِ الفاظ نہ پہن سکے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لمحات آپ کو اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ طبیعت اچانک مائل تحریر ہونے لگتی ہے اور خاکہ الفاظ کا پیرہن زیب تن کرکے آپ کے سامنے آجاتا ہے۔ یوں بھی ہوا ہے کہانی لکھنے میں بہت سے خود ساختہ اتار چڑھاؤ آتے ہیں، تب اختتام تک پہنچتے پہنچتے کہانی اس طرح ختم ہوجاتی ہے کہ آپ خود چونک پڑتے ہیں۔

دیکھیے! جہاں تک ماحول کی کشیدگی کا تعلق ہے تو ایسا کچھ نہیں۔ جس نوعیت کی کہانی ہوتی ہے کردار، زبان، محاورے خود بخود ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ مردوں کے انداز، ان کا طرز گفتگو ہو یا خواتین کے۔ نوابی دور کی کہانی ہو (افسانہ 'منجھلی دلہن') تو بھلے ہی حویلیاں اور محلات بوسیدہ ہوگئے ہوں لیکن لہجہ وہی نوابین، بیگمات اور خواصوں، باندیوں کا رہتا ہے۔ زمیندار، جاگیردار مردوں کے طور طریقے، ان کی رنگین محفلیں، دریا دلی، شان آخری دم تک وہی رہتی ہیں (کہانی 'نخل بے برگ') متوسط درجے کے زمینداروں کی حویلیوں کے ارد گرد کا ماحول، بیگمات، سب سے بڑے بزرگ کا پورے گھر پر تسلط، باندیاں، رسم ورواج کا تال میل (کہانی 'ابجی'، 'میاں جانی'، 'کیا کرتے ہیں چھوٹے میاں!'، 'کیا کرتے ہیں چھوٹے میاں!') کہانی میں موقع کے مطابق تین علاقائی زبانوں کا استعمال کیا گیا، زبردستی ٹھونسا نہیں گیا بلکہ بے ساختہ نوک قلم سے اپنی رو میں نکلتا چلا گیا ہے۔ اسی طرح کہانی 'متاع کوچہ و بازار' کا تعلق طوائفوں سے ہے اور جہاں ایک سوشل ورکر آکر گورنمنٹ کی طرف سے اس طبقے کی فلاح و بہبود کا پیغام دیتا ہے۔ اس کہانی کی زبان اور بیان اسی طبقے سے جڑی ہے۔ یہ بھی اخبار کی چھوٹی سی خبر سے جڑی کہانی ہے۔

م غ ن: ان دنوں اخبارات و رسائل اور سمیناروں میں تخلیق کار سے براہ راست ایسے سوال پوچھے جاتے ہیں جن کا مقصد فقط یہ ہوتا ہے کہ تخلیق کار کے نظریۂ فن کے متعلق آگہی ہوسکے اور تخلیق کار کے فن پاروں کی تفہیم ممکن ہوسکے۔ میں بھی آپ سے یہ سوال پوچھنے کی جسارت کررہا ہوں کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟

اقبال مہدی: یہ ایک ٹیڑھا سوال ہے۔ یہ آپ نے درست فرمایا کہ تخلیق کار سے عموماً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟ یہ بات بجا ہے۔ اس کا مقصد فقط یہ ہوتا ہے کہ اُس کے نظریۂ فن کے متعلق آگہی ہو اور اس کی تخلیق کی تفہیم ہوسکے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج لکھا کیا جارہا ہے؟ اردو زبان پر علاقائی زبانوں کا اتنا اثر ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کا لب ولہجہ شرمندہ ہوجاتا ہے۔

میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر آپ اہل زبان ہیں تو پھر اردو زبان کو زندہ رکھیے۔ میں ماضی کی تہذیب اور روایات کو حال اور مستقبل سے جوڑنا کیا بلکہ اردو کے ذریعے زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر بچے کو اس کی مادری زبان آنا ضروری ہے۔ بڑی حیرت اور افسوس ہوتا ہے کہ میرے لیے لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی زبان اَب ختم ہوتی جارہی ہے۔ یہ پچاس ساٹھ سال پیچھے کی زبان ہے تو مجھے ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا۔ تو کیا ہماری زبان ہمارے ساتھ ہی قبر میں دفن ہوجائے گی اور ہمارے ادیب، شعرا، نقاد، جن کی تخلیق شہرۂ آفاق ہیں، وہ بھولا ہوا خواب ہوجائیں گے!

شکایت ہے مجھے ان بچوں سے، نوجوانوں سے اور بزرگوں سے جن کو اپنی ہی زبان سے محبت نہیں ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ جب میں نے قبرستان میں اکثر لوح مزار پر عبارت ہندی میں دیکھی اور اردو زبان میں اپنے حقیر اور مخلص قلم کی مدد سے اپنا ہدیہ پیش کرنے کی کوشش کی لوگوں نے پسند کی۔ فرمائش کی لکھتا رہوں، بڑا اچھا لگتا ہے۔ ان شاء اللہ کوشش کرتا رہوں گا مگر وہ محفلیں کہاں سے لاؤں؟ چاہے وہ میری کتابوں کا انتساب ہو یا کہانی کا ہو۔ زیادہ تر بزرگوں سے اردو پڑھنے لکھنے کی تاکید ضرور ہوتی ہے۔ دوسرے میری زبان و بیان میں کہیں انگریزی کا لفظ نہیں ملے گا۔

م غ ن: آمد اور آورد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ برائے مہربانی آپ یہ بتائیں کہ کہانی کہنا یا لکھنا آمد کا نتیجہ ہے یا زبردستی کسی Situation کو اوڑھ لینے سے کہانی بن جاسکتی ہے؟ مشاہدات کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

اقبال مہدی: ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک خاص کیفیت سے دل و دماغ گزرے تو ایک خاکہ ابھرتا ہے اور میں اسی وقت بیٹھ کر کہانی لکھ لیتا ہوں اور پھر جب دوبارہ پڑھتا ہوں تو اداس ہوجاتا ہوں کہ میری کہانیاں اتنی افسردگی آمیز کیوں ہوتی ہیں۔ میں نام کیا لکھوں۔ میری زیادہ تر کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ یہی قارئین کو مجھ سے شکایت رہتی ہے۔ 'درد آتا ہے دبے پاؤں' بالکل دماغی تخلیق ہے۔ اس کہانی کو دو دن میں لکھ پایا اور مجھے بہت پسند بھی ہے۔ پرانی دہلی کے ایک خاندان گلی قاسم جان میں چند دن مہمانداری کی۔ وہ گھر بوڑھی خواتین سے بھرا پڑا تھا، محلے پڑوس کی خواتین بھی آتی تھیں جو زبان اور لہجے سننے کو ملے، بڑی دلچسپ لگے۔ میری عمر بیس سال ہوگی اور تیس سال بعد جوڑ میں آیا کہانی 'پھلروا کی ڈالی' وجود میں آئی اور لوگوں کو بہت پسند آئی۔ راجندر سنگھ بیدی کی کہانی 'ایک چادر میلی سی' اور پنجاب کی قدیم رسم پڑھ کر میرے ذہن نے کروٹ لی کہ نہیں میں اسے نہیں مانتا اور ایک کہانی 'دلدل' لکھی اور بتایا کہ نہیں بیوہ کی شادی دیور یا جیٹھ سے نہیں ہونا چاہیے مگر شادی ضرور ہونا چاہیے۔ پھر میں نے گاؤں میں سماجی ورکر کی موجودگی کو بہت اہمیت دی اور بڑی خاموشی سے اس کی، پڑھے لکھے ڈاکٹر (جس کی پہلی بیوی مرگئی تھی) سے شادی کروادی لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ چند ماہ بعد ہیروئن سجی بنی، کار میں بیٹھ کر پرانے سسرال آتی ہے اور سر اٹھا کر سسرال والوں سے کہتی ہے کہ آپ لوگ حیرت زدہ نہ ہوں، میں آپ کے بیٹے کی بیوہ ہوں جو گھر سے اچانک غائب ہوگئی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ بھاگی، نہ خودکشی کی، نہ کسی کوٹھے پر جا بیٹھی بلکہ ایک شریف انسان سے اس نے شادی کرلی اور چین سے رہ رہی ہے۔

کبھی کوئی حادثہ، ٹی وی یا اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر کہانی کے منظر نامے پر پھیل جاتی ہے مگر کہانی اُس خبر سے ایسے ڈھلتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی بہت سی کہانیاں خود بخود جڑتی جاتی ہیں۔ چند کہانیاں محض تصور پر بنیاد ہیں جیسے کہانی سرحد کے اس پار، یہ نمائش سراب کی سی ہے، زخمی گلاب، شناخت کی صلیب، اندرا گاندھی کی شہادت پر مبنی ایک تخیلی کہانی ہے۔ یہ بات میں مانتا ہوں کسی صورت حال کو اوڑھ لینے سے یقیناً کہانی بن جاسکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ قاری کو احساس بالکل نہ ہو کہ کہانی میں مصنوعی پن ہے بلکہ ایسا ہو کہ قاری کہانی کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جائے اور جب تک کہانی ختم نہ ہوجائے۔

م غ ن: آپ کی کہانیوں کے چار مجموعے اشاعت سے ہمکنار ہوکر مقبول خاص و عام ہوچکے ہیں۔ مرجبہ

موضوعات کے علاوہ آپ نے ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جن پر ہمارے افسانہ نگاروں نے کم لکھا ہے مثلاً ایڈس، جنس، مسئلۂ کشمیر، فسادات، سماجی و سیاسی رسہ کشی ،ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ۔ آپ کی کہانیوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ کہانی ایک منظر نامہ رکھتی ہے اور 'نقطۂ نظر' بالکل واضح ہوتا ہے۔ موضوعات کے متعلق کچھ بیان فرمائیں۔

اقبال مہدی: یہ بات بالکل درست ہے کہ میری کہانیاں پڑھ کر لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ سارے کردار سامنے چلتے پھرتے ہیں۔ تمام موضوعات جدت تو رکھتے ہیں مگر آس پاس بکھرے ہوئے ہیں۔ ہاں! اکثر کہانیوں کا تعلق خواتین سے ہوتا ہے۔ کہیں عورت مردوں کے سماج میں دبی کچلی اور بے بس ہے مگر کچھ کہانیاں آج کی آزاد، دلیر اور بے باک لڑکیوں کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ کہانی 'بانجھ' میں دو عورتیں اور نستعلیق مرد نظر آتے ہیں۔ گو کہ دونوں عورتیں پڑھی لکھی ہیں۔ ایک بیوی ہے جس کے شوہر پروفیسر ہیں جو کسی نہ کسی بہانے بیوی کو کھل کر دل کی بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ ان کے ہاں پیارا سا بیٹا بھی ہوتا ہے۔ دوسری عورت بیوی کی دوست ہے جس سے بیوی دل کا درد بتاتی ہے اور دوست بھی ان دونوں کی آپسی کشیدگی کو محسوس کرتی ہے لیکن دوست اپنی منطقی باتوں سے ثابت کرتی ہے کہ بہت سے لوگ بیوی سے محبت تو بہت کرتے ہیں مگر محبت میں تڑپتے مرد کی کیفیت کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ وہ مرد اظہار محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتا ہے۔ اسی طرح کہانی 'دوسرا تھپڑ' ایک باغی خیال کی عورت کے دل میں کروٹ لیتا ہے اور وہ بے باکی سے اس کا اظہار کرتی ہے۔ 'پریم بیل' ایک نرس کے جذبات کا اظہار ہے اور اس کی خدمت گزاری اور خلوص کا ڈاکٹر کس طرح سے استحصال کرتے ہیں اور کس طرح وہ دل برداشتہ ہو کر خاموشی سے نوکری چھوڑ دیتی ہے۔

عموماً دفتروں میں لڑکیاں کام کرتی ہیں تو مرد لوگ اس کا غلط فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ بعض عورتیں اتنی کمزور نہیں ہوتی ہیں اور آج کی تمام لڑکیوں کو بہادری اور ہمت سے کام لینا چاہیے جیسے میری دو کہانیاں خاص طور پر 'میرے نصیب میں خیمہ لب فرات کہاں' اور کہانی 'ایک لمحہ کی حدت کا سکوں'۔

م غ ن: آپ کا اختصاص یہ ہے کہ آپ نے دہلوی زبان یا دہلی کی محاوراتی زبان کو اپنے افسانوں میں استعمال کیا ہے جب کہ ان دنوں فکشن کی نثر اتنی خراب، بوجھل اور ثقیل ہوگئی ہے کہ قاری کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ آپ فکشن کے لیے کس نثر کی حمایت کرتے ہیں؟

اقبال مہدی: یہ بات تو ہے۔ کہانی پڑھتے پڑھتے چھوڑ دینے کو جی چاہتا ہے تو یقیناً دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ کہانی ایک تو طویل نہ ہو۔ میں کوشش کرتا ہوں بھلے ہی کہانی کتنی ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو لیکن درمیان میں بیگمات ہوں، نوکرانیاں، باندیاں ہوں، ان کی زبان اور محاورے ضرور ہوں تا کہ قاری ایک تو کہانی کی سنجیدگی کو سمجھ سکے اور خواتین کی مخصوص زبان کا چٹخارہ بھی لے سکے۔ جو کہیں سے بھی مصنوعی نہ محسوس ہو، جس سے ہماری بیگماتی، بامحاورہ زبان زندہ رہے۔ ورنہ بوجھل، ثقیل زبان و تحریر دل بستگی کا سبب نہیں ہو سکے گی۔ میری زیادہ تر کہانیاں بامحاورہ ہوتی ہیں۔ میری ایک کہانی 'خاتون محترم' ایک مشاطہ کے اردگرد گھومتی ہے جو کنواری یتیم لڑکی کے رشتے تلاش کرتی رہتی ہے جس کی زبان بہت دلچسپ ہے اور کہانی کے اختتام سے پہلے 'مدر ٹریسا' کا ذکر اس خوبصورتی سے لاتی ہے کہ لڑکی، ماں اور چچا سب حیران رہ جاتے ہیں۔

ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میری قرأت سے لوگ بہت محظوظ ہوتے اور خصوصاً وہ کہانیاں جو بامحاورہ ہوں اور کوئی سنجیدہ کہانی پڑھتا ہوں تو کہانی، زبان تو پسند کرتے ہیں مگر فرمائش یہی ہوتی ہے کہ چٹخارے والی کہانی پڑھا کیجیے، آپ کے لہجے میں بہت اچھی لگتی ہے اور بڑے لطف کی بات ہے کہ کسی شعر کی طرح مکرر پڑھیے کا اصرار کرتے ہیں مگر مشاعرہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ بہر حال یہ قارئین کا اور سامعین کا اپنا اپنا شوق ہے۔ میری کہانیاں پھلروا کی ڈالی، مالکن، چھوٹے لوگ بڑے لوگ، ایک خط، صندوق، عقاب، ہریالہ بستا، دل وہ مریض ہے جو ابھی قابل غور ہے، شیریں فرہاد کی عید، منجھلی دلہن، نخل بے برگ وغیرہ کہانیاں اس زمرے میں آتی ہیں۔

م غ ن: ان دنوں آپ مطب سے وابستہ ہیں۔ یہاں بھی مسائل کا انبار ہے، نئے نئے تجربات ہیں، نئی کہانی ہے۔ اس حوالے سے کوئی نئی کہانی منظر عام پر آئی ہے یا کوئی سانحہ زیر قلم ہے؟

اقبال مہدی: میں ایک کلینک چلا رہا ہوں جس کا نام 'کرائیو بینک' یا 'اسپرم بینک' ہے۔ یہ ہندوستان کا سب سے پہلا بینک ہے جو میں نے 1993 میں شروع کیا تھا۔ آج پورے ہندوستان اور باہر کے ممالک میں اس بینک کی بڑی اہمیت و ضرورت ہے۔ پچھلے بیس سال پہلے مردوں (نوجوانوں) کا اولاد نہ ہونے کا مسئلہ 20 فیصد تھا جو آج بڑھ کر 75 فیصد ہو گیا ہے۔ یہ بینک اس لیے اچھا ہے کہ نہ معلوم کتنے لوگ اس سے فیض یاب ہوئے ہیں اور ایک بچہ ہوا ہے تو اگلے 2-3 بچے بھی اسی بینک کی دین ہیں۔ لوگ اس سہولت سے مطمئن ہیں لیکن یہ کام ایسا ہے کہ طرح طرح کی عورت اور مرد سے واسطہ پڑتا ہے جو آپ کے ایمان اور دماغ کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں عورتوں کے ساتھ کتنی ناانصافی ہو رہی ہے اور ہمارا سماج کس حد تک بھٹک گیا ہے۔

اس حوالے سے اگر لکھی جائیں تو بہت سی کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں مگر بہت تکلیف دہ ہوگی۔ اس سلسلے میں جو مریض میرے پاس آتے ہیں اُس میں کچھ ڈاکٹروں کی دھاندلی بھی شامل ہوتی ہے جسے میں نہیں مانتا۔ میرے پاس باہر ممالک سے بھی مریض آتے ہیں، انسان کی مجبوریوں اور اولاد کی طلب انسان کو کہاں کہاں لیے پھرتی ہے۔

م غ ن: اردو کی ادبی صورت حال سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟ جامعات کی سطح پر ذاتی سیاسی رسہ کشی اور ابتدائی و ثانوی سطح پر حکومت کی سیاست نے یہ صورت بنائی ہے کہ اردو کا مستقبل تابناک نظر نہیں آتا۔ آپ کس حد تک متفق ہیں؟

اقبال مہدی: اردو کی ادبی صورت حال اتنی بری تو نہیں۔ اردو کو چاہنے اور پسند کرنے والے لوگ ہیں اور ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی.... سب ہی اس کو سننا پسند کرتے ہیں۔ تخلیقی نثر، تنقید، شاعری اور افسانہ نگاری اپنے طور پر جاری ہے لیکن چاہے یوپی ہو یا بہار یا دہلی، اردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے کی بات تو کرتے ہیں مگر پورے طور پر لازم نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ کہ خود اُردو والے، اردو جن کی مادری زبان ہونی چاہیے۔ ہم قرآن تو حفظ کرا دیتے ہیں مطلب نہیں جانتے اور ہم خود کوئی کوشش بھی تو نہیں کرتے۔ مادری زبان کے خانے میں ہندی لکھتے ہیں۔ ایک طرف ہندی پر سنسکرت تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں تو اردو والے اگر کمزور پڑ جائیں گے تو انجام کیا ہوگا۔ رہی سیاسی رسہ کشی تو وہ تو ہے اور بڑھتی رہے گی کہ جب تک آپ اردو اسکولوں، مدرسوں اور گھر میں نہیں پڑھیں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ اردو بولنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑیں گے۔ ایسی زبان بولیے کہ باہری ملکوں اور اپنے ملک میں لوگ پلٹ کر دیکھیں اور آپ سب پوچھیں کہ کیا آپ کا تعلق لکھنؤ سے ہے؟

■

Mohd Ghalib Nashtar, Lane Number:3, Sattar Colony, Bariatu, Ranchi - 834009 (Jharkhand)

محمد سہیل انور

اردو زبان کے موجودہ مسائل

(دہلی کے حوالے سے)

ہم جانتے ہیں کہ ہندستان صدیوں سے ایک کثیر اللسان و کثیر المذاہب ملک رہا ہے۔ طوطیِ ہند خسرو ہوں یا عبدالرحیم خانخاناں، کبیر ہوں یا نظیر، سودا و میر و درد ہوں یا ذوق و غالب و مومن و داغ سبھی نے ہندستان کی کثرت میں وحدت کے راگ الاپے ہیں، شاید اسی لیے کسی سیاست داں نے کسی موقعے پر کہا تھا کہ مسلم حکمراں نے ہندستان کو مشترکہ تہذیب و ثقافت، مذہبی رواداری، مساوات، قوتِ تحمل، گنگا جمنی تہذیب، پرشکوہ عمارتیں، قلعے اور شاہ راہیں [جو سیاحوں کے لیے سیر و تفریح کا وسیلہ ہیں جبکہ حکومتِ ہند کے لیے اقتصادیات کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہیں] اور دیگر اخوت پسند نشانیاں دی ہیں۔ بالخصوص مغل حکمرانوں نے ایک طرف شعراء کرام کو خطابات سے نوازا ہے تو دوسری طرف مغل بادشاہوں نے تاج محل، شاہجہانی مسجد، لال قلعہ، مرزا غالب اور اردو زبان جیسے ثروت مند تحائف سے سرفراز کیا ہے۔

اب یہ ہماری عقلِ سلیم اور ذوق و شوق پر منحصر ہے کہ ہم اپنے آبا کی نشانیوں اور ان کے قیمتی تحائف کی کتنی قدر کرتے ہیں اور کس درجہ اس کے تحفظ کو بحال رکھنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اب یہاں ایک سوال ذہن میں اُٹھتا ہے کہ دہلی میں اردو کی موجودہ صورتِ حال کی بابت ہم کس قدر ذمے دار ہیں اور اس کے فروغ کے لیے کتنے کوشاں ہیں؟ تو میرا جواب اثبات میں ہوگا کہ اردو جیسی زندہ زبان کو فی الحال تو خطرہ لاحق نہیں، ٹام آلٹر جیسے اردو کے شیدائی اور مداح یہ کہتے ہیں کہ 'اردو ایک زندہ زبان ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی زندہ زبان کو جاوداں بنانے کے لیے ہم اردو والوں کو اردو کی زبوں حالی اور اس کا ماتم کرنا چھوڑنا ہوگا۔ ہم اردو والوں کو بھی رونا دھونا اور ہائے اردو وائے اردو کا ماتم چھوڑ کر عملی میدان میں آنا ہوگا۔ البتہ عملی میدان میں اُترنے میں بہت ساری دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ اب اردو کا رونا دھونا کب تک؟ اس کی بدحالی و زبوں حالی پر زبانی جمع خرچ کب تک؟ یاد رکھیے جب کسی زبان و قوم پر دشواریاں آتی ہیں تبھی جہدِ مسلسل سے آسانیاں بھی اپنی راہیں ہموار کر لیتی ہیں۔

ہمیں یہ جان کر شرمندگی اور ندامت ہوگی کہ اہلِ زبان اردو سے زیادہ اردو کی خیر خواہی غیر اردو والوں نے کی ہے اور اس کی حمایت میں 'مرن برت' تک رکھا ہے اور اردو پر اپنی جان نچھاور کی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی واجب ہے کہ شری شیام منگل پانڈے جیسے اردو کے شیدائیوں کی قربانی بھی یاد رکھی جائے جنھوں نے اردو کے جائز آئینی حق کے لیے مرن برت رکھا اور آخر کار اسی مرن برت کے دوران جان دی۔ اردو والوں کی طرف سے یہ پہلی قربانی تھی۔

مجھے یہ بات ہمیشہ کھٹکتی ہے کہ نہ جانے کیوں سیاسی وجوہات کے باعث ہندی اور اردو کے مابین ایک دیوار کھڑی کی جاتی ہے۔ اگر ہم Phonetic کے مطالعے پر توجہ دیں تو ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ زبانوں کے تانے بانے ایک دوسرے سے کس قدر مشترک ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندستانی زبانوں میں سنسکرت کو، ہندوستانی زبانوں کی ماں یعنی جنّی کہا جاتا ہے۔ ہم ہستاکھر [Signature] کو دستخط کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ہست مطلب ہاتھ اور اکھر مطلب حرف یا خط یعنی کہ ہاتھ کی تحریر، اُسی طرح 'ماتر' ماں اور فارسی میں مادر=ماں۔ سنسکرت میں پتر = باپ جبکہ فارسی میں پدر= باپ۔ اُسی طرح انگریزی میں فادر معنی باپ جسے فرنچ تلفظ کے ساتھ پادر اور پادری بھی کہتے ہیں جو باپ کے درجے میں آتا ہے۔ Phonetic مطالعے کی مدد سے بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں جو اس بات کی ضامن ہیں کہ لسانیاتی مطالعے پر صلاحیتیں صرف کی جائیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کی زبانوں کا ایک دوسرے سے 'تانا بانا' بہت فطری ہے اور ہم بہت حد تک لسانی قضیوں و غلط فہمیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ بلکہ مختلف ہندستانی زبانوں کے حروف تہجی کی ایک بنیادی فرہنگ تیار کر کے زبانوں کے تعلق سے غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کر سکتے ہیں۔

مجھے یہاں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ایمریٹس استادِ محترم مرحوم محمد حسن صاحب کا ایک قول یاد آتا ہے، انھوں نے کسی موقع پر اردو کے متعلق کہا تھا کہ

'اس کی جڑیں کاٹی جارہی ہیں اور اس کی پتیوں کو سیراب کیا جارہا ہے' غالباً ان کا اشارہ ہم اردو والوں کی جانب تھا جو اپنے بچوں کو بنیادی طور پر اسکولوں میں اور اپنے گھروں میں اردو نہیں پڑھاتے ہیں۔ شاید آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ پنجابی و بنگالی حضرات اپنے گھروں میں اہلِ خانہ و بچوں سے پنجابی و بنگلہ زبان میں ہی بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اب ہم اپنا محاسبہ خود ہی کریں کہ اردو اخبار ورسائل کو خرید کر پڑھنا کسرِ شان سمجھتے ہیں [استثنائے چند]۔

دہلی، ہندستان کا دل ہے اور دلّی کی ٹکسالی زبان اور اس کی تہذیب و ثقافت اس کی روح ہے، لہٰذا غیر ارادتاً اور غیر فطری طور پر بھی ہم ہندستان کی روح کو اس کے جسم سے الگ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال اردو زبان کی بھی ہے کہ اس کا رسم الخط ہی ہندستان کی روح ہے، اردو زبان اپنے رسم الخط کے بغیر ویسے ہی ہے جیسے کہ جسم بغیر کھال زندہ تو رہ سکتا ہے لیکن بدنما اور نحیف نظر آئے گا جو شاید کسی کو قابلِ قبول نہ ہو۔ ایک دو نکات کی طرف توجہ مبذول کرا کے اپنی بات ختم کروں گا۔

چونکہ دہلی ہندستان کا دارالسلطنت ہے۔ اس لیے اس کو ایک Advantage یہ بھی ہے کہ یہاں تین سنٹرل یونیورسیٹیاں، ایک ڈیم یونیورسٹی جامعہ ہمدرد اور ایک فاصلاتی نظامِ تعلیم پر مبنی اندرا گاندھی یونیورسٹی بھی ہے۔ علاوہ ازیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نیشنل اوپن اسکول، اردو اکادمی، غالب اکادمی، انجمن ترقی اردو ہند، ایوانِ غالب، اقبال اکادمی، اردو میڈیم اسکول اور اس قبیل کے دیگر ادارے ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت سے اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ البتہ ہمیں اپنی ذمے داریوں کا احساس بروقت ہوجائے اور سنجیدگی سے اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہوں تو نہ صرف ہم اردو کی ترقی وفروغ میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں بلکہ اس زبان کے تئیں جو احساسِ محرومی وقتاً فوقتاً گھر کر جاتا ہے اس سے بہت حد تک نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ جس ریاست کو اردو کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے اُسی مقام پر اردو کو آکسیجن دینے کی نوبت آچکی ہے۔

شب خون کے جولائی تا ستمبر 2015 کے شمارہ میں بعنوان 'میں داستان اہلِ ستم کھُل کے کہہ گیا' از سید ظفر ہاشمی کی ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ جس میں انھوں نے United District Information [UDISE] System for Education کی رپورٹ کے حوالے

زبان ڈنڈے کے زور پر رائج نہیں ہوا کرتی۔ اردو اپنے بل پر کل بھی زندہ تھی اور آج بھی ہے اور رہے گی، پورے ملک میں ہے اور رہے گی، مغربی بنگال میں کرناٹک میں اور تمل ناڈو میں ہندی سے مخالفت کی گئی مگر اردو سے نفرت کسی جگہ نہیں کی گئی۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے خود بھی اردو کے لیے کچھ کریں۔

سے یہ معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد ملک کی دیگر ریاستوں کے تناسب میں زیادہ ہونے کے باوجود یوپی میں سرکاری اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد سب سے کم ہے۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ یوپی جو کبھی اردو کا مرکز تھا اور لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کا ڈنکا پوری دنیا میں بجتا تھا اس کا کیا ابتر حال ہوگیا۔

اس رپورٹ کے مطابق پورے ملک میں اٹھائیس ہزار دو سو چھہتر (28276) اردو میڈیم اسکول ہیں جن میں سولہ ہزار تین سو بیاسی سرکار کے تحت چلائے جاتے ہیں دہلی میں اردو میڈیم اسکول کی تعداد 311 جن میں سرکاری 101 ہیں یہ تشویش ناک حد تک کم ہیں۔ اور یوپی میں کل اردو میڈیم اسکول 3459 ہیں جن میں سرکاری صرف 175 ہیں یعنی پانچ فیصد۔ اُتر پردیش جس کی آبادی تقریباً بیس کروڑ ہے اور جس میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً پانچ کروڑ ہے۔ جہاں قانون ساز اسمبلی میں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی بیٹھی ہو جہاں اردو کا کبھی طوطی بولتا تھا۔ دہلی میں بھی اردو کی موجودہ صورتِ حال تشفی بخش نہیں ہے، جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ یہاں یونیورسٹیاں، ادارے اور اکادمیاں دیگر ریاست کے مقابلے زیادہ ہیں اور بہتر حالت میں ہیں، پھر بھی ہمیں اردو سے عدم دلچسپی کیوں؟ لیکن اسی شب خون کی رپورٹ پر ادارہ شب خون نے ردِ عمل کے طور پر اپنی جو آرا پیش کی ہیں اُسے بھی ملاحظہ فرمائیں:

اردو کے دشمن کون؟

ہندی شمالی ہند میں کل بھی مقبول تھی اور آج بھی ہے۔ مگر بنگال، مہاراشٹر، کرناٹک اور تمل ناڈو میں ہرگز مقبول نہیں ہے۔ زبان ڈنڈے کے زور پر رائج نہیں ہوا کرتی۔ اردو اپنے بل پر کل بھی زندہ تھی اور آج بھی ہے اور آنے والے کل میں بھی رہے گی، پورے ملک میں ہے اور رہے گی، مغربی بنگال میں کرناٹک میں اور تمل ناڈو میں ہندی سے مخالفت کی گئی مگر اردو سے نفرت کسی جگہ نہیں کی گئی۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے خود بھی اردو کے لیے کچھ کریں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ آزادی سے پہلے 1936 میں یوپی کی کانگریس وزارت کے زمانے میں ہی سمپورنانند نے اردو کے خلاف ذہن سازی اور ماحول سازی شروع کر دی تھی۔ یہ سارے حقائق تحریری طور پر موجود ہیں۔ اگر حکومت اردو کی تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں بدستور جاری رہنے دیتی تو آج اردو کا یہ حال نہ ہوتا لیکن یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ ساری مخالفتوں اور منافقتوں کے باوجود اردو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، پہلے بھولن سنگھ نے اردو روز نامہ 'آواز ملک' بنارس سے نکالنا شروع کیا، پھر سہارا گروپ نے ہندوستان کے تمام بڑے شہروں سے راشٹریہ سہارا اردو شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد انقلاب اور 'آزاد ہند' جیسے قدیم اردو اخبارات کو غیر مسلم ناشرین نے خرید کر اعلیٰ معیار پر شائع کرنا شروع کیا۔ جاگرن گروپ نے جب 'انقلاب' کو خرید لیا۔ اب تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ اکثریتی طبقے میں اردو کی مخالفت کا زور نیچے آنے لگا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سیاسی بازیگروں نے ہندی اردو کا جھگڑا کھڑا کیا تھا۔ اکثریتی طبقے کے عوام کو اس سے کوئی لینا دینا نہ تھا۔ برادرانِ وطن اردو کی طرف پوری طرح مائل ہیں وہ اردو سیکھ رہے ہیں، اردو بول رہے ہیں اور اپنے بچوں کو شوق سے پڑھا رہے ہیں۔ ہم ہی غافل ہیں اور ہمیں معاف کیا جائے تو ہم یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہیں کہ ہمارے یہی چھن رہے تو ہم ہی اردو کے قاتل ٹھہریں گے۔

(شب خون، جولائی تا ستمبر 2015، ص 26-24)

در اصل اردو کی آبیاری اور اردو کو اس کا واجب منصب و آئینی حق دلانے کے لیے ہم کس قدر عمل پیرا ہیں، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سمینار و سمپوزیم منعقد کرانے کے ساتھ ساتھ گاہے بہ گاہے ایک ایسی نشست بلائی جاتی رہے جس میں اردو کے تئیں اردو والوں کی عملی کارکردگی، کارگذاری و سنجیدہ کوشش پر تبادلۂ خیال ہو اور مثبت فکر و عمل کی روشنی میں مشورے و تجاویز پاس کی جائیں۔

■

Mohd Sohail Anwar, (Research Associate, Librarian), Fakhruddin Ali Ahmad Research Library, Ghalib Institute, New Delhi - 110002
Mob.: 9350572257
E-mail.: anwersohail79@gmail.com

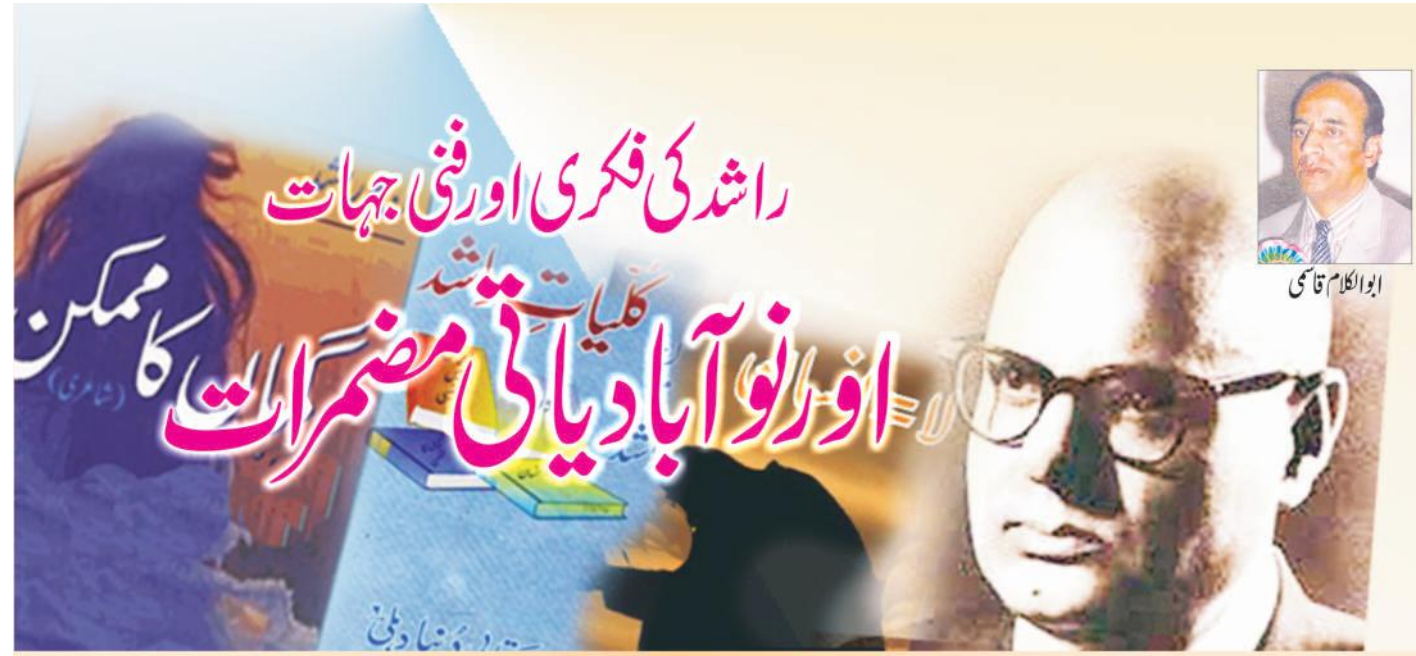

راشد کی فکری اور فنی جہات

اور نو آبادیاتی مضمرات کا ممکن

ابوالکلام قاسمی

گذشتہ نصف صدی میں اردو شاعری کی ہیئتی تنقید کی افراط کے باوجود نئی یا پرانی شاعری کے بارے میں گفتگو، ڈکشن یا اسلوب سے شروع کی جائے یا پھر موضوع اور مضمون کا سرا پکڑ کر شعری ڈکشن کے اسرار کی دریافت کی کوشش کی جائے، بات گھوم پھر کر پہنچتی ہے بہرحال موضوع کے انتخاب اور فکری مضمرات تک۔ ن.م.راشد اس اعتبار سے خوش نصیب شاعروں میں ہیں کہ ان کو ہیئت اور اسلوب کے مجدد کے طور پر بھی قبول کیا گیا اور جنسیت زدگی اور فراریت کے ابتدائی الزامات کے باوجود فکری اور موضوعاتی اعتبار سے انھیں ایک بالغ نظر بلکہ دانش ور شاعر کا مقام بھی دیا گیا۔ جس نے اپنی ذات اور نفسیات کی کامیاب عقدہ کشائی کے ساتھ گردوپیش کے معاشرتی اور بسااوقات عالمی سطح کے آفاقی مسائل سے بھی گہرا سروکار رکھا۔ انھوں نے بالعموم معاشرتی اور نیم سیاسی نوعیت کے مسائل تک کو جذبے اور احساس کی سطح پر لاکر اس حد تک غیر ذاتی بنانے کی کوشش کی کہ ان میں ایک تعمیم کی کیفیت بھی پیدا ہوئی اور خود ان کے سیاسی اور معاشرتی موقف کی نشان دہی کوئی مشکل بات بھی نہ رہی۔

راشد کی شاعری کا دورِ عروج ترقی پسند تحریک کا بھی دورِ عروج تھا۔ اس لیے اس دور میں اگر اظہار کے نئے اسالیب کی تلاش اور قدرے ابہام آمیز لہجے کو تنقید کا ہدف بنایا گیا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ اس وقت بھی اگر وقتی رجحان کی تقلید کے بجائے راشد کی نظموں کی ہمدردانہ تفہیم کی کوشش کی جاتی تو ان کی شاعری کی سماجی اور معاشرتی قدر و قیمت کی کماحقہ داد دی جاسکتی تھی۔ چوں کہ محض خطیبانہ لب و لہجہ، لفظوں کا اسرافِ بے جا اور اکہرا اسلوب بیان، راشد کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا اس لیے ان کے بعض معاصر نقادوں نے بھی ان کے موضوعات کو جنسی رویے اور فراریت کا نام دینے کی کوشش کی اور ان کے ڈکشن کو ابہام زدہ قرار دے کر سنجیدہ مطالعے کا موضوع نہیں بنایا۔ بعد کے زمانے میں راشد سے متعلق دوسری نثری تحریروں کے سامنے آنے اور خود ان کے خطوط کی اشاعت کے نتیجے میں یہ حقیقت لوگوں سے مخفی نہیں رہی کہ راشد اپنی شروع کی نظموں میں ابہام کے غیر شعوری عمل دخل سے خود بھی عرصے تک اُلجھتے رہے اور اس وقت تک ان کی اُلجھن دور نہیں ہوئی جب تک ان کے نہایت باخبر اور دانش ور دوست آغا عبدالحمید کے خط سے یہ اطلاع نہ مل گئی کہ مغرب میں ایمپسن کے کتابچے 'ابہام کی سات قسمیں' کی اشاعت کے بعد اب ابہام کو علی العموم معتوب قرار نہیں دیا جاتا اور یہ کہ اگر ابہام ناگزیر طور پر تخلیقی عمل کی سریت کا زائیدہ ہے تو اس نوع کی شاعری کے معنوی امکانات میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

اس ضمن میں شاید اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ راشد کے لیے اپنی افتادِ طبع اور فکری سطح کے باعث اپنے ذاتی احساس اور تجربے کو تعمیمی بنانا اور اسے عام تجربے سے ہم آہنگ کرنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ فارسی میں گہرا درک رکھنے کے باعث فارسی تراکیب کا استعمال اور اس کے ساتھ ہی ہند اسلامی تلمیحات اور کبھی کبھی دیومالا اور اساطیر کو اپنے بہتر اور بھرپور اظہار کا وسیلہ بنانے میں راشد یک گونہ اطمینان محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نقادوں نے انھیں لسانی اور فکری اعتبار سے خواص پسند شاعر کا نام بھی دیا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نے ان کی اس صفت کا ذکر لسانی نقطۂ نظر سے کیا ہے جب کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کو دانش ورانہ زاویۂ نظر کے باعث خواص پسند بتایا ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نے لکھا کہ:

''زبان کی دنیا میں وہ خواص پسند واقع ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے انتخاب الفاظ کا دائرہ محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ اسے فقط وہی الفاظ خوش آتے ہیں جن کے رنگوں میں شوخی اور چمک دمک اور جن کی آوازوں میں گہرائی اور گونج پائی جاتی ہے۔''

جب کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال تھا کہ:

''راشد اِن معنوں میں عوام کا نہیں بلکہ خواص کا شاعر ہے اور اس کی شاعری سے لطف اندوزی کے لیے بھی ایک دانش ورانہ مزاج کی ضرورت ہے۔''

ظاہر ہے کہ ان دونوں رایوں میں راشد کی حدود کا ذکر تو ضرور ملتا ہے مگر ان کے سہارے راشد کی اسلوبیاتی اور موضوعاتی تفہیم کا سلسلہ بھی آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ تاہم دیکھنے کی بات یہ ہے کہ موضوع اور ہیئت میں اس امتیازی طریق کار کے باعث راشد کی نظم گوئی نے اردو نظم کے اس وقت تک رائج لہجے کو کن تبدیلیوں سے آشنا کیا۔ اردو نظم کے صنفی ارتقا پر نظر رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس وقت تک حالی اور آزاد کی تحریک نظم کے باوجود مغربی انداز کی نظم نگاری کے اسالیب اردو کو میسّر نہیں آسکے تھے۔ آزاد نظم یا تو نظم کی ضمنی اصناف مثلاً رومانی، مدحیہ، مثنویانہ یا قطعاتی خانوں میں تقسیم کی جاسکتی تھی یا پھر موضوعاتی ارتقا کے طور پر جن نظموں کا چلن عام ہوسکا تھا وہ ماسوا اقبال کی نظم کے، غزل کے اسالیب اور لب و لہجے کی توسیع کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ پھر یہ کہ جب نظم کی ہیئت کی مغربی معیار بندی اقبال تک کی نظموں میں پوری طرح روبہ عمل نہیں آسکی تھی تو دوسرے کسی شاعر سے اور کیا توقع وابستہ کی جاسکتی تھی۔ اس پوری صورت حال میں کفایت لفظی، تہہ داری اور خیال کے ارتقا کے صنفی شعور

کے ساتھ سامنے آنے والی راشد کی نظمیں نہ صرف یہ کہ عام اردو نظموں سے مختلف تھیں، خود حلقۂ ارباب ذوق کے نظم نگاروں سے بھی ممتاز تھیں۔ راشد کی اس انفرادیت میں ان کی زبان کا آہنگ اور فارسی تراکیب کا دبدبہ بھی، جیسا کہ ذکر کیا گیا، کوئی کم اہم رول ادا نہیں کرتا، جس کے باعث ان کے لہجے میں بلند آہنگی اور کسی حد تک اسلوبیاتی شکوہ کو بہ خوبی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار مشکل ہے کہ محض زبان اور اسلوب کے خارجی ڈھانچے نے ان کا آہنگ بلند نہیں کیا تھا۔ ان کی بلند آہنگی اور لہجے کی تہہ داری میں ان کی فکری سطح اور دانش ورانہ طمطراق کا کردار بھی کسی طرح کم نظر نہیں آتا۔

راشد کی شاعری کے وہ موضوعات، جو ان کے دانش ورانہ اندازِ فکر کی تشکیل کرتے ہیں ان میں ممتاز حیثیت ان کی مشرقیت کو حاصل ہے۔ یوں تو بعض نقادوں نے ان کی مشرقیت کو علامہ اقبال کے تصورِ مشرق کے تسلسل کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی ہے جس سے پوری طرح انکار تو نہیں کیا جا سکتا، مگر راشد کی فکر کے سیاق وسباق میں ان کی مشرقیت کے مضمرات اقبال کے ملی اور تہذیبی حوالوں سے کہیں زیادہ دور رس معلوم ہوتے ہیں۔ مشرقی قوموں پر مغرب کی سیاسی بالادستی اور اس نوآبادیاتی تناظر میں اگر اردو شاعروں کے فکری رویوں کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بعض شرائط کے ساتھ اکبرالہ آبادی اور علامہ اقبال کے بعد ن.م.راشد کے علاوہ اردو کا کوئی اور نمائندہ شاعر ایسا نظر نہیں آتا جو نوآبادیاتی تسلط اور اس کے زیراثر پروان چڑھنے والی منفی فکر پر اپنے ردِّعمل کا واضح اور غیر مبہم اظہار کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اکبرالہ آبادی چوں کہ خطِ مستقیم کے شاعر ہیں اس لیے ان کے مابعد نوآبادیاتی نقطۂ نظر میں کوئی بڑی گہرائی نہیں تلاش کی جا سکتی۔ جب کہ اقبال کی مشرق پسندی زیادہ تر مذہبی، ملی اور تہذیبی اعتبار سے اپنی معنویت قائم کرتی ہے۔ راشد چوں کہ ایک غیر مشروط ذہن کے بیدار مغز شاعر ہیں، اس لیے ان کی مشرقیت نہ تو محض تہذیب پسندی کا شاخسانہ ہے اور نہ مشرق کے حوالے سے اخلاقی روایت اور اقدار پرستی کا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بیسویں صدی کے شعری افق پر روایت شکنی اور غیر رجعت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کے معاملے میں راشد اس حد تک آزاد، روشن خیال اور خود کفیل ہیں کہ وہ اپنے پیروں سے دقیانوسیت کی ہر زنجیر کو کاٹ پھینکنے کے در پے رہتے ہیں... تو سوال یہ ہے کہ راشد کی مشرقیت کیا ہے؟ اور ان کے یہاں کس مشرق کی بازیافت کی کوشش ملتی ہے؟ اس سوال کا جواب نہ تو تہذیبی حوالے سے دیا جا سکتا ہے نہ روایتی حوالے سے اور نہ مذہبی یا اخلاقی حوالے سے۔ ان کی ساری مشرق پسندی محکومیت کے شدید احساس اور سیاسی یا معاشرتی کے ساتھ ذاتی آزادی کی زائیدہ ہے۔ اس نقطۂ نظر کے اظہار میں انھوں نے اپنی بیش تر نظموں میں کہیں مرکزی طور پر اور کہیں ضمنی انداز میں مشرق کی محکومی اور غلامی کو بالواسطہ اور بلاواسطہ انداز میں زیرِ بحث لانے کی کوشش کی ہے۔ ایران میں اجنبی، میں شامل متعدد نظموں میں تو انھوں نے اس کرب کو نہایت موثر انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ عالمی سطح پر برتی جانے والی تفریق اور مغربی طاقتوں سے سراسیمہ مشرق کی پوری تصویر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس سلسلے میں پہلے ان کی مختلف نظموں کے بعض مصرعوں کو سامنے رکھا جائے تو ان کے رویے سے شناسائی ہو جاتی ہے:

عمر گزری ہے غلامی میں مری/ اس سے اب تک
مری پرواز میں کوتاہی ہے/ (سپاہی)

شکر کر، اے جاں کہ میں/ ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ
غلام/ صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گرِ اعظم نہیں/ (شرابی)

بندگی سے اس درودیوار کی/ ہو چکی ہیں خواہشیں
بے سوز و رنگ و ناتواں/ (رقص)

اس روحِ شب گرد کا/ اک کنایہ ہے شاید/ یہ
ہجرت گزینوں کا بکھرا ہوا قافلہ بھی/

جو دستِ ستمگر سے مغرب کی، مشرق کی پنہائیوں
میں/ بھٹکتا ہوا پھر رہا ہے/ (دستِ ستمگر)

تیرے بستر پہ مری جان کبھی/ آرزوئیں ترے سینے
کے کہستانوں میں/ ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی
ہیں/ (بیکراں رات کے سنائے میں)

ان مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابتدا کی تین مثالوں کی طرح نوآبادیاتی حکمرانوں پر ان کے طنز کی کاٹ کتنی گہری ہو جاتی ہے جب کہ موخرالذکر دو نظموں کے مصرعوں میں ان کا لہجہ بہت سدھا سدھایا، تہہ دار اور علامتی طنز کی مثال پیش کرتا ہے۔ تاہم راشد کی نظموں میں جو مابعد نوآبادیاتی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے اس کی منطق ایسی سیدھی سادی بھی نہیں کہ اسے تنقید کے کسی ایک فارمولے کا مصداق قرار دے دیا جائے۔ اس لیے کہ ان کی نظموں میں مشرق کا نمایاں ترین حوالہ تو یقیناً نوآبادیاتی ردِّعمل کو سامنے لاتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی راشد کو مشرق میں جس نوع کا تہذیبی اضمحلال نظر آتا ہے اسے وہ محض محکومی کا ہی نتیجہ نہیں قرار دیتے۔ وہ مشرقی لوگوں کے توہم پرستانہ ذہن، خوش عقیدگی اور فکری تجدد پسندی سے انکار کو بھی اس اضمحلال اور زوال کے اسباب میں شمار کرتے ہیں۔

راشد کے پہلے مجموعے 'ماورا' میں شامل نظم 'شاعر درماندہ' کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے مشرق و مغرب کی آویزش کے ابتدائی نشانات اسی نظم میں ملتے ہیں۔ جن میں محبوب کی عافیت کوشی کے مقابلے میں نظم کے واحد متکلم کا سارا المیہ افرنگ کی دریوزہ گری اور محکومی کے لفظوں میں سمٹ آیا ہے۔ اس نظم سے راشد کی اس ہنرمندی کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے احساس اور تجربے کی تہہ داری اور پیچیدگی کو خود ساختہ لفظی تراکیب کے وسیلے سے منتقل کرنے میں کیسی ریاضت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اس نظم میں مشرق کی محکومیت کا سارا الزام محض افرنگ کی دریوزہ گری پر عائد کر کے کسی اکہرے یا مطلق فیصلے تک پہنچنے کے بجائے اپنے آباواجداد کی عافیت پسندی کو بھی نکبت وادبار کا سبب قرار دیتے ہیں:

زندگی تیرے لیے بسترِ سنجاب وسمور/ اور میرے
لیے افرنگ کی دریوزہ گری/ عافیت کوشی آبا کے طفیل/ میں
ہوں درماندہ و بے چارہ ادیب/ خستۂ فکرِ معاش/ پارۂ نان
جویں کے لیے محتاج ہیں ہم/ میں، مرے دوست، مرے
سیکڑوں اربابِ وطن/ یعنی افرنگ کے گلزاروں کے پھول/

ان مصرعوں میں تقابلی انداز کے ساتھ خود احتسابی اور طنز کی آمیزش نے راشد کے لہجے کو ان کے موقف سے پوری طرح ہم آہنگ کر دیا ہے۔ شاعر کی درماندگی کیوں کر اس کے وطن اور اربابِ وطن کے ساتھ مربوط ہو کر نوآبادیاتی جبر کا ردِّعمل بنی ہے اور کس طرح محبت ایک ایسی رفاقت کا مثالی تصور بن جاتی ہے جو دو اناؤں کے اتصال کے وسیلے سے جہاں سوزی اور صورت حال کی تبدیلی کی خواہش پر منتج ہوتی ہے۔ اس کا نہایت اثرانگیز اور فنی اظہار اس نقطۂ عروج کے ساتھ ہوتا ہے:

تو مسرت ہے مری، تو مری بیداری ہے/ مجھے آغوش
میں لے/ دو انا مل کے جہاں سوز بنیں/ اور جس عہد کی
ہے تجھ کو دعاؤں میں تلاش/ آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے/

'شاعر درماندہ' کے برخلاف راشد کی نظم 'انتقام' زیادہ شدت کے ساتھ غلامی کے احساس پر مرکوز ہے۔ اس سبب سے اس کے بعد مصرعوں میں راشد کا سار کھ رکھاؤ برقرار نہیں رہ پاتا، تاہم نظم کے تمام مصرعے نظم کے بنیادی تصور کو آگے بڑھانے میں ناگزیر رول ادا کرتے ہیں۔ اس نظم میں یاد اور نسیان کو گڈمڈ کر کے تاریخی بتوں اور مجسموں کے حوالے سے انتقام کی شدت کو نمایاں کیا گیا ہے:

اجلی اجلی اونچی اونچی دیواروں پہ عکس/ ان فرنگی
حاکموں کی یادگار/ جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں/

سنگ بنیاد فرنگ/ (انتقام)

یوں تو قدرے برہنہ گفتاری کے باعث 'انتقام' کا مثبت اور منفی حوالہ کثرت سے آتا رہا ہے۔ مگر موضوع کی مماثلت کے باوجود راشد کی نظم 'اجنبی عورت' زیادہ قرار واقعی نقطۂ نظر کو ظاہر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ موقف کی غیر ضروری وضاحت نے اس نظم میں اکہرا پن ضرور پیدا کیا ہے مگر شاعر کے سماجی زاویۂ نظر کا اظہار 'اجنبی عورت' میں خاصے غیر مبہم انداز میں ہوا ہے۔ تاہم جو چیز اس نظم کو اظہار کی راست تکنیک کے باوجود ہمہ گیر بناتی ہے وہ اس نظم کا وہ دائرۂ کار ہے جو زیادہ وسیع ہے اور اس سے مترشح ہونے والا انسانی سروکار نسبتاً زیادہ ہمہ جہت اور پھیلا ہوا ہے:

ایشیا کے دورافتادہ شبستانوں میں بھی/ میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں/ کاش اک دیوار ظلم/ میرے، ان کے درمیان حائل نہ ہو.... ارض مشرق! ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں/ آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب/ دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے/ ان کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں/ (اجنبی عورت)

نوآبادیاتی پس منظر میں مشرق و مغرب کی آویزش کا معاملہ راشد کی نظموں میں محض تسلط یا محکوم قوموں کے لیے اپنے ماضیِ قریب کی نفی کے طور پر زیر بحث نہیں آتا بلکہ اس سے بڑا یا ایک نوع کا آفاقی پس منظر تیار کرتا ہے۔ جس میں انسانوں کے مابین رنگ، نسل یا قومیت کی بنیاد پر تفریق قائم کرنے کی ذمے داری بھی نوآبادیاتی طریق کار پر عائد ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کو یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا کہ مشرقی اقوام کے درمیان تفریق تک کا احساس بھی مغرب کا ہی پیدا کردہ ہے، اس طرح مغرب ہی اس تفریق کا بنیاد گزار ہے۔

اس ضمن میں اگر 'ایران میں اجنبی' میں بعض نظموں کو سامنے رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایران کے حوالے سے مشرق و مغرب کی آویزش کے احساس میں شدت اور اس کا فن کارانہ اظہار نسبتاً زیادہ موثر طریقے پر ہوا ہے۔ 'زنجیر' اسی نوع کی ایک نظم ہے جس میں زنجیر کی علامت دراصل زنجیر کی جنبش، یا پابہ زنجیر آدمی کے عدم اطمینان یا باغیانہ ارتعاش کو نشان زد کرتی ہے:

گوشۂ زنجیر میں/ اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی/ سنگ خارا ہی سہی، خار مغیلاں ہی سہی/ دشمن جاں دشمن جاں ہی سہی/ ... ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں/ اک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی/

راشد کی تکنیک کی یہ خصوصیت ان کی متعدد نظموں میں نشان زد کی جا سکتی ہے کہ اگر وہ بعض الفاظ یا علامات کو نظم کے آغاز میں ابہام زدہ انداز میں سامنے لاتے ہیں تو اس کی کمک یا تفہیم کی خاطر کوئی نہ کوئی معاون لفظ یا فقرہ نظم کے آخری مصرعوں تک کہیں نہ کہیں ضرور سامنے آجاتا ہے۔ اس نظم میں بھی گوشۂ زنجیر کی جنبش لازمی طور پر زنجیر کے توڑنے کا اشارہ تو نہیں معلوم ہوتا مگر آخری مصرعوں میں جب زنجیر کی گرہ کھلتی ہے تو یہ فقرے پوری نظم کو زیادہ بلند پایہ اور روشن بنا دیتے ہیں:

شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں/ ایک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی/ پردۂ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ کر/ چار سو پھیلے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ/ اور اس ہنگام بادآور کو/ حیلۂ شب خوں بناؤ۔

اس نظم کے مرکزی موضوع کو زیادہ مستحکم اور فنی طور پر اثر انگیز بنانے کی خاطر راشد نے ریشم کے کیڑے کی علامت کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس کیڑے کا حبس، اس کا اپنے بنائے ہوئے خول میں محبوس ہو جانا، اس کے لعاب سے ریشم کے تار ہائے سیم و زر کا بنایا جانا اور اس کے استعمال سے خود مشرق اور اقوام مشرق کا محروم رہنا، ساری چیزیں اس مرکب علامت کے دائرۂ کار میں شامل ہو جاتی ہیں اور محکومی، حبس اور استحصال کے احساس کو زنجیر کی علامت کے متوازی کے طور پر شدت سے دوچار کر دیتی ہیں:

حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل/ وہ حسیں اور دورافتادہ فرنگی عورتیں/ تو نے جن کے حسن روز افزوں کی زینت کے لیے/ سالہا بے دست و پا ہو کر بُنے ہیں تار ہائے سیم و زر/ ان کے مردوں کے لیے بھی، آج اک سنگین جال/ ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال۔ (زنجیر)

اس موضوع کے اظہار کی مزید فن کارانہ اور واضح صورت 'ایران میں اجنبی' میں ہی شامل نظم 'من و سلویٰ' سے سامنے آتی ہے جو ایران کے المیے سے شروع ہو کر بالآخر نوآبادیاتی جبر و تسلط کے حوالے سے ہندوستان سمیت علی الاطلاق سارے مشرق کو اپنا موضوع بنا لیتی ہے۔ یہ طویل نظم جس کے ابتدائی مصرعے ہی موضوع کی عالم گیریت کا احساس دلا دیتے ہیں کچھ اس طرح ہیں:

خدائے برتر/ یہ دار پوشِ بزرگ کی سرز میں/ یہ نوشیروانِ عادل کی دادگاہیں/ تصوف و حکمت و ادب کے نگارخانے/ یہ کیوں سیہ پوش دشمنوں کے وجود سے/ آج پھر اُبلتے ہوئے ناسور بن رہے ہیں/ یہ شہر اپنا وطن نہیں ہے/ مگر فرنگی کی رہزنی نے/ اسی سے ناچار ہم کو وابستہ کر دیا ہے/ ہم اس کی تہذیب کی بلندی کی چھپکلی بن کے رہ گئے ہیں/

ان مصرعوں میں دشمنوں کی سیہ پوشی، ابلتے ہوئے ناسور اور تہذیب کی بلندی کی چھپکلی، جیسے طنزیہ اور علامتی پیکر تہذیب اور روایت کی پامالی کے حوالے سے بھی نوآبادیاتی صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہیں اور پورے ارض مشرق کے عمومی اور یکساں مسائل کا کرب ناک اظہار بھی بن جاتے ہیں جن کا سبب راشد کے مابعد نوآبادیاتی ردِعمل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس نظم میں محکوم قوموں اور افراد میں نوآبادیاتی حکمرانوں کی لَے میں لَے ملانے والوں کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے (مرے بہت سے رفیق/ اپنی اداس، بیکار زندگی کے/ دراز و تاریک فاصلوں میں/ کبھی کبھی بھیڑیوں کی مانند/ آنکلتے ہیں) اور حکمرانوں کی بخشش کے طفیل ان کے غالب نقطۂ نظر کو پیش کرنے میں یہ تک محسوس نہیں کرتے کہ وہ کیوں کر اپنے ماضی اپنے وطن اور اپنی تہذیب کی نفی کا ارتکاب کر رہے ہیں (اس آرزو میں/ کہ ان کی بخشش سے/ پارۂ نان، من و سلویٰ کا روپ بھر لے/

یہ نظم اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے ایک مکمل المیہ بن جاتی ہے جو ظاہر ہے کہ راشد کے قائم کردہ بڑے سیاق و سباق کے طفیل پورے مشرق کا المیہ ہے جس میں دنیا کی کثیر محکوم آبادی کو شامل محسوس کیا جا سکتا ہے:

یہ سنگدل اپنی بزدلی سے/ فرنگیوں کی محبت ناروا کی زنجیر میں بندھے ہیں/ انہی کے دم سے یہ شہر اُبلتا ہوا سا ناسور بن رہا ہے/ محبت ناروا نہیں ہے، بس ایک زنجیر/ ایک ہی آہنی کمند عظیم/ پھیلی ہوئی ہے/ مشرق کے اک کنارے سے دوسرے تک/ مرے وطن سے ترے وطن تک/ بس ایک ہی تار عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں/ ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں/ بس ایک ہی درد لا دوا میں/ اور اپنے آلام جاں گزا کے/ اس اشتراکِ گراں بہا نے بھی/ ہم کو ایک دوسرے سے/ قریب ہونے نہیں دیا ہے۔ (من و سلویٰ)

کم و بیش اسی شدت اور تواتر کے ساتھ راشد کی نظموں 'تیل کے سوداگر' اور 'طلسم ازل' میں راشد نے نوآبادیاتی طریق کار اور طرز فکر پر اپنے ردِعمل کا شاعرانہ، اکثر تہہ دار اور کبھی کبھی شدید طنزیہ انداز میں اظہار کیا ہے اور اس طرح اپنی شاعری کے غالب حصے میں نوآبادیاتی مضمرات کی نقاب کشائی کی ہے۔

■

Professor **Abul Kalam Qasmi**, Dept. of Urdu,
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202002 (UP)

مناظر عاشق ہرگانوی

جدید اردو غزل میں ’زلزلہ‘

پوری دنیا میں زلزلے کے اتنے جھٹکے آچکے ہیں اور آنے کا خدشہ ہے کہ انسان نفسیاتی مریض بنتا جارہا ہے۔ سائنسی وجوہات کئی ہیں، گرم لاوا کا نکلنا، قوت کشش کا غیر متوازن ہونا، پتھروں کی تختوں کا سرکنا، آتش فشاں کا پھوٹ پڑنا اور زیر زمیں پانی کے ذخیروں کا غیر متوازن دباؤ زلزلے کے اسباب ہیں۔

مذہبی روایت سے دیکھا جائے تو قرآن کریم کی النازعات 10‘ میں واضح طور پر اشارہ ہے کہ:

’’زمین پوری کی پوری ہلا دی جائے گی اور وہ اپنے پیٹ کا بوجھ نکال پھینکے گی اور انسان کہے گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے... زلزلے کا ایک جھٹکا اور اس کے بعد دوسرا جھٹکا۔ اس دن دل کانپ رہے ہوں گے اور نگاہیں خوف زدہ ہوں گی؟

زلزلہ جب بھی آتا ہے تو قیامت کا منظر ہوتا ہے۔ ’قیامت‘ کے زلزلہ کے بارے میں آیت ’الزلزال‘ میں بہت کچھ درج ہے۔

لیکن آج ہم کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ہر طرف آہ و بکا کا منظر ہوتا ہے اور تباہ کاریوں کا ایک سلسلہ نظر کے سامنے رہتا ہے۔ لوگ موسم کی مار سہتے ہوئے آدھے ادھورے کیمپ میں اور دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اس مجبوری سے بہت سے لوگوں کے وارے نیارے ہوجاتے ہیں۔ لیکن مستحق کی آس امدادی رسد پر ٹکی رہتی ہے۔ یہ منظر قیامت صغریٰ سے کم نہیں ہوتا ہے۔

اردو شاعروں نے فکری اور سماجی سطح پر ’زلزلہ‘ کے امتیازی نشان کو بارہا موضوع بنایا ہے۔

خصوصی طور پر جدید غزل گو شعرا نے بھی وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے اسے الگ پہچان دی ہے۔ نئی شعریات سے ہم آہنگ ہوکر اظہار کے نئے پیکر تخلیق کیے ہیں اور رمزی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ فنی مہارت کے ساتھ خوں چکاں حکایت اور صورت حال کی سچائی دیکھیے:

لوگ کہتے ہیں زلزلہ جس کو
ہے عجب تازیانہ فطرت کا
(قیصر شمیم)

جب گناہوں سے بھر گئی دھرتی
زلزلوں سے بکھر گئی دھرتی
(نذیر فتح پوری)

جب بھی گناہ بڑھتے ہیں آتا ہے زلزلہ
کتنی ہی بستیوں کو جلاتا ہے زلزلہ
(صلاح الدین نیر)

جب فصل مظالم کی کچھ لوگ اگاتے ہیں تو زلزلے آتے ہیں
پھر اس کو لہو دے کر پروان چڑھاتے ہیں تو زلزلے آتے ہیں
(محبوب راہی)

چھیڑنا ٹھیک نہیں ندیوں پہاڑوں کو کنول
زلزلے قہر خدا بن کے بتانے نکلے
(رمیش کنول)

نہیں عذاب خدا کا تو زلزلہ کیا ہے
زمیں کے تن کے لرزنے کا سلسلہ کیا ہے
(فراغ روہوی)

ہمارے سیہ کارناموں سے عابد
زمیں کانپ اٹھی مگر ہم نہ کانپے
(عطا عابدی)

جو زندگی تھی ڈوبی ہوئی عیش وطرب میں
اک پل میں زلزلے نے اسے خاک کردیا
(فردوس گیاوی)

زلزلے آتے نہیں یوں ہی جہاں میں اے نفیس
جب زمیں پر شر بڑھا، زیر و زبر اس نے کیا
(نفیس دسنوی)

چاہے کچھ بھی نام دو ہے قدرت کی مار
پرلے بن کر آ گیا پل بھر میں بھونچال
(فراز حامدی)

زلزلوں کی سائنسی توضیحات کے درست ہونے کے باوصف روحانی اور اخلاقی طور پر آج بھی یہ خیال اور نظریہ انسانی شعور کو گرفت میں لیے رہتا ہے کہ احکام الٰہی سے سرتابی اور روگردانی کے سبب خدا کا قہر و غضب زلزلہ بن کر

آتا ہے۔ جدید غزل گو شاعروں کے سامنے گناہوں کا گرم بازار ہے اسی لیے ان کی فکر میں حرارت، جبلت اور امکانات کی نقشہ کشی ملتی ہے۔ لیکن دوسرے موضوعات کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے اور زلزلے کے کینوس کو وسعت عطا کی گئی ہے۔ نگاہِ بصیرت اندوز اور باطن کے حقائق تک پہنچنے کا اندازِ جداگانہ ملاحظہ کیجیے:

اس نے مجھ کو یاد فرمایا یقیناً
جسم میں آیا ہوا ہے زلزلہ سا
(مظفر حنفی)

زمیں کو اے خدا وہ زلزلہ دے
نشاں تک سرحدوں کے جو مٹا دے
(پروین کمار اشک)

گھر میں آسیب زلزلے کا ہے
اس لیے خود میں ہی سمٹ کے ہیں
(شمیم قاسمی)

ہوا ہے قریۂ جاں میں یہ سانحہ کیسا
مرے وجود کے اندر ہے زلزلہ کیسا
(ارمان نجمی)

طوفان آئے شہر میں یا کوئی زلزلہ
مجھ کو کسی بھی بات کا اب ڈر نہیں رہا
(سیفی سرونجی)

التفاتِ دوستاں بھی زلزلہ سے کم نہیں
کچھ سلوکِ دشمناں بھی زلزلہ سے کم نہیں
سوئے صحرا ہی چلیں شاید رہیں محفوظ کچھ
اب تو صحنِ گلستاں بھی زلزلہ سے کم نہیں
(عبدالمنان طرزی)

پہلے ہی تخت و تاج ہمارے چلے گئے
اس زلزلے میں شاخِ عمارت بھی گر گئی
مینار جو بچا تھا زمیں بوس ہوگیا
اجداد کے سروں کی علامت بھی گر گئی
(سہیل ارشد)

کوئی دو منٹ ہل گئی تھی زمیں
جھکا خاک پر سرینواروں کا تھا
(منیر سیفی)

زلزلے کا تھا سفر جس میں کی مستی ہم نے
خشک چٹانوں پہ دوڑا دی ہے کشتی ہم نے
(شاہد جمیل)

جو زلزلے مرے قلب و جگر میں اٹھتے ہیں
اگر زمین میں اٹھتے دراز کر دیتے
(حلیم صابر)

وہ زلزلہ جو نہیں تھا تو کیا تھا آیا ہوا
تمام جسم ابھی تک ہے تھرتھرایا ہوا
(رونق نعیم)

اسے تو یاد نہیں زلزلے کی صورت تک
مگر خیال جو آیا زمیں لرز اٹھی
(نسیم عزیزی)

ایک ناکام محبت کے لیے
ہے تری بے رخی اک زلزلہ
(منصور خوشتر)

برق باراں تیرگی اور زلزلہ
بدلا بدلا سا ہے موسم کا مزاج
(عاصم شہنواز شبلی)

مخلص و ہمدرد بن کر جو کرے ہے رہزنی
اُس رفیقِ راہ کی بھی ہے رفاقت زلزلہ
(مناظر عاشق ہرگانوی)

معنی متشکل کرنے اور الفاظ کی کلیت کی زندہ تمثال بنانے میں جدید غزل گو شاعروں نے تہہ دار حقیقت کو پیش کیا ہے۔ زلزلے سے جو تباہی آتی ہے اس صورت حال کی تخلیق کاری کو بھی شاعروں نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ اس میں ان کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ دھڑکن بنتا ہے۔ نفس مضمون میں سنجیدگی اور شاعرانہ صداقت اس طرح ملتی ہے:

زلزلہ آیا اور آکر ہوگیا رخصت مگر
وقت کے رخ پر تباہی کی عبارت لکھ گیا
(فراز حامدی)

اک زلزلے کے شور میں سب لوگ دب گئے
ہو اب بیاں تباہی کی تفصیل کس طرح
(عمران راقم)

یہ عذابوں کا سلسلہ کیا ہے
باڑھ بیماری زلزلہ کیا ہے
(شان بھارتی)

حالیہ مہینوں میں نیپال میں تباہ کن زلزلہ آیا جس میں قیامت صغریٰ کا منظر دیکھنے کو ملا۔ بستیاں کی بستیاں تلپٹ ہوگئیں۔ اہل ثروت کی کئی منزلہ عمارتیں زمیں بوس ہوگئیں اور انھیں بھی دانے پانی کی محتاجی ہوگئی۔ اردو کے جدید غزل گو نے اس عبرت ناک نشانی کو اپنی فکر کا محور بنایا ہے اور وقت کے تقاضے کا ساتھ دیا ہے:

پڑھتے تھے کتابوں میں قیامت کا سماں
نیپال میں کچھ اس کا نمونہ دیکھا
(اصغر ویلوری)

زلزلہ نیپال میں آیا کہ ہندوستان میں
زلزلہ کے نام سے تھرا اٹھا سارا جہاں
(کمال جعفری)

تمام شہر عجب زلزلوں کی زد پہ تھا
تہہ زمین کوئی کروٹیں بدلتا رہا
(منیر سیفی)

زلزلہ زلزلہ + گویا کرب و بلا
(حیدر وارثی)

فکری انضباط سے بھرپور جدید غزل گو کے اشعار زلزلہ جیسے موضوع سے منسلک ابعاد کو اجاگر کرتے ہیں اور مخفی اور عیاں ابعاد تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ ساتھ ہی فطرت، فضا، حالات اور کرب زیست کی کائنات کی جہات کو سامنے لاتے ہیں۔

■

Prof. Manazir Ashique Harganvi.
'Kohsaar' Bhikanpur-3
Bhagalpur- 812001 (Bihar)

اردو شاعری میں خط کا ذکر

نذیر فتح پوری

خط مذکر ہے۔ اسے نوشتہ بھی کہتے ہیں۔ خط کا لفظ تحریر، لکیر اور نشان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کوئی خط اگر کسی فرد کے نام لکھا جائے تو اسے نامہ، پیام، مکتوب، رقعہ اور تحریر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندی میں اسے چٹھی، پتر اور پتیا بھی کہتے ہیں۔ شاعری کی زبان میں ایک خط، خط اشک بھی ہوتا ہے، یعنی وہ خط جو آنسوؤں سے لکھا جائے۔

ہم اپنی گفتگو کا آغاز خطِ اشک کے حوالے سے کرتے ہیں۔ ایک شعر:

یہ بھی تحریر کا ایک انداز ہے
آنسوؤں سے اسے خط لکھا کیجیے

(نذیر فتح پوری)

ایک شاعر نے اپنے دوست یا محبوبہ کو آنسوؤں سے خط لکھا تو اس کا ردِّ عمل کیف بھوپالی کی زبانی ملاحظہ کریں:

یہ کہہ کر لو ٹا دیا خط
خون سے کیوں تحریر نہیں

تحریر خون سے لکھی جائے یا آنسوؤں سے نقصان تو لکھنے والے ہی کا ہوتا ہے۔

اردو میں خط نگاری کی ابتدا غالب کی خطوط نویسی سے پہلے ہو چکی تھی، جس کا ثبوت ہمیں غلام شبیر رانا کی ایک تحریر سے ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں مکتوب نگاری کو بہ طور صنفِ ادب متعارف کرانے میں اوّلیت کا اعزاز مرزا رجب علی بیگ سرور کو ملتا ہے۔ تاریخ اردو ادب میں اگرچہ یہ خطوط اپنی قدامت اور اوّلیت کی بدولت قابلِ ذکر ضرور ہیں لیکن تخلیقی اعتبار سے یہ خطوط اسلوب کی چاشنی اور موضوعاتی تنوع کا کوئی قابلِ قدر پہلو سامنے نہ لا سکے۔''

دراصل مراسلے کو مکالمہ بنانے کا کام پہلی بار غالب نے کیا۔ غالب نے خود اس کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں نے وہ انداز ایجاد کیا کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزاروں کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ (اردوئے معلّیٰ)

غالب کا دعویٰ بے دلیل نہیں ہے۔ غالب کے خطوط اردو نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔ غالب کی انشا پردازی ان کے مکتوبات کی ہر سطر سے ظاہر ہوتی ہے۔

غالب کے یہاں چند اشعار میں بھی خط کا ذکر ملتا ہے۔ غالب کا ایک شعر تو بہت ہی مقبول ہے:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

یہاں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ جب چچا غالب رات دن تصور جاناں کیے بیٹھے رہے تو پھر انھیں خط لکھنے کے لیے وقت کہاں سے مل گیا۔ یہ سچ ہے کہ غالب ایک جہاں دیدہ شاعر تھے۔ اپنے ولی ہونے کا تو انھوں نے خود ہی اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت سے پہلے وقت کا ادراک انھیں ہو جایا کرتا تھا۔ جب وہ کہتے ہیں:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

دراصل مکتوب نگار ہی جانتا ہے کہ اس نے مکتوب میں کیا لکھا ہے۔ قاصد تو بیچارہ ایک ہرکارے کے طور پر خط لانے اور لے جانے کا ذمے دار ہوتا ہے۔ غالب پہلے ہی سے خط کا جواب لکھ کر تیار رکھنا چاہتے ہیں۔ جیسے ہی قاصد آجائے گا اسے دوسرا خط تھما دیا جائے گا اور اس طرح مراسلت کا یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جائے گا۔

اردو شاعری میں خط کا ذکر غالب کے بعد بھی بے شمار شاعروں نے کیا ہے۔ اس سلسلے میں بہت ہی شوخ، دلکش اور دلفریب قسم کی باتیں بہ لباسِ شعر مطالعہ میں آتی ہیں۔ مثلاً ایک شعر جس کے شاعر کا نام معلوم نہیں۔ قوالوں کے ذریعے اس شعر کا تعارف ہوا:

یہ خط نہیں صدائے دلِ دردمند ہے
اک بے وفا کا پیار لفافے میں بند ہے

اسی مزاج اور قبیل کا ایک اور عام فہم شعر ملاحظہ کریں۔ اس شعر کے خالق کا نام بھی معلوم نہیں:

لکھ کے خط ان کو جس دم بلایا، آ کے قاصد نے دکھڑا سنایا
ان کے پیروں میں مہندی لگی آنے جانے کے قابل نہیں ہیں

سوال آنے جانے کا نہیں، سوال خط کی اہمیت کا ہے۔ اس کی تحریر کا ہے۔ یعنی مہندی کے رنگ کے سامنے خط کی تحریر بے اثر ہو گئی۔ اس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تحریر لہو سے نہیں لکھی گئی تھی۔

ماہر غالب علامہ کالی داس گپتا رضا کی بیاض شعر میں چند خطوطی شعر ملتے ہیں۔ ایک مطلع ملاحظہ کریں۔ بہت ہی آسان زبان میں لیکن نئی سوچ، ان چھوا متن، خط لکھ کر ضمیر دھونے کا اپنا ہی احساس ہے:

اوراق لیے قلم ڈبویا
خط لکھ لکھ کر ضمیر دھویا

شاعر جب خط لکھ کر ضمیر دھو چکا تو اسے اپنے دل کا خیال آیا۔ تب وہ دل سے مخاطب ہوا۔ اور سوال کر بیٹھا:

میرا قلم سا جن کا پتا لکھتا ہے
بول اے دل تو خط میں کیا لکھتا ہے

کالی داس گپتا رضا ایک فعال ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے زندگی میں بے شمار خطوط لکھے۔ کبھی ذوق کے حوالے سے، کبھی غالب کے حوالے سے، کبھی چکبست اور فراق کے حوالے سے۔ جب بھی ان سے کوئی ادبی استفسار کیا گیا۔ انھوں نے فوری اس کا جواب دیا۔ لیکن انھیں بھی زمانے سے شکایت رہی۔ یہ شعر ملاحظہ کریں:

لفافوں پر پتے لکھنا وہ تیرا
وہ میرا نام اکثر چھوڑ جانا

انتہائی قربت کے باوجود رضا صاحب کی شاعری پر بظاہر غالب کا اثر نظر نہیں آتا۔ لیکن فکری طور پر کہیں نہ کہیں ان کی شاعری میں غالب کا عکس ضرور محسوس ہوتا ہے۔ ایک غزل کا مطلع ملاحظہ کریں:

لفافے ڈھونڈنا بے نام سا پتا لکھنا
تھکا تھکا سا لہو ہو تو گیت کیا لکھنا

لہو غالب کی طرح چاہے آنکھ سے نہ ٹپکے لیکن جب یہ قلم میں روشنی بن کر دوڑتا ہے تو خط کی صورت میں ایک خوبصورت گیت صفحہ قرطاس پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اس تعلق سے رضا صاحب کا ایک شعر اور ملاحظہ کیا جا سکتا :

تھک گیا ہوں میں پتا آپ کا لکھتے لکھتے
تازہ دم ہولوں تو کچھ اپنا پتا بھی لکھوں

رضا صاحب کے درج بالا شعر سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ آدمی چاہے جتنا دوسروں کے لیے صرف ہو جائے لیکن وہ اپنی ذات اور انا سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ہونے کا پل پل خود بھی احساس رکھتا ہے اور دوسروں کو بھی احساس دلانا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ اپنا نام اور پتا کبھی نہیں بھولتا۔

آیئے تھوڑا سا رنگ بدلتے ہیں۔ غزل کے بالاخانے سے اتر کر نظم کی گلیوں میں چلتے ہیں۔ دیکھیے شاعر رومان سلمیٰ اور ریحانہ کے عاشق زار اختر شیرانی کیا فرماتے ہیں۔ ان کی نظم کا عنوان ہے۔

ایک بیوی کی طرف سے اپنے شوہر کے نام پہلا خط:

لیلائے رازِ شوق کا محمل ہے ہاتھ میں
یعنی بجائے خامہ مرا دل ہے ہاتھ میں
احوالِ دل لکھوں، خلشِ مدعا لکھوں
رکتی ہوں لفظ لفظ پہ آخر میں کیا لکھوں
دل اپنی دھڑکنوں کو چھپایا جائے کس طرح
پہلے پہل کا خط ہے لکھا جائے کس طرح
لکھنے کو میں تو لکھتی ہوں تم کو ہزار خط
لکھ لکھ کے پھاڑ دیتی ہوں پر بار بار خط

یہ اختر شیرانی کی طویل نظم کا حصہ اوّل ہے۔ ایک معصوم تحریر، ایک الھڑ انداز۔ اور عدم اعتماد کی کیفیت ہر سطر سے مترشح ہے۔

اس مکتوبی نظم کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ فیض کی کلیات میں ایک نظم ملتی ہے۔ جس کا عنوان ہے ''آخری خط'' یہ منظوم خط فیض نے اپنی کسی محبوبہ کے نام لکھا ہے۔ لیکن مکتوب الیہ کا نام نہیں ہے۔ تاہم نظم کے مواد و متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض نے اپنی محبوبہ سے بچھڑنے کے بعد یہ آخری خط آخری پیغام کے طور پر لکھا ہے۔ چند ابتدائی سطور اس طرح ہیں:

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں
تھک جائیں گی ترسی ہوئی نا کام نگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو مری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی

نظم قدرے طویل ہے۔ جس میں شاعر نے اپنی زیست کی مجبوریاں بیان کر کے اپنے محبوب کو اطمینان دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ بے وفا نہیں۔ بس حالات کی ضرب نے اسے بکھرا کے رکھ دیا۔

اب آیئے منفرد لب و لہجے کے شاعر، ادیب اور فلمساز گلزار کے دربار میں چلتے ہیں۔ گلزار جیسے ہمہ جہت فنکار لاکھوں میں ایک ہوتے ہیں۔ شعر کا اسلوب بتا دیتا ہے کہ مجھے گلزار نے لکھا ہے، نظم بھی اعتراف کر لیتی ہے کہ میں گلزار کی تخلیق ہوں۔ گیت کے جب لب کھلتے ہیں تو ساعتیں فیصلہ سنا دیتی ہیں یہ گیت صرف گلزار کے طلسماتی قلم کی کاوش ہے۔ اور جب ماچس، قلم، کتاب اور خوشبو کے عنوان سے فلموں کے اشتہار پر نظر پڑتی ہے تو ہر پہلو سے گلزار کا نام ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ اور جب گلزار کی ترونی مطالعے میں آتی ہے تو ایک الگ ہی اسلوب کا پتہ دیتی ہے:

کچھ خوابوں کے خط ان میں، کچھ چاند کے آئینے، سورج کی شعاعیں ہیں،
شعروں کے لفافے ہیں۔ کچھ تجربے ہیں مرے، کچھ میری دعائیں ہیں
نکلو گے سفر میں جب۔ یہ ساتھ میں لے لینا۔ شاید کہیں کام آ جائیں

خوابوں کے خط اور شعروں کے لفافوں کی مثالیں گلزار کے سوا کون دے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں گلزار کی غزل کا ایک مطلع بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

وہ خط کے پرزے اڑا رہا تھا
ہواؤں کے رخ بتا رہا تھا

چلیے محبوب راہی کے دیار میں چلتے ہیں۔ اردو شعر و ادب کا معتبر، ممتاز اور منور نام۔ خط لکھنے میں حاتم طائی کا مزاج پایا ہے۔ آپ اپنے پچاس سالہ ادبی سفر میں مدیران کرام کے نام اور اپنے ہم عصر شاعروں اور ادیبوں کے نام بے شمار خط لکھ چکے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک کتاب ''مکتوبات محبوب راہی بنام نذیر فتح پوری'' شائع ہو چکی ہے۔ راہی صاحب اپنے قارئین سے وعدہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اک ذرا دل کو سنبھالوں تو اسے خط لکھوں
رستے زخموں کو چھپالوں تو اسے خط لکھوں
ہوش مندی میں تو اندیشۂ رسوائی ہے
خود کو دیوانہ بنالوں تو اسے خط لکھوں
اس کی یادوں کی مہک اس کے سخن کی خوشبو
ذہن میں اپنے بسالوں تو اسے خط لکھوں
بارہا جس نے مجھے زخم دیے ہیں اس سے
زخم کچھ اور بھی کھالوں تو اسے خط لکھوں
میں کہ برسوں سے مجھے ڈھونڈ رہا ہوں راہی
آپ اپنے کو جو پالوں تو اسے خط لکھوں

لیکن محبوب راہی کے دوست نذیر فتح پوری اس سلسلے میں کچھ دوسرا ہی رخ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

ترسیلِ مدعا کے وسائل ہیں اور بھی
خط قیمتی نہیں ہے کبوتر کی جان سے

اس شعر سے شاعر کی دردمندی کا احساس ہوتا ہے۔

نذیر کی ایک طویل بحر کی غزل کا یہ مقطع بھی ملاحظہ کریں، جس میں ایک الگ ہی محرومی کا احساس ملتا ہے:

نذیر اب محبت کے سوداگروں کو پیامی سلاموں کی حاجت نہیں ہے
کبوتر کی نامہ بری کی کہانی حویلی کی اونچی فصیلوں پہ لکھ دے

یہ سچ ہے۔ اب نہ خط ہے۔ نہ نامہ بر۔ نہ کبوتر ہے نہ مکتوب۔ سارے تہذیبی سلسلے اور رابطے بے موت مر چکے ہیں۔ اب نہ قاصد کا انتظار ہے نہ کسی خط کے جواب کے لیے کوئی آنکھیں بچھائے بیٹھا ہے۔ لیکن ایسے حالات میں بھی رؤف خیر ایک الگ ہی احساس جگائے بیٹھے ہیں:

ترے خطوط کے نہ آنے کا دکھ الگ ہے سو ہے
حجاب سا مجھے آتا ہے ڈاکیہ سے مرے

رؤف خیر شاعر، ادیب، ادبی ماحول کو گرم رکھنے کے گُر سے بخوبی واقف ہیں۔ جب محبوب کی جانب سے خط ہی نہیں لکھا گیا تو بیچارہ ڈاکیہ کیا کرے، کہاں سے خط لائے تاکہ ہجر کے مارے دل کو قرار ملے۔ اور خط پڑھ کر دل کی کلی کھل جائے۔

رؤف خیر غزل کے ایک اور شعر میں خوبصورت بدن کی جمالیات کس فن کارانہ چابکدستی سے پیش کرتے ہیں:

مخطوطہ بدن ہو کہ مکتوب دل، نظر
پڑتی ہے کس خلوص سے کس شد و مد کے ساتھ

رؤف خیر کا یہ انفرادی احساس ہے۔ کسی کے بدن کو مخطوطہ اور دل کو مکتوب لکھ کر انھوں نے استعارے کی نئی جمالیات سے بھرپور کائنات سجانے کی کوشش کی ہے۔ دیگر ایک شعر میں وہ اپنے محبوب کو مشورہ دیتے ہوئے یوں بھی کہتے ہیں:

صدا ہی سونپ کبھی کاسۂ سماعت کو
تجھے جو خیر سے آتا نہیں ہے خط لکھنا

غزل کے بعد پھر نظم کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ایک مختصر نظم، لیکن اس کی تپش ناقابلِ برداشت ہے:

خط اس نے لکھا مجھ کو
شبدوں کے تھے انگارے
جذبات کی حدّت تھی
احساس کی شدت تھی
تھی حرف کی چنگاری
تھی ایک چتا بھاری
اک آگ کا دریا تھا

کا غذ تھا کہ شعلہ تھا
خط اس نے لکھا مجھ کو

(نذیر فتح پوری)

اللہ کی پناہ۔ کیسا شعلے برساتا خط ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے افریقہ کے جنگل میں آگ لگی ہو۔ کسی دل جلے شاعر کو جب ایسے شعلہ بار خط ملیں گے تو وہ ان خطوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔

بہ زبانِ شعر وہ بس اتنا ہی کہے گا:

ترے خط آج میں گنگا میں بہا آیا ہوں
آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا آیا ہوں

خطوط نگاری کے ذکر کا سلسلہ صرف غزل اور نظم تک ہی محدود نہیں بلکہ گیت اور دوہوں میں بھی اس تحریری، تہذیبی سلسلے پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ندا فاضلی کہتے ہیں:

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دل نے دل سے بات کی بن چٹھی بن تار

ماں کی ممتا نہ لفظ کی محتاج ہے، نہ خط کی مرہونِ منت، بیٹا کہیں بھی ہو جب کسی مصیبت کا شکار ہوتا ہے تو قدرتی طور پر ماں کو اس کا احساس ہو جاتا ہے اور بے ساختہ اس کے ہاتھ اولاد کی خیر خواہی کے لیے دعا کرنے لگتے ہیں۔ ندا فاضلی نے نامہ بر، قاصد اور ہرکارے جیسی علامتوں کو نظر انداز کر کے براہِ راست ڈاکیے کو اپنی فکر کا محور بنایا ہے ایک دوہا:

سیدھا سا وہ ڈاکیہ جادو کرے مہان
ایک ہی تھیلے میں بھرے آنسو اور مسکان

اب آیئے کچھ دوہے نذیر فتح پوری کے بھی ملاحظہ کرلیں:

اس نے لکھا پتر پر دل کا سارا حال
بجنی تجھکو چھوڑ کر ہو گیا میں کنگال
چٹھی آئی شہر سے گوری پڑھ شرمائے
اک اک شبد پہ ہاتھ سے منوا نکلا جائے
انگلی پکڑی حرف کی، شبد قلم میں تھام
ہم نے دل کے پتر پر لکھا تیرا نام

اردو میں بہت سے ایسے گیت موجود ہیں جو خط کو مرکزِ فکر بنا کر لکھے گئے ہیں ایک گیت کا صرف ایک بند پیش کرنا چاہتا ہوں، حالانکہ گیتوں کے حوالے سے خطوط نگاری کا جائزہ لیا جائے تو اس کے اظہار کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ گیت کا عنوان ہے:

خط ہے کس کے نام

خط ہے کس کے نام بتا دے
خط ہے کس کے نام
خط کو لانے والے پڑھ دے تو ہی یہ پیغام
خط ہے کس کے نام
کالا اکشر بھینس برابر میں تو پڑھ نہیں پاؤں
لیکن شبدوں کی خوشبو سے اک اک بات سمجھ جاؤں
تبھی تو کہتی ہوں پریتم کا
خط ہے میرے نام

شاذ تمکنت غزل کے نمائندہ شاعر تھے۔ ان کے کلیات میں ایک شعر دستیاب ہوا ہے۔ جو ہمارے موضوع کے لیے موزوں ہے۔ مثلاً:

شاذ اب اس کی خموشی کو دعا دیتا ہے
جس نے بھیجے تھے مجھے نامہ و پیغام کئی

یعنی محبوب کے بار بار نامہ و پیغام بھیجنے کے باوجود جب شاعر نے کوئی جواب نہ دیا تو نامہ و پیغام بھیجنے والا بھی تھک تھکا کر خاموش ہو گیا۔ اس موقع پر جواب در جواب کے عمل کے لیے کسی شاعر نے کیا خوب شعر کہا ہے:

غزل کے بدلے غزل لکھ کے بھیج دی ہوتی
مراسلات کا کوئی تو سلسلہ ہوتا

گویا غزل بھی کبھی کبھی خط کا کام کر جاتی ہے خط کسی کا بھی ہو۔ جواب چاہتا ہے۔ جس عقیدت سے خط لکھا جاتا ہے اسی عقیدت اور محبت سے اس کا جواب بھی لکھا جانا چاہیے۔ تب خط کا حق ادا ہوتا ہے۔ یہ عمل ایک طرح سے اخلاقی فرض میں شمار ہوتا ہے۔

راشد طراز نئے زمانے کے نئے شاعر ہیں۔ ان کی سوچ نرالی ہے۔ انھوں نے ہوا کو قاصد بنایا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ کریں:

پیام لاتی ہے اوجِ فراق کا مجھ تک
ہوا جو مل کے مرے مہرباں سے آتی ہے

اردو شاعروں نے نامہ بر، قاصد اور ہرکارے کے علاوہ، ہوا، خوشبو اور روشنی سے بھی پیغام رسانی کا کام لیا ہے۔ کبھی روشنی کے توسط سے محبوب کی آمد کی خبر ملتی ہے۔ کبھی ہوا کا نرم جھونکا محبوب کے آنے کی خبر دیتا ہے اور کبھی خوشبو کا لہرا یہ مژدۂ جانفزا سناتا ہے کہ ہوشیار، خبردار۔ اپنے آپ کو سنبھالیے اور اپنے ہوش و حواس پر پردہ ڈالیے۔ کہیں محبوب کی آمد کی خبر سن کر آپ کے صبر کا پیمانہ چھلک نہ جائے۔

ایک شعر میں یاسیت کے علمبردار فانی بدایونی کے تیور ملاحظہ کریں۔ جو اپنے متن اور معانی کے اعتبار سے یگانۂ روزگار ہے۔

مضمون تو مکتوبِ ازل کا نہیں معلوم
لکھا ہے مرے خون سے عنوانِ تمنا

شاعر کہتا ہے۔ تقدیر میں روزِ اوّل سے کیا لکھا ہے۔ اس مضمون کا متن مجھے نہیں معلوم۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمنا کا عنوان میرے خون سے لکھا ہوا ہے۔ یہ وہی تمنا ہے جس کے لیے غالب نے سوال کیا تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب آزاد غزل کے امام۔ مظہر امام کی آزاد غزل میں بھی خط کا ذکر موجود ہے۔ جب وہ کہتے ہیں:

صبح کا تڑکا ہوتے ہوتے اڑ جاتے تھے لفظوں کے سب رنگ
جاگ کے تجھ کو خط لکھتے تھے ساری ساری رات

لیکن دوسری طرف مظہر امام شک و شبہات کے گھیرے میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ شک بھی دوستوں کی جانب سے ہے۔

نہ جانے دوستوں کے خط کا کیوں ہے انتظار اتنا
مجھے معلوم ہے ان میں بُری خبریں بھی ہوتی ہیں

رفیق جعفر کی خوش گمانی ملاحظہ کریں:

بہت دن سے میرا کوئی خط نہ پا کر
تمہی مجھکو لکھ دو کہ کیسا لگا تھا

معلوم نہیں۔ موسم سوچ نگر کے اس مسافر کو اپنے سوال کا جواب ملا یا نہیں۔

"اردو شاعری میں خط کا ذکر" اس موضوع کا چند صفحات میں احاطہ ممکن نہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اختصار سے کام لیا جائے۔ تاہم اختتام پر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اب دنیا میں خط کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ زمانہ خطوط نگاری سے گریز کا ہے۔ آج ہر طرف موبائل، انٹرنیٹ، واٹس اپ اور فیس بک کے جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ چند بٹنوں کا سارا طلسماتی کھیل ہے۔ بات ہائے ہیلو سے شروع ہوتی ہے اور چند منٹوں میں سارا ماجرا بیان کر دیا جاتا ہے لیکن وہ سب کچھ ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ نہ حرف کی کوئی گواہی، نہ لفظ کی کوئی شہادت، نہ تحریر کا کوئی ثبوت۔ اس لیے سارے خون معاف۔ اور سارے مقدمے خارج۔ آج مراسلے اور مکالمے میں کوئی حدِ فاصل نہیں۔ کوئی آداب نہیں۔ کوئی القاب نہیں۔ کوئی سلام نہیں۔ آج کی نسل کو معلوم نہیں کہ خیر اندیش کیا ہوتا ہے۔ احقر کسے کہتے ہیں۔ طالب دعا اور محتاج کرم کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ میر حسن نے برسوں پہلے ایک شعر میں آنے والے زمانوں کی نشان دہی کر دی تھی:

لکھنے کی یاں نہ تاب، نہ پڑھنے کا واں دماغ
کہہ دیں گے کچھ زبانی اگر نامہ بر چلا

جدید ذرائع ابلاغ نے پرانی تہذیب کو نگل لیا ہے اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

■

Nazir Fatehpuri Post Box No.13, Yerwada
Pune - 411006
Mob.:9822516338
Email.:nazir_fatehpuri2000@yahoo.com

احترام اسلام

ہندی زبان وادب میں
صنفِ غزل کا مقام

اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ غزل ایک زمانے سے ساری لسانی اور علاقائی حدیں توڑ کر ہندوستان کے گوشے گوشے میں انتہائی مقبول رہی ہے لیکن آزادی کے بعد کے مکمل ایک دہے تک اس بات کا تصور تک مضحکہ خیز ٹھہرایا جاتا تھا کہ اردو کے علاوہ دیگر کسی بھی ہندوستانی زبان کے شعری منطقے میں اسے کبھی ایک صنف کے بطور داخلہ مل سکتا ہے۔ ہندی ادب میں تو بطور خاص گویا اس کا داخلہ پوری طرح مشروط بلکہ ممنوع تھا۔ ہندی قارئین اور سامعین کے حلقے میں اردو کے شاعروں کی غزلوں کو خواہ کتنا بھی زیادہ چٹخارہ لے لے کر پڑھا اور سنا جاتا رہا ہو لیکن ہندی کی خدمت میں فعال طریقے سے حصہ لینے کا دعویٰ کرنے والوں میں اسے ایک شعری صنف بنائے جانے کے تئیں جھکاؤ کے بجائے انحراف ہی نظر آتا تھا۔ ہندی کے اُس عہد کے آزمودہ کار اور ذمے دار ادیبوں اور شاعروں کے درمیان یہ خیال عام تھا کہ غزل کی تخلیق ہندی ادب میں مروجہ ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ غزل کہہ پانے کی اپنی بے صلاحیتی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس طرح کے خیال کو دیدہ و دانستہ شہرت دی جاتی رہی ہو۔ حقیقت جو بھی رہی ہو لیکن مذکورہ خیال ہندی میں غزل گوئی کی فضا تیار ہونے میں مانع رہا۔ نتیجتاً ہندی کے وہ شعرا جو غزل کے تئیں اپنے دل میں پروردہ لگاؤ سے خود کو آزاد نہیں کروا سکے۔ انھوں نے تخلیقِ غزل تو کی لیکن اپنی غزلوں میں وہ ہندی شاعری کا کوئی وصف، کوئی خاصیت کوئی علامت ابھارنے کی جسارت نہیں دکھا سکے۔ ان لوگوں نے اسی ذخیرۂ الفاظ اسی محاورے اسی اسلوب اور اسی لہجے کا سہارا لے کر غزلیں کہیں جو روایتی طور پر اردو غزلوں کی پہچان تھی۔ ہندی شاعری کے مزاج سے کسی طرح کا میل نہ بٹھا سکنے کے سبب وہ غزلیں اپنا تذکرہ تک کروانے میں ناکام ٹھہریں، ان کا ادبی محاسبہ تو بہت دور کی بات تھی۔

خوش آئند حقیقت یہ ہے کہ آج حالات یکسر بدلے ہوئے ہیں۔ شاعری آج تمام طرح کی تنگ نظریوں سے مقابلہ کرنے کی حیثیت میں آچکی ہے اور یہی سبب ہے کہ آج ملک کی تقریباً ساری کی ساری ترقی یافتہ زبانوں کے شعرا غزل کو اپنی زبان میں ایک طاقتور صنف کی پروقار حیثیت دلوانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ ہندی میں بھی پابند عروض شاعری کے حق میں موافق فضا کی غیر موجودگی کے باوجود غزل کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور وہ پہلے سے جمی جمائی دیگر اصنافِ شعری کے ساتھ سر اٹھا کر چلتی نظر آتی ہے۔ غزل کو یہ اعزاز اور وقار یوں ہی نہیں بخشا جا رہا ہے۔ دو مصرعوں میں گہری سے گہری اور بڑی سے بڑی بات کو چٹیلے ڈھنگ سے پیش کر کے دل میں اتار دینے کی جو صلاحیت غزل کے پاس ہے، وہ دوسری کسی بھی صنف کے مقدر میں نہیں ہے۔ غزل نے معاصر موضوعات سے خود کو جوڑ کر گہرے سے گہرے احساسات کو جس خوبصورتی اور تیکھے پن کے ساتھ ظاہر کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے وہ اس کی زبردست قوت ترسیل کا ثبوت ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ آج بھی اس بات کو منوانے پر اپنی طاقت کا تصرف کرنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے کہ غزل کو اس لیے دور سے سلام کر لینا چاہیے کہ اپنی تمام تر تیزی اور طراری، چبھن اور دھارداری کے باوجود غزل کی معرفت آج کی زندگی کی پیچیدگیوں کو اظہار کا راستہ دے پانا ممکن نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی خدمت میں ایک جملے کا یہ جواب کافی ہے کہ جس کے لیے غزل بطور ذریعۂ اظہار موافق نہ نظر آئے، وہ نہ جائے غزل کے قریب لیکن وہ تمام لوگ جو ایسا نہیں سوچتے، بلکہ اس کے برعکس غزل ان کے لیے کشش رکھتی ہے، انھیں غزل سے دور رہنے کی رائے کیوں دی جائے؟ بات بڑی واضح ہے کہ جسے ناچنا آتا ہے، آنگن کے ٹیڑھا ہونے کی شکایت کرنے کی ضرورت اسے کبھی نہیں پیش آتی۔ میرا

ذاتی تجربہ ہے کہ میں نے جو بات بھی غزل کے ذریعے کہنی چاہی، غزل ایک فارم کے روپ میں کبھی اس کے آڑے نہیں آئی۔ اس کے برخلاف شعر میں ڈھل کر میری بات اور بھی زوردار، اور بھی چٹیلی ہوکر سامنے آئی۔ یہ سچ ہے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ میں کسی بات کو غزل کے پیرائے میں ڈھالنا چاہوں اور اپنے مقصد میں ناکام ٹھہروں لیکن یہ میری اپنی کمزوری کا نتیجہ ہوگا۔ غزل کی اس میں کیا خطا ہوسکتی ہے، آسمان کو چھو نہیں پاتا آدمی تو یہ آدمی کی اپنی کمی ہے نہ کہ آسمان کی بلندی کا عیب۔

یہاں میں اس بات کا ذکر خاص طور سے اور پوری طاقت سے کرنا چاہوں گا کہ شاعری کی دوسری صنفیں جہاں اب تک کی تسلیم شدہ روایتی پابندیوں کو اظہار کی راہ کا روڑہ بتا کر انھیں ٹھکرا دینے میں اپنی طاقت کا استعمال بے جا کرتی رہی ہیں، وہیں غزل ایک نازک مزاج صنف کے روپ میں جانی اور مانی جانے کے باوجود ایسی تمام پابندیوں اور دشواریوں کو اپنی طاقت مان کر انھیں گلے کا ہار بنائے رکھنے پر زور دیتی رہی ہے اور آگے بھی وہ اپنے اسی یقین پر قائم و دائم رہنے کے لیے کمربستہ ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ غزل ایسی کسی بھی پابندی کی مخالفت کو خود پر حملہ تصور کرتی ہے۔ عالمی ادب پر نظر ڈالیے تو یہ امر واضح طور پر سامنے آئے گا کہ کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر دنیا کی لگ بھگ تمام ہی زبانوں کی شاعری گذشتہ دہوں کی ایک طویل اکھاڑ پچھاڑ کے بعد آج بحر و وزن اور متن دونوں ہی اعتبار سے اکثر ہر طرح کی پابندی سے آزاد ہوچکی ہے۔ اردو ان گنی چنی زبانوں میں ہے جن کی شاعری نے عالمی سطح پر واقع ہونے والی اس تبدیلی کا بہت کم اثر قبول کیا۔ خاص طور پر غزل نے جسے اردو شاعری کی آبرو کہا جاتا ہے اس 'کامل انقلاب' کی دستک پر کچھ ایسا ہی ردعمل ظاہر کیا گویا پھولوں کی سیج پر سوئی ہوئی کوئی پری رو دوشیزہ آہٹ محسوس کر کے ایک لمحہ کے لیے کسمسائی ہو اور پھر کروٹ بدل کر محوِ خواب ہوگئی ہو۔ اس کا ایک ظاہری فائدہ یہ ہوا کہ جہاں ایک جانب دوسری زبانوں میں ممنوعات اور پابندیوں سے گلوخلاصی کی آڑ میں بے سروپا لگنے والی نام نہاد تخلیقات بھی شاعری کا درجہ پانے کا دعویٰ پیش کرتی نظر آنے لگیں، وہیں دوسری طرف غزل اپنی مکمل روایت کے احترام کے اصرار پر حسبِ سابق ڈٹی رہ کر اپنی خوبیات کو محفوظ رکھ سکی۔ اردو کی سگی بہن کہلانے والی ہماری ہندی نے خود بھی جھوٹی ترقی پسندی کا لبادہ اوڑھ کر شاعری کو تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تو انجام کار وہ یہ دن بھی دیکھ رہی ہے کہ اس کے یہاں قواعد اور عروض کے بڑے سے بڑے عیب کو یہ کہہ کر بہ آسانی ٹال دیا جاتا ہے کہ شاعری میں سب چلتا ہے۔ زیادہ دلیر لوگ تو 'ہندی میں سب چلتا ہے' کہنے کی بے شرمی دکھانے سے بھی گریز نہیں کرتے جبکہ غزل آج بھی اپنی ہلکی سی لغزش پر شرم سار ہوا ٹھتی ہے۔ وہ 'سب چلتا ہے' کا ناپسندیدہ فقرہ نہیں ادا کرتی۔ غزل کے نئے سے نئے خدمت گزار کو بھی اس بات کی ہرگز اجازت نہیں ہے کہ وہ لاعلمی یا چوک کے نام پر کسی طرح کی غلطی یا عیب کی اَن دیکھی کرے۔ قارئین اور سامعین کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی غزل کی قوت، اُن کے دل و دماغ کو متحرک کرنے کی اس کی طاقت اور نشتر چبھو چبھو کر بھی ایک فرحت بخش تجربے سے دوچار کروانے کی اس کی صفت کا راز بھی غالباً یہی ہے کہ وہ بحر و وزن، صنعتِ شعری، قواعد و محاورے، قافیہ و ردیف، زبان و بیان اور اسی قبیل کی دیگر چھوٹی بڑی پابندیوں کو بھرپور عقیدت کے ساتھ عزت دینا جانتی ہے۔ اظہار میں جو دھار اور دھیما پن غزل کی خصوصیت مانا جاتا ہے، غالباً اس پر تحقیقی انداز سے غور کرنے کے بعد ایک بزرگ مفکر اور ادیب و شاعر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاعری کو دو جداگانہ زمروں میں رکھا جانا چاہیے۔ 'پڑھی جانے والی شاعری' اور 'سنی جانے والی شاعری' لیکن غزل تو اس فیصلے کے بعد بھی اپنے انوکھے چہرے کے ساتھ الگ ہی نظر آئے گی کیونکہ وہ تب بھی من موہتی ہے جب سنی جاتی ہے اور اُس وقت بھی دل میں بیٹھ جاتی ہے جب مطبوعہ شکل میں اسے پڑھا جاتا ہے۔

دراصل 'سپاٹ بیانی' کو شاعری کا درجہ دلوانے کے حمایتی ناقدین ادب کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ ہے ہی نہیں کہ وہ 'پڑھی جانے والی' شاعری کی ایک نئی قسم ڈھونڈ نکالیں۔ اس حوالے کو ٹھوس زمین دلوانے کے مقصد سے ایک نامور شاعر ناقد نے 'سپاٹ بیانی' کو شاعری کا نام دیے جانے کی وکالت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اچھی شاعری پہلے لازمی طور پر ایک اچھا بیان ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس بات سے انکار، حقیقت سے منہ موڑنے کے مترادف ہے لیکن کیا ہر اچھا بیان لازمی طور سے اچھی شاعری ہوسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب لازمی طور پر نفی ہی میں ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کہ ہر طوطا یا کبوتر لازمی طور سے پرندہ تو ہے لیکن ہر پرندہ لازمی طور پر طوطا یا کبوتر ہرگز نہیں ہے۔

بیان کب اور کیسے شاعری بن جاتا ہے یا بیان اور شاعری کے درمیان حدِ فاصل کیسے قائم کی جائے، ان سوالات کا جواب تلاش کیے بغیر کسی شاعر کی شاعرانہ صلاحیت کا محاسبہ مبنی برانصاف نہیں ہوسکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنے نظریے اور اپنی جانب داری کے مطابق ہم شاعری کو اپنی پسند کے زمرے میں بھلے ہی رکھ دیں، بیان اور شاعری کا ایک فرق تو واضح طور پر پہچان میں آجاتا ہے، وہ یہ کہ بیان کسی بھی قاری یا سامع کے لیے ہر حالت میں ایک اور صرف ایک ہی اطلاع بہم پہنچاتا ہے۔ یعنی بیان کا ایک اور صرف ایک ہی مفہوم ہوتا ہے جو ہر قاری یا سامع کے لیے یکساں ہوتا ہے جبکہ شاعری اوپری سطح پر بھلے ہی ایک اطلاع کی حامل نظر آتی ہو لیکن جب کوئی اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے اس میں مفہوم کی متعدد پرتیں موجود نظر آتی ہیں اور ہر پرت کے نیچے مفہوم کی ایک نئی دنیا آباد نظر آتی ہے۔ کسی نے دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں کہا ہے کہ شاعری میں الفاظ کے وسیلے سے جو کچھ کہا گیا دکھائی دیتا ہے، دراصل وہ شاعری نہیں ہے بلکہ ان الفاظ کے عقب سے نکل کر جو کچھ ان کہا ہم تک پہنچتا ہے وہی اصل شاعری ہے۔ فیض احمد فیض کا یہ شعر بھی شاید یہی کہنا چاہتا ہے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

ناگوار گزرنے والی بات کو اس کا ذکر کیے بغیر سامعین اور قارئین تک پہنچا دینے کے فن کا نام ہی شاعری ہے اور غزل یہ کام دوسرے اصنافِ ادب کے مقابل میں انتہائی پر زور انداز میں موثر طریقے سے انجام دیتی ہے۔ ایک بات اور، وہ یہ کہ شاعری میں سامنے کی اطلاع دینے والے الفاظ کے پیچھے کا جہانِ معنی کبھی قاری یا سامع تک ازخود برجستگی کے ساتھ پہنچ جاتا ہے اور کبھی اس کا انکشاف تھوڑی سی کوشش کا مطالبہ بھی کرتا ہے اور یہی فرق شاعری کو عمیق و ادق اور آسان کے درجوں میں تقسیم کرواتا ہے۔ لیکن آسان شاعری نہ تو بیان کہی جاسکتی ہے اور نہ ہی کوئی بیان آسان شاعری۔

یہ بات حقیقتاً خوش کن بھی ہے اور حیرت میں ڈالنے والی بھی کہ ہندی کے شعری ایوان میں جس صنفِ سخن کا داخلہ یکسر ممنوع تھا، آج اسے وہاں دوسری تمام اصنافِ سخن کی ہمسری حاصل ہوچکی ہے، وہ بھی محض چالیس برس کی قلیل مدت میں۔

■

Ehteram Islam
635/547, Attersuiya, Allahabad - 211003
Mob.:9839814279
Email.: ehteramislam@gmail.cim

ماجد دیوبندی

مولانا آزاد کے افکار و نظریات

مولانا ابوالکلام آزاد صحیح معنوں میں ایک سیکولر سیاست داں اور حب الوطنی اور قوم پرستی کے بڑے علمبردار تھے۔ وہ کردار اور گفتار دونوں کے غازی تھے۔ وہ عظیم مفکر، بے مثال عالم اور شعلہ بیاں مقرر تھے اور انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ملک کی سیاست میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ 1920 میں جیل سے رہائی کے بعد گاندھی جی سے ان کی ملاقات ہوئی جو بہت گہری قربت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ اس زمانے میں ملک میں سات کروڑ مسلمان اور 22 کروڑ ہندو تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ دونوں فرقے آپس میں مل جل کر رہیں اور آزادی کی جدوجہد میں شانہ بشانہ شریک رہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنی معرکتہ الآرا تقریر میں کہا تھا کہ:

''اگر آج ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کردے کہ آزادی 24 گھنٹے کے اندر مل سکتی ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں آزادی اور سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس اتحاد سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن ہمارا میل و محبت اور آپسی اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔''

مولانا آزاد متحدہ ہندوستان اور قومی یکجہتی کے نہ صرف دعویدار تھے بلکہ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس ملک کی سالمیت اور یک جہتی کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ وہ ہر حال میں ہندوستان کو جیتے تھے اور اس مادر وطن پر مر مٹنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس ملک کی مٹی ولیوں اور رشیوں کی مٹی ہے کہ جس کے ہر ہر ذرے میں محبت، اتحاد اور انسانی میل ملاپ کارفرما ہے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر اپنی پوری علمی بصیرت اور سیاسی قوت جھونک دی۔

مولانا آزاد کی صحافت، سیاست، بصیرت پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔

مولانا کی مادری زبان عربی، پدری زبان اُردو تھی جبکہ ان کی فارسی کی تربیت گھر میں ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ ان سب کے باوجود وہ اردو سے عشق کرتے تھے اور اس زبان کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ وزیر تعلیم رہتے ہوئے وہ اپنی زیادہ تر تقاریر اردو میں ہی کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اردو ہی ایسی زبان ہے جو کہ ہر شخص کو متاثر کرنے کا ہنر رکھتی ہے۔ انھیں یہ احساس تھا کہ اگر یہ زبان مر جائے گی تو اقلیت کا بھی نقصان ہوگا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں جتنے بھی اُردو کے ادارے اور مسلم کالجز ہیں وہ مولانا آزاد کے دم سے قائم ہیں۔ اگر مولانا نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے اُردو اداروں اور جامعات کی کفالت نہ کی ہوتی تو آج ان کا وجود بھی باقی نہ رہتا۔ انجمن ترقی اُردو ہند سے لے کر جامعہ ملیہ اسلامیہ تک انھوں نے اُردو اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے اپنی پوری قوت صرف کردی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کو بچانے کے لیے مولانا نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو دہلی سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیجا۔ ان کے بہت سے کارنامے یاد کیے جاتے ہیں لیکن سب سے بڑا کارنامہ یو۔جی۔سی اور آئی۔سی۔سی۔آر کا قیام ہے جس سے دنیا بھر میں ہندوستان کے دانشور اور فنکاروں کو اپنے ملک ہندستان کی نمائندگی کرنے کا موقع ملا۔ آج یہ دونوں ادارے بہت اہمیت کے حامل ہیں جس کا سہرا مولانا آزاد کو جاتا ہے۔

مولانا نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ادب، ثقافت اور فنون لطیفہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں آج ان کی جیتی جاگتی مثال ساہتیہ اکیڈمی اور للت کلا اکیڈمی کے نام پر قائم ادارے ہیں۔ مولانا نے الہلال اور البلاغ کے حوالے سے جو ادبی اور سیاسی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اس کی کوئی نظیر ملنی مشکل ہے۔ مولانا نے جن موضوعات کا انتخاب کیا ان میں سائنس، فلسفہ، ادب، عالم اسلام اور جغرافیہ تک شامل تھے۔ آج اُردو میں ایسے بہت کم لوگ ملیں گے جو ان تمام موضوعات کی معلومات ایک ساتھ رکھتے ہوں، مولانا تحریر و تقریر کے ماہر تھے۔ خطبات آزاد اور ترجمان القرآن اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ انھوں نے اسلام اور نیشنلزم کے عنوان سے الہلال میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جس میں یہ ثابت کیا کہ اسلام اور نیشنلزم کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ان کے لیے ملک کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود فکر اسلامیہ کا حصہ ہے۔ مولانا کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی تمام قومیں متحد رہیں اور انگریزوں کے جانے کے بعد سب مل جل کر حکومت کا انتظام سنبھالیں۔ لیکن انگریزوں نے ایسی چال چلی کہ ملک تقسیم ہوگیا۔ لاکھوں افراد تباہ برباد ہوگئے اور جان و مال اور عزت و آبرو کی ایسی بربادی ہوئی جس کا تصور بھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ زبان، تہذیب اور نسل وخون کے جھگڑے اس شدت سے اُٹھے کہ کبھی ہندوستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔ بنگالی بہاریوں کے دشمن ہوگئے، سندھی یوپی والوں سے بدظن ہونے لگے۔ تقسیم نے پھر تقسیم در تقسیم کی شکل اختیار کی۔ آج مولانا یاد آتے ہیں۔ اگر ان کا مشورہ مان لیا گیا ہوتا اور ان کا متحدہ ہندوستان کا پلان تسلیم کرلیا جاتا تو برصغیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ مولانا آزاد کی دور بینی اور سیاسی بصیرت کا اعتراف لازمی ہے کیونکہ ان کی پیش گوئیاں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی ہیں۔ کاش ان کی سوچ اور قومی درد کو محسوس کرلیا جاتا تو آج ہندوستان کے مسلمانوں کا کچھ اور ہی وقار ہوتا۔

> ہندوستانی سیاست میں مولانا آزاد کی وہی حیثیت ہے جو ایک انسانی جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ جسم کا ایک حصہ بھی اگر معزور ہو جائے تو سارا جسم بیکار ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ہمہ جہت شخصیت کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اپنی قوم کے اس محسن کو فراموش نہ کریں اور ان کے حوالے سے قومی اور علمی خدمات عوام کے سامنے لائیں جس سے ان کا ہر پہلو اجاگر ہو سکے۔

عبدالرزاق ملیح آبادی جو مولانا آزاد کے بے انتہا قریبی دوست اور ساتھی تھے نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مولانا کے اپنے گھر کا باورچی جو اپنے عمل سے بہت اچھا نہیں تھا اور مولانا کو کئی کئی روز کا رکھا ہوا کھانا کھلا یا دیا کرتا تھا اور جس کا علم مولانا کو تھا لیکن وہ اس قدر وضع دار انسان تھے کہ کبھی شکایت نہیں کی اور عبدالرزاق ملیح آبادی کے کہنے پر بھی کبھی شکوہ نہیں کیا۔ کہتے تھے کہ عمر کی اس منزل میں ہے وہ باورچی کہ شکوہ کرنا اچھا نہیں لگتا۔ اخلاق کی بلندی کا عالم یہ تھا کہ ہر ملنے والے سے دیر تک اس کی بات سنتے اور کوشش کرتے کہ اس کی شکایت دور کی جائے اور اس کا وہ کام کیا جائے جس کے لیے وہ ان کے پاس آیا ہے۔ مولانا آزاد پر ہندستان باہم تحقیقی کام مرحوم ملک زادہ منظور احمد نے کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ ملک زادہ صاحب مولانا پر authority سمجھے جاتے تھے اور انھوں نے اپنی کتاب میں مولانا کے کارناموں اور ان کی شخصیت کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے مولانا آزاد پر آج یونیورسٹیوں میں زیادہ کام ہو اور طلبا اُن پر زیادہ سے زیادہ تحقیق کریں۔

مولانا آزاد نے دہلی کی جامع مسجد سے جو تاریخی خطبہ دیا تھا وہ آج بھی بدن میں سنسنی پیدا کردیتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا ''میرے عزیزو! یہ دیکھو، مسجد کے بلند مینار تم سے اچک اچک کر سوال کررہے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کردیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔ آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی خود تم اک زلزلہ تھے، آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمھارا وجود ایک اُجالا تھا۔ یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لیے ہیں، وہ تمھارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اُتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیئے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو اس کا رُخ پھیر دیا۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہوگئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔''

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی سیاست میں مولانا آزاد کی وہی حیثیت ہے جو ایک انسانی جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ جسم کا ایک حصہ بھی اگر معزور ہو جائے تو سارا جسم بیکار ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ہمہ جہت شخصیت کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اپنی قوم کے اس محسن کو فراموش نہ کریں اور ان کے حوالے سے قومی اور علمی خدمات عوام کے سامنے لائیں جس سے ان کا ہر پہلو اجاگر ہو سکے۔ یاد رکھیے جو قومیں اپنے بڑوں اور محسنوں کو بھول جاتی ہیں ان کے بعد کے آنے والی نسلیں بھی ان کو یاد نہیں رکھتیں۔

■

Dr. Majid Deobandi Vice Chairman,
Delhi Urdu Academy, Church Rd, Kashmiri Gate
Delhi 110006

شاہنامے کا بین الاقوامی علمی سفر

محمد ذاکر حسین

شاہنامہ دنیا کی ان چند مایہ ناز اور رجحان ساز کتابوں میں شامل ہے، جس کا ادبی دبدبہ زمانہ تصنیف سے اب تک قائم ہے۔ 651ق م سے 708 تک کے اس ڈیڑھ ہزار برس کے تاریخی حالات و واقعات کو قلمبند کرنے کی متعدد کوششیں فارسی نثر و نظم میں ہوئی ہیں، جنھیں شاہنامہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش نثر نگاروں کی طرف سے ہوئی اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں ابوالمؤید بلخی[1] نے نثر میں پہلا شاہنامہ مرتب کیا۔[2] نثری شاہنامے کے بعد اسدی طوسی (م 465ھ/ 1072) نے منظوم شاہنامے کی بنیاد رکھی۔ دقیقی نے شاہنامے کی اس روایت کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔ لیکن فارسی ادبیات شاہنامہ کے باب میں اب بھی تشنگی کا شکار تھی۔ اسے ایک ایسے عبقری اور جادو بیان دانشور کی تلاش تھی، جو اس پیاسی زمین کو اعلیٰ سطح پر سیراب کر سکے۔ ایران میں عربوں کے اثر و رسوخ کے بعد رفتہ رفتہ عربی زبان ایران کے طول و عرض میں رائج ہوگئی تھی اور ایران کی اپنی زبان فارسی قصہ ماضی بن کر رہ گئی تھی۔ ایسے میں ایک جادو بیان دانشور کا پایا جانا اپنے آپ میں ایک سوالیہ نشان کھڑا کر رہا تھا۔

فردوسی (933-1020) ایک محبّ وطن شاعر تھا اور فارسی کی اس ابتر حالت سے دکھی بھی تھا۔ اس نے فارسی زبان کو پھر سے زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس عربی ماحول میں فارسی کی فصل اگانا کتنا مشکل کام تھا، یہ جگ ظاہر ہے۔ تاہم فردوسی نے یہ کام کر دکھایا۔

فردوسی غزنی دربار سے منسلک تھا۔ اس دربار میں کم و بیش چار سو شعرا موجود تھے۔ لیکن شاہنامے کی بدولت جو شہرت و عظمت فردوسی کو ملی وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ علم شعر، تاریخ اور اخلاق کے اعتبار سے فردوسی عہد غزنویہ کی تمام ادبیات کا محور نظر آتا ہے۔ شاہنامہ ایک ایسا نگار خانہ ہے جس میں قدیم ایرانی تمدن وثقافت اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ فردوسی نے خالص وطنی نقطہ نظر سے ملکی تاریخ کو شاہنامے کی صورت میں مرتب کیا اور اس طرح ایران کی زبان اور قومی تاریخ دونوں کو ایک نئی توانائی بخشی۔ ایران کی تاریخ اور داستان کو زندہ کرنے والا اور فارسی زبان میں ایک نئی جان ڈالنے والا فردوسی ایران کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس نے نہ صرف قبل اسلام ایران کی تاریخ کو اپنے زور قلم سے جاودانی عطا کی بلکہ فارسی زبان کی بھی باوقار موجودگی دنیا کی چند مشہور و معتبر زبانوں میں درج کروائی۔

یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ محض تاریخ گوئی فردوسی کا منشا نہیں ہے۔ دراصل وہ قارئین کے فہم و شعور کو وہ بلندی عطا کرنا چاہتا ہے، جس کے پیش نظر وہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کو اچھی طرح جان سکے اور اس سے سبق لے کر وہ اپنے حال اور مستقبل کو سنوار سکے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہنامہ میں افسانوی اور فرضی حصہ بہت کم ہے۔ یہاں بھی واقعات کو بہت سادگی سے بیان کیا گیا ہے۔ شاہنامے کا دو تہائی حصہ ہیروز کے قصص پر محتوی ہے۔ جہاں تک تاریخیت کا سوال ہے تو فردوسی نے ساسانی دور کی تاریخ کو پورے استناد کے ساتھ رقم کیا ہے۔ ساسانی زوال اور عرب فاتح کے واقعات رومان کے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

شاہنامے کا پہلا علمی سفر 977 میں شروع ہوا جب فردوسی کا اشہب قلم کاغذ پر دوڑنے لگا اور لگ بھگ تیس برسوں تک کاغذ پر یہ سفر جاری رہا اور 1010 میں اپنے اختتام کو پہنچا۔[3] یہ سفر خالص ذاتی نوعیت کا تھا، جس میں فردوسی کے ہمراہ قلم و قرطاس ہی تھے۔ اس سفر کے مکمل ہوتے ہی شاہنامے کا بین الاقوامی سفر 1010 ہی میں

شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ اس بین الاقوامی سفر میں اس کا سابقہ دنیا کے متعدد خطوں سے ہوا اور گذشتہ ایک ہزار برسوں کے سفر نے اسے دنیا کے بیشتر مقامات سے آشنا کروایا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر عظیم کتب خانے میں شاہنامے کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ لیکن علمی و ادبی دنیا کی یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ خود فردوسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک بھی نسخہ دنیا کے کسی بھی سرکاری یا نجی کتاب خانوں میں موجود نہیں ہے۔ نہ صرف فردوسی کا خودنوشت نسخہ بلکہ فردوسی کی وفات (1020) کے بعد دو سو برسوں کے درمیان لکھے گئے کسی بھی قلمی نسخے کا پتہ نہیں ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق شاہنامے کا سب سے قدیم نسخہ 614ھ/ 1217 کا ہے، جو فردوسی کی وفات (1020) کے دو سو برس کے بعد کا ہے۔ یہ نسخہ اٹلی کی نیشنل لائبریری، فلورینس 4 میں ہے۔ اس نسخے کا پتہ 1977 میں چلا۔ اس کے بعد 1277-1276 کا نسخہ ہے، جو برٹش لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس میں کوئی تصویر نہیں ہے۔

ابتدا ہی سے شاہنامہ شاہی دربار کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اس لیے اس کی کتابت پر خصوصی توجہ دی گئی اور اسے سجانے اور سنوارنے پر کافی محنت کی گئی۔ اسی کی اگلی کڑی شاہنامے کو مصور بنانا تھا۔ اس سلسلے میں منگول ایلخان خان (1335-1255) نے شاہنامے کو مصور بنانے کا کام شروع کرایا۔ بعد میں تیموری سلاطین (1605-1363) اور صفوی سلاطین (1736-1502) نے شاہنامے کو مصور بنانے کی مہم کو اور تیز کیا۔ شاہنامے کے دو مصور نسخے بہت اہم ہیں۔ ایک Houghton شاہنامہ اور دوسرا گریٹ منگول شاہنامہ۔ یہ دونوں اہم نسخے Metropolitan Musuem of Art, New York City میں محفوظ ہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 2006 میں اس کی ایک شیٹ نو لاکھ چار ہزار برٹش پاؤنڈ میں فروخت ہوئی۔ شاہنامے کی بین الاقوامی اہمیت کے پیش نظر 2010 میں فٹز ولیم کیمبرج نے اس کا ہزار سالہ جشن منایا۔

شاہنامہ کے سیکڑوں مخطوطات دنیا کے متعدد کتاب خانوں کو اپنی پروقار موجودگی سے زینت بخش رہے ہیں۔ صرف ہندستان میں لگ بھگ 300 مخطوطات مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ 37 مخطوطات تو خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں۔ ان میں 23 مخطوطات میں سال کتابت درج ہے[5] اور جن مخطوطات پر سال کتابت درج نہیں ہے، اس کے بارے میں اندازہ ہے کہ وہ 14ویں، 15ویں، 16ویں، 17ویں، 18ویں اور 19ویں صدی عیسوی کے ہیں۔ مذکورہ سال کتابت یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ شاہنامہ نے 1010 میں جو اپنا علمی سفر مخطوطات کی شکل میں شروع کیا تھا، وہ 19ویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ 19ویں صدی عیسوی سے شاہنامے کا مطبوعہ نسخہ ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ سردست خدا بخش لائبریری میں محفوظ شاہنامہ کے چند اہم مخطوطات کا تعارف پیش خدمت ہے:

خدا بخش لائبریری میں شاہنامے کا سب سے قدیم نسخہ 789ھ/ 1387 کا ہے۔ ترقیمہ[6] میں کاتب نے یہی سنہ کتابت درج کیا ہے۔ لیکن خدا بخش کیٹلاگر مولوی عبد المقتدر اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تحریر اور مخطوطے کی ظاہری شکل وصورت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ 18ویں صدی کا ہے۔ چونکہ کاتب ابن یحییٰ کے حالات پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جب تک اس دبیز پردے کی دھول کو صاف نہیں کیا جاتا، اس وقت تک کوئی حتمی فیصلہ صادر کرنا مناسب نہیں۔ یہ ایک مصور نسخہ ہے۔ اس میں 51 تصویریں اپنی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔ (HL 1817)۔

اس لائبریری میں شاہنامے کا سب سے اہم نسخہ وہ ہے، جس میں تیمور کے پوتے اور مرزا شاہ رخ کے بیٹے بایسنقر کا مقدمہ شامل ہے۔ شاہ طہماسپ (1576-1524) کے دور حکومت میں 1550 کے آس پاس شاہ محمد نے اس کی کتابت کی۔ اس میں 25 تصاویر ہیں[7]۔ یہ دیدہ زیب تصویریں اس نسخے کی اہمیت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ (HL 359)

شاہنامے کا ایک نادر اور قدیم نسخہ وہ ہے جسے کابل اور کشمیر کے گورنر علی مردان خان (م 1657) نے 1637 میں شاہ جہاں کو پیش کیا تھا۔ مخطوطے کے آخری ورق پر درج یہ نوٹ: علی مردان خان بروز ملازمت باعلی حضرت گذرانیدہ۔ اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ترقیمہ کے مطابق مرشد الکاتب الشیرازی نے اسے 942ھ/ 1535 میں لکھا۔ 22 خوبصورت تصاویر سے یہ مخطوطہ مزین ہے۔[8] مختلف مناظر پر مبنی یہ تصاویر اپنی ہنرمندی اور فنکاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ (HL 358)

شاہنامے کا ایک اہم نسخہ وہ ہے جو کسی زمانے میں امیر رستم، جو 861ھ/ 1456 میں تخت نشیں ہوا تھا، اس کی لائبریری کی زینت رہ چکا ہے۔ سرورق پر گول دائرے میں طغری میں مرقوم عبارت[9] اسی جانب اشارہ کرتی ہے۔ ترقیمہ کی عبارت[10] کے مطابق اس کی کتابت 869ھ/ 1464 میں ہوئی۔ اس مخطوطے میں 55 تصویریں ہیں، جو شاہنامہ کے مختلف مناظر کو پیش کرتی ہیں۔ (ACC 1243-44)

شاہنامے کا ایک اہم نسخہ 843ھ/ 1439 کا مکتوبہ ہے۔ اس میں 45 تصویریں ہیں۔ تیمور کے لڑکے شاہ رکن بہادر (مدت حکومت 1377۔ 1447) کے عہد کے طرز پر یہ تصویریں بنائی گئی ہیں۔ آخری صفحے پر سلطان محمد شاہ (1748-1719) کی مہر ہے۔ یہ مخطوطہ کسی زمانے میں عبداللہ بن محمد بن احمد شاہ بن غیاث الدین کی ملکیت میں تھا۔ اس کی مہر بھی اس میں ثبت ہے۔[11] (HL 3787-88)

شاہنامہ لگ بھگ اکسٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ہر کسی کے لیے پوری کتاب کا مطالعہ کارے دارد۔ اس مشکل امر کا حل بھی ادیبوں نے شاہنامے کی تلخیص کے ذریعے نکالا۔ اسی کا ثمرہ ہے کہ شاہنامے کی متعدد تلخیص بھی علمی دنیا میں متداول ہیں۔ خدا بخش لائبریری میں مخطوطے کی شکل میں شاہنامے کی 14 تلخیص موجود ہے۔ شعری تلخیص کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اس کی تلخیص کی گئی ہے۔ نثر میں شاہنامے کی پہلی تلخیص 1036ھ/ 1652 میں توکل بیگ نے کیا۔ شاہ جہاں (1672-1658) کے عہد حکومت میں دارا شکوہ جو اس وقت کابل کے گورنر تھے، اس نے توکل بیگ کو وقائع نگار کی حیثیت سے غزنی بھیجا۔ وہاں انھوں نے غزنی کے گورنر شمشیر خاں کی درخواست پر شاہنامے کی تلخیص نثر میں کی۔ یہ نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے، جسے دوست محمد نے فرخ سیر (1719-1713) کے دور میں لکھا۔

شاہنامے کی نثری تلخیص کے باب میں صوبہ بہار کے حاجی پور کو بھی فخر حاصل ہے کہ یہاں کے باشندہ رام نرائن حاجی پوری نے 1140ھ/ 1727 میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ رام نرائن کے والد لچھمی نرائن، شہزادہ محمد بیدار بخت بہادر کے دربار میں پیشکار تھے۔ رام نرائن نے اس کتاب کو محمد شاہ (1748-1719) کے عہد حکومت میں مکمل کیا۔ خدا بخش لائبریری میں جو نسخہ موجود ہے، اسے مانک چند (پٹنہ) نے 1141ھ/ 1728 میں لکھا۔[12] یہ نسخہ مدتوں سے اس محقق کی تلاش میں ہے جو اسے قلمی لبادے سے نکال کر تدوین و تحقیق سے مزین کر کے طباعتی پیرہن عطا کرے۔[13]

طباعت و اشاعت کی آسانیاں میسر آجانے سے قلمی نسخوں کا یہ زریں دور ختم ہو گیا۔ اب شاہنامے کو مدون کرنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس سلسلے میں ہندستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسی سرزمین پر 1829 میں ٹی ماکن نے 17 مخطوطات کا مقابلہ و موازنہ کر کے ایک تصحیح شدہ ایڈیشن شائع کروایا۔ اس کے بعد پیرس میں جے موہل نے 1838 اور 1878 کے درمیان 30 مخطوطات کا

موازنہ کر کے شاہنامہ کے ایک نئے ایڈیشن سے علمی دنیا کو روشناس کرایا۔ 1877 اور 1884 کے درمیان فرنچ اسکالر جے اے وولر نے ماکن اور موہل ایڈیشن کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ لیکن مجوزہ 9 جلدوں میں سے صرف تین جلدیں ہی منظر عام پر آسکیں۔ بقیہ جلدیں ایرانی اسکالر سعید نفیسی، اقبال اور محمد مینوی کی کوششوں سے 1934 اور 1936 میں منظر عام پر آئیں۔ شاہنامے کا جدید تنقیدی ایڈیشن روسی اسکالروں کی ٹیم، جس کے سربراہ ای۔ ای۔ برٹیل تھے، ان کی کوششوں سے 1960 اور 1971 کے درمیان نو جلدوں میں ماسکو سے شائع ہوا۔

مذکورہ بالا تفصیلات فردوسی کے شاہنامے کو ایک رجحان ساز اور عظیم کتاب کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ دنیا ہر اس چیز کو بہت پیار دیتی ہے جو خلوص اور ایمانداری پر مبنی ہو۔ خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اگر فکر کی بلندی اور کہنے کا سلیقہ شامل ہو جائے، تو شاہنامہ جیسی عظیم کتاب منظر عام پر آتی ہے۔

حواشی

1. اسے شاہنامہ بزرگ اور شاہنامہ مؤیدی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ شاہنامہ ناپید ہے۔ تاریخ سیستان اور تاریخ بلعمی میں اس کا حوالہ موجود ہے۔

2. نثر میں دوسرا شاہنامہ ابوعلی محمد بن احمد بلخی اور تیسرا شاہنامہ ابومنصور محمد بن عبدالرزاق نے تالیف کیا۔ ابوعلی محمد بن احمد بلخی کے حالات تذکروں میں دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ اتنا واضح ہے کہ یہ بھی چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے ادیب ہیں۔ یہ بھی ناپید ہے۔ الآثار الباقیہ از ابو ریحان میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ ابومنصور محمد بن عبدالرزاق کے شاہنامے کا ذکر فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں کیا ہے۔ اس نے 346ھ/ 957 میں اسے مکمل کیا۔ یہ شاہنامہ بھی ناپید ہے۔

3. فردوسی نے 977 میں شاہنامہ کا آغاز کیا اور 8 مارچ 1010 میں اسے مکمل کیا۔

4. نیشنل لائبریری، فلورنس، اٹلی کا شمار یوروپ کی بڑی لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ 1714 میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس لائبریری میں 24988 مخطوطات، 5627205 کتابیں اور 29000 میگزین (16ویں صدی ایڈیشن) محفوظ ہیں۔

5. تاریخ کتابت اس طرح ہے: 789ھ/ 1387ء، 843ھ/ 1439، 869ھ/ 1464، 942ھ/ 1535، 983ھ/ 1578، 985ھ/ 1577، 999ھ/ 1590، 1008ھ/ 1599، 1077ھ/ 1666، 1094ھ/ 1683، 1136ھ/ 1723، 1141ھ/ 1728، 1202ھ/ 1788، 1215ھ/ 1800، 1228ھ/ 1813، 1239ھ/ 1823 اور 1246ھ/ 1830۔

6. ترقیمہ کی عبارت ہے: کتبہ العاصی ابن یحی فی اربعۃ شہر رمضان سنۃ تسع وثمانین وسبع مأۃ۔ 789ھ۔

7. اس نسخے میں شامل تصاویر کے مناظر: ملکہ سبا بلقیس کی تخت نشینی (ق 3)، محمود غزنوی کا دربار (ق 9)، شاہ گیومرث، بانی پیشدادی خاندان کا دربار (ق 19)، شاہ فریدون کے بیٹے تور (ق 36)، منوچہر فوج کا ہیرو قباد کا مارا جانا (ق 65)، رستم کے ہاتھوں سفید دیو کا مارا جانا، رستم اور سہراب کی جنگ، رستم کا کھانا بنانا، رستم کے ہاتھوں سغد کا مارا جانا (ق 82، 105، 366، 394)، برزوی کی ماں اور سہراب کی بیوی کا رستم سے منت وسماجت (ق 127)، کیخسر و کے بیٹے شہزادہ سیاوش کی مہارت (ق 145)، سیاوش کے بیٹے فرود اور گیو کے بیٹے بیژن میں جنگ (ق 188)، بیژن اور منیزہ کی محبت (ق 283)، کیخسر و کے ہاتھوں افراسیاب کا مارا جانا (ق 302)، لہراسپ کی تخت نشینی (ق 315، 316)، اسفندیار اور گرگسار کی جنگ (ق 347)، رستم کے بھائی زوارا اور ایرانیوں کے درمیان جنگ (ق 380)، بہمن کے ہاتھوں اژدہا کا مارا جانا (ق 413)، بابل میں اسکندر کی موت پر ماتم (ق 448)، بہرام شاہ کے بیٹے بہرام کی تخت نشینی (ق 468، مانی نقاش کی موت (ق 477)، بہرام گور کے ہاتھوں شیر کا مارا جانا (ق 486)۔

8. اس نسخے میں شامل تصاویر کے مناظر: ایرانیوں اور تورانیوں کی جنگ (ق 36)، نریمن کے بیٹے سام کا شکار کرنا (ق 48)، رستم اور سفید دیو، سہراب کے مارے جانے پر رستم کا ماتم کرنا، رستم اور پلادوند کے مابین کشتی (ق 81، 105، 206)، سیاوش کا اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے آگ سے گزرنا (ق 114)، بہمن کے قلعے پر کیخسر و کا قبضہ (ق 153)، نستہان، پیران کے بھائی کا فارسی کیمپ پر شبخون مارنا (ق 168)، بیژن کا رستم کے ذریعے بچایا جانا (ق 226)، گستاہم کا تعاقب کرنا (ق 254)، کیخسر و کے ہاتھوں افراسیاب کی گردن زنی (ق 284)، لہراسپ کی تخت نشینی (ق 295، 296)، رستم کا بہمن کو پتھر سے مارنا (ق 342)، رستم کا اسفندیار کو مارنا (ق 359)، اسکندر کا دارا کی موت پر حاضر ہونا (ق 380)، اسکندر کا اژدہا کا ختم کرنا (ق 396)، بہرام گور کا تعاقب کرنا (ق 435)، بہرام گور کا شیر کا شکار کرنا (ق 453)، شنگول، ہند کے راجا کے ذریعے بہرام گور کا خیر مقدم (ق 468)، اردشیر (ق 526)۔

9. سرورق کی عبارت ہے: برسم خزانہ السلطان الاعظم والخاقان الاکرم امیر رستم خلد اللہ ملکہ بن مرحوم سالار بن محمد بن سالار بن سالو بن سالار بن کیکاؤس بن شہنشاہ بن حاتم بن ہزار... بن ابی منصور بن اسبو... بن برشکاش بن... خسرو بن فیلشاہ بن ابی منصور بن شکاشن بن شہنشاہ بن حارث بن سعد بن علی بن حاتم طائی بن عبداللہ بن سعد بن الخشخع بن امرؤالقیس بن حجر بن حارث بن عمر الکندی انار اللہ برہانہم فی سنۃ 861ھ۔

10. ترقیمہ کی عبارت ہے: تمت الکتاب الموسوم بشاہنامہ... علی ید المذنب... محمد بن احمد بن حاجی اسفندیار الخوشمیری الکاتب الشہتر بترکش... سنۃ 869ھ۔

11. شاہنامہ کے بقیہ مخطوطات: (1) HL 360 مکتوبہ 999ھ/ 1590 (2) HL 361 مکتوبہ 1008ھ/ 1599 (3-6) HL362-65 مکتوبہ 1094ھ/ 1683 (7) HL 366 مکتوبہ 19ویں صدی (8) HL 1814 مکتوبہ 17ویں صدی (9) HL 1815 مکتوبہ 1246ھ/ 1830 (10) HL 1816 مکتوبہ 985ھ/ 1577 (11) ACC 2433 مکتوبہ 18ویں صدی (12) HL 2770 مکتوبہ 1215ھ/ 1800 (13) HL 3355 مکتوبہ 1077ھ/ 1666 (14) HL 3356 مکتوبہ 1077ھ/ 1666 (15) HL 3566 مکتوبہ 16ویں صدی (16) HL 3791 مکتوبہ 17ویں صدی۔

12. ترقیمہ کی عبارت ہے: تمام شد منتخب شاہنامہ فردوسی بتاریخ ہفتم شہرذی قعدہ 1141 ہزار و یک صد و چہل و یک ہجری مطابق سنہ 11 یازدہ از جلوس محمد شاہ بادشاہ کہ بخط مستمند مانک چند در شہر مامن آشوب وفتنہ بلدہ پتنہ تحریر یافت بعون اللہ تعالی وتقدس۔

13. تلخیص شاہنامہ کے مخطوطات: (1) HL367۔ خلاصہ شاہنامہ مکتوبہ 19ویں صدی (2) HL368۔ منتخب شاہنامہ مکتوبہ 1141ھ/ 1728ء (3) HL1818۔ خلاصہ شاہنامہ مکتوبہ 1239ھ/ 1823 (4) HL1819۔ خلاصہ شاہنامہ مکتوبہ 19ویں صدی (5) HL2711۔ ملخص شاہنامہ مکتوبہ 16ویں صدی (6) HL2857۔ منتخب شاہنامہ مکتوبہ 1202ھ/ 1788 (7) HL3151۔ پارہ شاہنامہ مکتوبہ 17ویں صدی (8) HL3574۔ منتخب شاہنامہ مکتوبہ 1228ھ/ 1813 (9) HL3748۔ سہراب و رستم مکتوبہ 18ویں صدی (10) HL3826۔ ملخص شاہنامہ مکتوبہ 1136ھ/ 1723 (11) HL3951۔ ملخص شاہنامہ مکتوبہ 18ویں صدی (12) HL4000۔ ملخص شاہنامہ مکتوبہ 18ویں صدی (13) Acc 6180۔ منتخب شاہنامہ 18ویں صدی (14) Acc 6181۔ منتخب شاہنامہ مکتوبہ 18ویں صدی۔

Dr. Mohd Zakir Husain, Khuda Bakhsh Library, Patna - 800004 (Bihar)

عزیز نبیل

اردو کی ادبی صحافت کا تدریجی ارتقا

اردو صحافت کی مجموعی تاریخ تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔ ان دو صدیوں میں ہندوستان میں کئی ایک علاقائی زبانوں کی صحافت نے بھی اپنے پیر پھیلائے اور اپنے اپنے طور پر اپنی زبان اور اپنے علاقے کی ثقافت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا، تاہم اردو صحافت نے اپنے مطلوب ومقصود کی سمت ارتقاء کی جو منازل طے کیے وہ اسے اوروں میں انفراد عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اردو زبان، صحافت کی کسی بھی عملی شکل سے قبل جس صورت میں ہندوستان میں رائج تھی اور جن دیگر لسانی اصناف کے ذریعے اپنی نشر واشاعت میں کوشاں تھی اس نے اردو کو عوام الناس سے اس درجہ ہم آہنگ نہیں کیا تھا جس سطح پر اردو صحافت کے عمل دخل کے بعد یہ عوام الناس میں مقبول ہوئی۔ صحافت سے قبل اردو میں تذکرہ نگاری واحد ایک ایسی نثری صنف تھی جس سے واقعات اور خیالات کے ارسال وترسیل کا کام لیا جا رہا تھا جو اپنے حقیقی معنی میں کسی بھی طرح معاشرے اور افراد کے مجموعی حالات و واقعات کی ترسیل میں کارآمد ثابت ہوتی نظر نہیں آتی تذکرہ نگاری سے زبان وادب کا ارتقا تو ہوتا نظر آتا ہے لیکن اس صنف کی یک رخی کے باعث اس کا موازنہ کسی بھی طرح صحافت سے نہیں کیا جا سکتا۔

اردو میں صحافت، بطور خاص ادبی صحافت کے عمل دخل نے نہ صرف یہ کہ اس زبان کو شش جہتی ارتقا بخشی بلکہ ہند اسلامی یا ہند آریائی ثقافت کو ایک نئے اسلوب میں ظاہر کرنے کی بنا ڈالی۔ ادبی صحافت کو اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ادبی تاریخ نویسی کا ایک بہت اہم اور جامع عمل ہے۔ رسائل وجرائد صرف کسی متعین دورانیہ میں تخلیق کار کی جانب سے قاری کے لیے ادب کی ترسیل کا ذریعہ نہیں ہوتے بلکہ یہ اپنے عہد کے ادبی رجحانات ومیلانات اور ادبی مزاج کے عکاس ہوتے ہیں اور مختلف نظریات وخیالات تک رسائل اور تبادلے کا اہم سلسلہ بنتے ہیں۔ مختلف عہد کی ادبی صحافت سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اردو کے ادبی مزاج میں بتدریج تبدیلی کا عمل واقع ہوا، رسائل وجرائد نے اپنے پیراہن کس طرح آہستہ آہستہ تبدیل کیے اور کس طور اردو ادب کے مختلف ادوار میں متنوع ادبی مزاج اور نظریات تشکیل پائے۔ ادبی صحافت دراصل اپنے عہد کے قلم کاروں کا شناخت نامہ اور مستقبل کے محقق کے لیے ایک مستند ذریعۂ تحقیق ہوتی ہے جس کی ہمہ گیر قوت کا اندازہ ہم ماضی کے ادبی رسائل وجرائد کے مطالعہ سے بخوبی کر سکتے ہیں۔

29 جنوری 1780 کو 'ہیکیز بنگال گزیٹ' نامی ہفت روزہ اخبار کی اشاعت کے ساتھ ہی سرزمین ہند میں صحافت کی ابتدا ہوتی ہے۔ تیس سال تک مختلف انگریزی اخباروں کا خوب دبدبہ رہا اور پھر کلکتہ سے ہی 1810 میں مولوی اکرم علی نے اردو زبان میں پہلا اخبار 'اردو اخبار' کے نام سے جاری کیا۔ حالانکہ اگر بیشتر محققین کی رائے کو مدِنظر رکھا جائے تو پہلا اردو اخبار جامِ جہاں نما ہے جس کا اجراء ہری دت اور سدا سکھ لعل نے 1822 میں کلکتہ سے کیا۔ ایک اور روایت ہے کہ اردو کا پہلا اخبار ٹیپو سلطان نے میسور سے 1794 کو جاری کرایا جس کا نام فوجی اخبار تھا جس کی تمام فائلوں کو انگریزوں نے سری رنگا پٹنم فتح کرنے کے بعد نذرِ آتش کر دیا تھا۔ الغرض اردو کے پہلے اخبار کے تعلق سے محققین مزید کئی اخباروں کے نام بھی لیتے ہیں یہ ایک علیحدہ بحث طلب موضوع ہے۔ پھر یوں ہوا کہ اردو اخبارات کی کامیابی کے بعد بہت جلد ہندوستان کے طول وعرض سے مختلف زبانوں میں دھڑا دھڑ اخبارات نکلنے شروع ہو گئے۔

اردو اخبارات کی اشاعت کے بعد 1850 آتے

آتے محبِ ہند، خیر خواہِ ہند، فوائد الناظرین اور قران السعدین جیسے بہت سے رسائل و جرائد شائع ہونے لگے جن میں تاریخی، ادبی، سائنسی، سماجی اور مختلف علمی موضوعات پر خصوصی توجہ دی جاتی۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے 'محبِ ہند' دہلی کو اپنے ایک مضمون 'اردو کا اولین رسالہ' میں اردو زبان کا اولین ادبی جریدہ قرار دیا ہے۔ ماسٹر رام چندر کی ادارت میں محبِ ہند کا پہلا شمارہ جون 1847 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس رسالہ میں باقاعدہ بہادر شاہ ظفر، مومن، مجنوں اور شاہ نصیر وغیرہ کا کلام اہتمام سے شائع کیا جاتا، یوسف خاں کمبل پوش کا سفر نامہ کئی اقساط میں چھپتا رہا۔

انیسویں صدی نے اپنے اختتام سے پہلے بے شمار اردو رسائل و جرائد کا چلن دیکھا جن میں اسباب بغاوتِ ہند، تہذیب الاخلاق، دبدبہ آصفی، معارف علیگڈھ، افسر، مخزن الفوائد، جلوۂ سخن، حسن اور معلمِ نسواں جیسے بہت اہم تھے۔ سرسید کے تہذیب الاخلاق نے تو خیر اردو رسائل جرائد کی تاریخ میں اپنے معیار اور مقبولیت کے اعتبار سے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔

اور پھر بیسویں صدی کا سورج اپنے ہمراہ اردو کے ادبی صحافت کا ایک ایسا روشن اور تابناک در وا کرتا ہوا طلوع ہوا کہ جس کی روشنی سے آج تک اردو شعر و ادب کا مطلع منور ہے۔

اردو کے ادبی رسائل کے سر کا تاج اور قافلہ سالار اگر کوئی رسالہ کہلانے کا حقدار ہے تو وہ شیخ عبدالقادر کا رسالہ مخزن ہے جس کا اجراء اپریل 1901 میں لاہور سے کیا گیا۔ مخزن کی زندگی کئی ادوار پر مشتمل ہے۔ شیخ عبدالقادر 1904 میں لندن گئے تو مخزن کی ادارت اپنے معاون شیخ محمد اکرام کے سپرد کر گئے۔ 1907 میں شیخ عبدالقادر وطن واپس ہوئے اور اپنے ساتھ مخزن کو دہلی منتقل کر لیا۔ 1909 میں شیخ عبدالقادر لاہور واپس آ گئے لیکن مخزن شیخ محمد اکرام کی ادارت میں دہلی سے ہی نکلتا رہا۔ لیکن اسی سال شیخ محمد اکرام کی لندن روانگی کے بعد مخزن پھر لاہور آ گیا جسے 1910 میں مولانا غلام رسول نے خرید لیا مگر سر ورق پر اعزازی مدیر کی حیثیت سے شیخ عبدالقادر کا نام ہمیشہ چھپتا رہا۔

1917 میں مولوی غلام رسول کے وفات کے تاجور نجیب آبادی رسالہ مخزن نکالتے رہے۔ مخزن کے آخری دور میں جو 1927 سے شروع ہوتا ہے حفیظ جالندھر اور ہری چند اختر نے مخزن کی ادارت کی ذمہ داریاں بحسن و خوبی انجام دیں۔ تقسیم ہند کے بعد ایک بار پھر مخزن کی اشاعت مولانا حامد علی خاں کی ادارت میں شروع ہوا جس کے مدیرِ اعزازی شیخ عبدالقادر تھے لیکن بہت مختصر عرصہ کے بعد مخزن کا یہ نیا دور بھی اختتام کو پہنچا۔ مخزن وہ تاریخ ساز رسالہ ہے جس کے ذکر کے بغیر ادبی صحافت کی تاریخ نامکمل سمجھی جاتی ہے۔

مخزن کے کچھ خصوصی شمارے یہ تھے دربار نمبر (دسمبر 1902) دوسرا دربار نمبر (جنوری 1903) سالگرہ نمبر (مارچ 1928) سالگرہ نمبر (مارچ 1929)، سالگرہ نمبر (مارچ 1930)

مشہورِ زمانہ رسالہ زمانہ کا اجراء فروری 1903 میں بریلی سے کیا گیا جس کے پہلے ایڈیٹر منشی شیوبرت لال تھے، نومبر 1903 سے زمانہ کی باگ ڈور اور ادارت کی ذمہ داریاں دیانرائن نگم ولد منشی شیونرائن نگم نے سنبھالی۔ جنوری 1904 سے زمانہ کانپور منتقل ہوا اور مستقل طور پر یہیں سے نکلتا رہا۔

دیانرائن نگم نے زمانہ کے ذریعہ بہت سے نئے لکھنے والے شعراء و ادباء کو متعارف کرایا۔ مخزن کی طرح زمانہ کو بھی یہ امتیاز حاصل ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں عظیم تخلیق کاروں کی تخلیقات کو ملک کے طول و عرض میں ترسیل کا کام انجام دیا۔ اقبال، چکبست، درگا سہائے سرور، اکبر، تلوک چند محروم، جوش، فراق، غلام بھیک نیرنگ وغیرہ رسالہ زمانہ کے مستقل قلم کاروں میں شامل تھے۔

1908 میں مصورِ غم علامہ راشد الخیری نے خواتین کا علمی و ادبی رسالہ عصمت دہلی سے جاری کیا۔ علامہ راشد الخیری اس جریدے میں خواتین کے قلمی ناموں سے مضامین لکھتے رہے تا کہ عورتوں میں تعلیم کا شوق پروان چڑھ سکے۔ عصمت کے ابتدائی دور میں شیخ محمد اکرام بھی اس کی ادارت سے وابستہ رہے۔ 1924 میں ادارت کی ذمہ داری مولانا رازق الخیری کے سپرد کی گئی۔ مولانا رازق الخیری نے بہت محنت اور دلجمعی کے ساتھ ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور عصمت کے معیار اور وقار میں اضافہ کیا۔

تقسیم ہند کے بعد یہ رسالہ مولانا رازق الخیری کے ہمراہ کراچی منتقل ہو گیا اور اپنی شاعتِ مسلسل کے سبب نسائی رسائل میں اہم مقام حاصل کیا۔ مولانا کی اہلیہ معروف ادیبہ آمنہ نازلی بھی ایک عرصہ تک عصمت کی ادارت سے وابستہ رہیں۔ 1979 میں مولانا کی وفات کے بعد صائمہ خیری نے ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اسّی سال کی قابلِ فخر اشاعت کے بعد یعنی 1988 کے بعد اس کی اشاعت کا سراغ نہیں ملتا۔

رسالہ عصمت کے چند خصوصی شمارے رسول نمبر (جنوری/فروری 1917) جوبلی نمبر (جون 1928) سالگرہ نمبر (جولائی اگست 1933)، 50 سالہ جوبلی نمبر (جولائی اگست 1958) الماسی جوبلی نمبر (جولائی اگست 1968) رازق الخیری نمبر (ستمبر 1981)؛ بیگم شائستہ اکرام اللہ نمبر (اگست 1986) سالگرہ نمبر (اکتوبر 1992)

ماہنامہ الناظر کا شمار اردو کے قدیم اور اہم رسائل میں ہوتا ہے۔ 1909 میں الناظر کا اجراء لکھنو میں عمل میں آیا۔ ابتدا میں اس کے مدیران ظفر الملک علوی اور وصی الحسن علوی تھے بعد میں ظفر الملک علوی ہی الناظر کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ رسالہ الناظر کے مالک منشی سخاوت علی صاحب علوی تھے۔

الناظر میں شائع ہونے والے مضامین کثیر الجہت تھے چنانچہ ادبی، تاریخی، تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی ہر طرح کے مضامین اس میں شائع ہوتے لیکن ادبی مضامین کو فوقیت حاصل تھی۔ ابتدا سے ہی الناظر کو اپنے عہد کے مایہ ناز قلم کاروں کا تعاون حاصل رہا جن میں مولوی عبدالحق، نظام الدین شاہ دلگیر، رضا علی وحشت، سلطان حیدر جوش، افسر میرٹھی، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی اور سید علی حیدر طباطبائی کے نام شامل ہیں۔

الناظر نے اپنے ابتدائی شماروں سے ہی انگریزی اور دوسری ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے افسانوں کے تراجم کی اشاعت کا خصوصی اہتمام جاری رکھا۔ رسالہ الناظر کے آخری رسالہ کا سراغ نومبر 1937 کے بعد نہیں ملتا ہے۔

1920 میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا ادبی و علمی ترجمان ماہنامہ علیگڈھ میگزین کا اجراء ہوا جس کے پہلے مدیر کی حیثیت سے رشید احمد صدیقی نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ علیگڈھ میگزین دراصل علی گڑھ منتھلی کا بدلا ہوا نام تھا جس کا اجراء جنوری 1903 میں ہوا تھا اور مدیر تھے خوشی محمد ناظر صاحب۔

رشید احمد صدیقی کے بعد علی گڈھ میگزین کے ایڈیٹر یونیورسٹی کے طلباء ہوتے رہے اور اساتذہ میں سے کوئی ایک اس کے نگراں مقرر رہوتے رہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

بنیادی طور پر طلباء کا رسالہ ہونے کے باوجود علی گڑھ میگزین معیار میں ہمعصر رسالوں سے کسی طرح کم نہیں رہا۔ اسے ہمیشہ مقتدر اہلِ قلم کا تعاون حاصل رہا

اور اردو ادب کے مختلف اصناف کے بہترین لکھنے والے اس میں حصّہ لیتے رہے۔ان میں مولوی ذکاءاللہ، اکبرالہ آبادی، وحیدالدین سلیم، اسلم جیراجپوری، اقبال سہیل، ذاکرحسین، یلدرم، مولوی عبدالحق، جگر، جوش، فانی، نیاز، آل احمد سرور، جاں نثار اختر، جذبی، مسعودحسین خاں، خلیل الرحمٰن اعظمی، اسلوب احمد انصاری جیسے بے شمار اہلِ قلم کے نام شامل ہیں۔

علی گڑھ میگزین نے بڑے اہم اور خصوصی شمارے بھی شائع کیے ہیں۔جن میں اقبال نمبر 1938، علی گڑھ نمبر 1939، احسن مارہروی نمبر 1941، غالب نمبر 1943، اکبرالہ آبادی نمبر 1950، طنزوظرافت نمبر 1953، علی گڑھ نمبر 55-1953، مجاز نمبر 55-1945 وغیرہ بہت اہم ہیں۔

جنوری 1922 میں میاں بشیر احمد نے اپنے والد جسٹس شاہ دین ہمایوں کی یاد میں ماہنامہ ہمایوں لاہور سے جاری کیا۔ ہمایوں علمی، ادبی اور ثقافتی جریدہ تھا جس کا برّصغیر ہندوپاک کے بلند پایہ اور معیاری جریدوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ پرچہ 1957 تک باقاعدگی سے جاری رہا 1958 میں اس کا سالنامہ چھپا اور پھر اس کے بعد یہ رسالہ بند کردیا گیا۔

ہمایوں کے ادارتی معاونین میں اردو ادب کے بہت سارے اہم نام شامل رہے جن میں تاجور نجیب آبادی، حامد علی خاں، یوسف ظفر، مظہر انصاری اور ناصر کاظمی بہت اہم ہیں۔

فروری 1922 میں علامہ نیازفتحپوری نے بھوپال سے نگار کا اجراء کیا۔ نگار محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک اور ایک دبستان کی حیثیت رکھتا تھا۔ معاصر شعروادب پر نگار نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے اور شعروادب کو ایک نئی جہت عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

بھوپال سے بہت جلد نگار کو لکھنو منتقل کردیا گیا جہاں 1957 تک یہ بڑی آب وتاب کے ساتھ نکلتا رہا۔ نیازفتحپوری نے پاکستان ہجرت کی اور نومبر 1962 سے یہی رسالہ نگار پاکستان کے نام سے پاکستانی کی سرزمین سے شائع ہونا شروع ہوا۔ نگار کے شماروں میں ایک بہت اہم سلسلہ 'مالہ وماعلیہ' کا تھا جس میں اٹھائے جانے والے مباحث کافی ہنگامہ خیز ہوتے تھے۔ نگار کو صفِ اوّل کا ادبی رسالہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں لکھنے والوں کا اعلیٰ علمی وادبی معیار رہا اور ہر جریدہ ان تحریروں کا اشاعتِ مکرّر کا خواہاں رہا۔

یوں تو نگار پاکستان کے ابتداء سے ہی فرمان فتحپوری اِس کی ادارت سے وابستہ رہے لیکن 1966 میں نیاز فتحپوری کی وفات کے بعد فرمان فتحپوری کی ادارت کا دور شروع ہوتا ہے جو تاحال جاری ہے۔ فرمان فتح پوری نے نگار کو سابقہ معیار پر جاری رکھنے کی پوری کوشش کی ہوئی ہے۔ یوں تو نگار نے بے شمار اہم اور خصوصی نمبر شائع کیے ان میں سے کچھ یہ ہیں

ملاحظات نمبر (جنوری 1926) مومن نمبر (جنوری 1928) بہادرشاہ ظفر نمبر (جنوری) غالب کی شوخیاں نمبر (جنوری 1932) اسلامی ہند نمبر (جنوری 1938) نظیر نمبر (جنوری 1940)؛ معاصر غزل گو نمبر (جنوری 1941) معاصر غزل گویوں پر تنقید نمبر (جنوری 1942) جدید شاعری نمبر (جنوری 1944) مآخذ القرآن نمبر (جنوری 1945) تنقید نمبر (جنوری/فروری 1950) حسرت نمبر (جنوری/فروری 1952) اصناف سخن نمبر (جنوری 1957) نظیر نمبر (مئی 1962) سرسید نمبر حصہ اول (نومبر/دسمبر 1970) سرسید نمبر حصہ دوم (جنوری/فروری 1971) جشن طلائی نمبر ''نیاز و نگار نمبر'' (جنوری/فروری 1982) فن تاریخ گوئی نمبر (نومبر/دسمبر 1982) ہندی شاعری نمبر (فروری/مارچ 1984) کتابیات تحقیق نمبر (ستمبر 1991) مولوی عبدالحق نمبر (اگست 1992) عورت اور فنون لطیفہ نمبر (دسمبر 1992) مشکلات غالب از نیازفتحپوری (اکتوبر 1993)

جولائی 1924 میں حکیم محمد یوسف حسن نے ماہنامہ نیرنگِ خیال کا اجراء لاہور سے کیا۔ حکیم محمد یوسف حسن صاحب نے نیرنگِ خیال کے ذریعہ اردو رسائل کی دنیا میں بہت سارے تجربات کیے۔ اردو کی ادبی صحافت میں سالناموں اور خاص نمبروں کا سلسلہ نیرنگِ خیال کی ہی دین ہے۔ نیرنگِ خیال کا ایک اور بہت اہم کارنامہ اقبال نمبر ہے جو علامہ اقبال کی زندگی میں ہی 1932 میں شائع ہوا۔

اپنی انہیں گوناگوں خوبیوں کی بدولت 1924 سے 1947 کے دوران نیرنگِ خیال ہندستان کا کثیرالاشاعت رسالہ بن کر ابھرا۔ لیکن تقسیمِ ہند کے بعد یہ رسالہ اپنی آب وتاب برقرار نہ رکھ سکا۔ چنانچہ حکیم صاحب نے نیرنگِ خیال کو پہلے راولپنڈی منتقل کیا اور پھر 1967 میں نیرنگِ خیال کی ملکیت سلطان رشک کے نام منتقل کردی۔ اب حکیم یوسف حسن نیرنگِ خیال کے مدیر اعلیٰ اور سلطان رشک مدیر تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر نئی جوت اور روشنی کے ساتھ نیرنگِ خیال کا آفتاب طلوع ہوا اور دنیائے ادب کو روشنی بانٹنے لگا۔ 31 جنوری 1981 میں حکیم صاحب کی وفات کے بعد سلطان رشک اس کے مدیر اعلیٰ ہوگئے اور تا حال سلطان رشک کی ادارت میں راولپنڈی سے یہ رسالہ جاری ہے۔

نیرنگِ خیال کے خصوصی شماروں کی طویل فہرست ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں عید نمبر (1925، جلد2، شمارہ 10-9) ادبی نمبر (1926، جلد5، شمارہ 25) سالنامہ (جنوری 1929، جلد9، شمارہ 66) ایڈیٹر نمبر (1930، جلد10، شمارہ37) جوبلی نمبر (1934، جلد 20، شمارہ 6-5) افغانستان نمبر (1938، جلد 27، شمارہ1) مختصر افسانہ نمبر (ستمبر 1959) غزل نمبر (نومبر 1967) چینی افسانہ نمبر (اپریل/مئی 1968) اشاعت خصوصی (ستمبر/اکتوبر 1982) فن اور شخصیت ایڈیشن (مئی 1984) سالنامہ (دسمبر 1988) صبا اکبرآبادی نمبر (دسمبر 1993) ماہیا نمبر (اکتوبر 1999) سالنامہ (اپریل 2004)

1929 میں تاجور نجیب آبادی نے ادبی دنیا کا اجراء لاہور سے کیا۔ ادبی دنیا تین سال سے زائد عرصہ بہت شان سے نکالنے کے بعد مارچ 1932 میں مولانا صلاح الدین احمد کے ہاتھوں فروخت کردیا جس کی ادارت کے فرائض 1932 سے 1938 کے درمیان منصوراحمد، حفیظ ہوشیار پوری اور عاشق حسین بٹالوی نے انجام دیئے۔ 1938 سے مولانا صلاح الدین احمد نے ادارت کی ذمہ داری خود اپنے سر لے لی جبکہ شریک مدیر کی حیثیت سے میراجی ساتھ رہے۔ دسمبر 1948 سے ایک سال کے وقفہ کے بعد دوبارہ ادبی دنیا کی اشاعت شروع ہوئی۔ 1959 سے 1964 تک یعنی مولانا صلاح الدین احمد کے انتقال تک وزیر آغا شریک مدیر کی حیثیت سے ادبی دنیا کے قافلے میں شامل رہے۔

1965 سے لے کر آخری شمارہ اپریل 1974 تک ادارت کی ذمہ داری محمد عبداللہ قریشی ادا کرتے رہے۔ ادبی دنیا کے کچھ خصوصی شمارے یہ تھے نوروز نمبر (جنوری 1932) ڈراما نمبر (جون/جولائی 1935) اشاعت خاص (نومبر/دسمبر 1951) یادگار نمبر مولانا صلاح الدین احمد (دور ششم 1965) اقبال نمبر (دور ششم شمارہ 24، اپریل 1967) وحشت نمبر (دور ششم شمارہ 50، 1973)

1930 میں شاہد احمد بی اے (آنرز) دہلوی نے دہلی سے ساقی اردو کا ماہوار علمی وادبی صحیفہ جاری کیا، جس کے مدیر مسئول سید انصار علی دہلوی اور مہتمم اشتیاق احمد چشتی دہلوی تھے۔ یہ رسالہ ابتدا تا 1946 بڑی آب و

تاب کے ساتھ دہلی سے شائع ہوتا رہا۔

تقسیم ہند کے بعد ستمبر 1948 سے شاہد احمد دہلوی نے اپنی بیگم عاصمہ شاہد احمد کے ساتھ کراچی سے رسالہ ساقی کی اشاعت جاری رکھی۔ 27 مئی 1966 میں شاہد احمد دہلوی کے انتقال کا انتقال ہوگیا۔ جس کے بعد 1967 میں آخری شمارہ شاہد احمد دہلوی نمبر شائع ہوا جس کے مرتب نامور ادیب ڈاکٹر جمیل جالبی (مدیر نیا دور کراچی) تھے۔ 'جھلکیاں' اور 'باتیں' ساقی کے مستقل کالم تھے جنہیں ہمیشہ قارئین کی جانب سے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

ساقی خالص ادب کا علم بردار رہا اور تمام برصغیر کے اردو ماہ ناموں میں ساقی کو ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی۔

ساقی کے کچھ اہم اور خصوصی شمارے یہ تھے افسانہ نمبر (جولائی 1930) دہلی نمبر (نومبر 1930) ظریف نمبر (اپریل 1933) جاپان نمبر (جنوری 1936) راشد الخیری نمبر (ستمبر 1936) طنز و مزاح نمبر (اپریل 1945) ناولٹ نمبر (جولائی 1960) مشرقی پاکستان نمبر (1963) جوش نمبر (1963) اشاعت خاص (اپریل 1966) شاہد احمد دہلوی نمبر (1970)

فروری 1930 میں مولانا سیماب اکبرآبادی نے قصر الادب آگرہ سے جمعیت الشعرائے ہند کے آرگن کے طور پر رسالہ شاعر کا آگرہ سے اجراء کیا۔ پہلے مدیر منظر اکبر آبادی اور نگراں سیماب اکبرآبادی صاحب تھے۔ رسالہ شاعر کے بنیادی مقاصد میں شعراء کو گمنامی اور ناقدری کی پستی سے نکالنا، تمام شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا، اردو شاعری کی ترویج اور شعراء کی تربیت وغیرہ شامل تھے۔ فروری 1932 منظر اکبرآبادی کی علالت کے سبب ادارت کی ذمہ داریاں علامہ سیماب نے اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔

1950 میں علامہ سیماب کراچی منتقل ہوگئے اور رسالہ شاعر اعجاز صدیقی کے ہمراہ ممبئی آ پہنچا جہاں انھوں نے 1978 تک شاعر کی ادارت کے فرائض انجام دیے اور رسالہ شاعر کو مایہ ناز رسائل کی صف میں لا کھڑا کیا۔ تاجدار احتشام صدیقی 1978 سے 1981 اپنی وفات تک شاعر کے مدیر رہے۔ اور اب 1981 تا حال افتخار امام صدیقی شاعر کے مدیر ہیں۔ رسالہ شاعر کے مدیران نے بدلتے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے شاعر کے مزاج میں مسلسل تبدیلیاں کیں اور نت نئے تجربات کے ذریعہ رسالہ کو بلندیاں عطا کیں۔ آج رسالہ شاعر اردو کا مقبول ترین اور کثیر الاشاعت ادبی جریدہ ہے۔ رسالہ شاعر جس کا آج کل ہر شمارہ کسی کے گوشے پر مشتمل ہوتا ہے۔ ماضی میں کئی سارے اہم اور خصوصی نمبر شائع کر چکا ہے جن میں اہم ہیں سالنامہ (مئی 1937) افسانہ نمبر (اکتوبر، نومبر 1945) منٹو نمبر (مارچ/اپریل 1955) ڈراما نمبر (1964) کرشن چندر نمبر (1967) غالب نمبر (فروری/مارچ 1969) بیاد سلام مچھلی شہری (دسمبر 1973) قومی یکجہتی نمبر (1974) ہم عصر اردو ادب نمبر (مئی/جولائی 1977) خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر (اپریل تا جون 1980) اقبال نمبر (جنوری تا جون 1988) عالمی اردو قلم کار خواتین ادب نمبر (جنوری 1999) اردو کی نئی بستیاں (جون 1999)

1935 میں چودھری برکت علی نے لاہور سے ادبِ لطیف کا اجراء کیا۔ ادبِ لطیف کی خوش قسمتی ہے کہ ہمیشہ اس کی ادارت کسی بہت اہم اور قابل ادیب کے ہاتھوں میں رہی اور اسے ہر دور میں اہم قلمکاروں کا تعاون حاصل رہا۔ ادبِ لطیف کی ادارت کے روشن سال کچھ اس طرح ہیں

پہلے ایڈیٹر طالب انصاری مقرّر رہوئے پھر 1936 سے 1941 مرزا ادیب ایڈیٹر ہوئے

1941 سے 1949 فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، قتیل شفائی، فکر تونسوی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ

1949 سے 1962 تک ایک بار پھر ادارت کی ذمہ داریاں مرزا ادیب نے ادا کیں

1962 سے 1986 تک انتظار حسین، کشور ناہید، مسعود اشعر، ذوالفقار تابش اور اظہر جاوید جیسے مایہ ناز ادیب مختلف اوقات میں اس کی ادارت سے وابستہ رہے۔ 1986 سے اب تک ادبِ لطیف کی میراث کو صدیقہ بیگم بخیر و خوبی سنبھالے ہوئے ہیں۔

ادبِ لطیف اپنے بے شمار خاص نمبروں، سالناموں اور معیاری تخلیقات کے اشاعت کے لیے ہمیشہ اردو رسائل کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔

دیگر رسائل کی طرح ادبِ لطیف نے بھی بہت سارے خصوصی شمارے شائع کیے جن میں اہم ہیں سالنامہ 36 (دسمبر 1935) سالنامہ 37 (دسمبر 1936) افسانہ نمبر (جون/جولائی 1937) سالنامہ 41 (جنوری 1941) افسانہ نمبر (مئی جون 1941) سالنامہ 47 (اپریل/مئی 1947) مولوی عبدالحق نمبر (نومبر 1961) جوبلی نمبر (اگست 1963) غالب نمبر (جنوری 1969) فیض نمبر (مارچ/اپریل 1985) نظم و غزل نمبر (مارچ 1995) افسانہ نمبر (جولائی 1997)

دکنی ادب کی ترویج اور دکن میں اردو کے فروغ میں ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا بہت اہم رول ہے۔ جنوری 1938 میں اسی ادارہ کا ترجمان ماہنامہ سب رس معروف محقق، نقاد اور ادیب محی الدین قادری زور صاحب کی زیرِ نگرانی جاری ہوا، جس کے پہلے مدیر صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش تھے جبکہ اشاعت کا اہتمام خواجہ حمید الدین کے ذمّہ تھا۔ (خواجہ حمید الدین شاہد نے دسمبر 1977 سے نوّے کی دہائی کے اواخر تک کراچی سے سب رس نکالتے رہے)۔ رسالہ سب رس ابتدا سے تا حال ایک الگ اور منفرد مزاج کا حامل رسالہ رہا۔ جس میں شعر و ادب کے علاوہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا ایک بہت معیاری حصّہ شامل ہوتا ہے۔ خصوصاً دکنی ادب اور خطّہ ء دکن سے وابستہ تخلیق کاروں کی بازیافت کا عمل رسالہ سب رس نے بخوبی انجام دیا۔ پروفیسر مغنی تبسّم کے طویل سلسلہ ء ادارت کے بعد آج کل سب رس کے مدیر پروفیسر بیگ احساس ہیں۔ سب رس کے اہم اور خصوصی نمبر یہ تھے اقبال نمبر (جون 1938) مرقع دکن نمبر (جنوری 1939) ریڈیو نمبر (جنوری 1941) ترقی پسند ادب نمبر (جولائی 1944) سالار جنگ نمبر (اپریل 1949) اردو کانفرنس نمبر (جون/اگست 1954) یوم محمد قلی قطب شاہ نمبر (اپریل/جون 1958) ظفر نمبر (جنوری/فروری 1963) غالب نمبر۔ پہلا حصہ (ستمبر/اکتوبر 1969) غالب نمبر۔ دوسرا حصہ (دسمبر 1969) سلور جوبلی تقریب یوم محمد قلی قطب شاہ نمبر (مارچ 1987) خواجہ حمید الدین شاہد نمبر (دسمبر 2001) غالب نمبر (فروری 2006)

نومبر 1942 میں آغا محمد یعقوب دداشی کی ادارت میں پندرہ روزہ رسالہ آج کل شائع ہونا شروع ہوا۔ برّ صغیر کا ایک اہم ادبی رسالہ ہے جو حکومتِ ہند کے ادارۂ اشاعت و طباعت کی زیرِ نگرانی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ گرچہ انگریزوں نے اپنی پالیسی اور پروگرام کی تشہیر و اشاعت کے لیے جاری کیا تھا لیکن آزادی کے بعد اسے ثقافتی اور ادبی رسالہ بنا دیا گیا۔ یہ رسالہ دسمبر 1947 سے رگھوناتھ رینا کی ادارت میں ماہانہ نکلنا شروع ہوا۔ اس دوران مختصر تعطل کا شکار ہوا جبکہ اکتوبر 1948 سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

آج کل کی ادارت سے مختلف ادوار میں اردو شعر و ادب کی بہت اہم اور مؤثر شخصیات وابستہ رہی ہیں جن میں آغا محمد یعقوب دداشی، معین احسن جذبی، سید

وقار عظیم، جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، مہدی عباسی،، شہباز حسین، راج نرائن راز، عابد کرہانی، محبوب الرحمٰن فاروقی وغیرہ شامل ہیں۔ فی الحال اس کے مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی ہیں۔

رسالہ آج کل اپنے معیار اور اپنے مزاج کے اعتبار سے اردو کے بہت نمایاں رسائل میں سے ایک ہے۔ آج کل کے کچھ اہم نمبر یہ ہیں گاندھی نمبر (جنوری رفروری 1948) جمہوریت نمبر (فروری 1905) غالب نمبر (فروری 1952) شعر و شاعری نمبر (اگست 1953) ابوالکلام آزاد نمبر (اگست 1958) جگر نمبر (1961) بہادر شاہ ظفر نمبر (نومبر 1962) افسانہ نمبر (اگست 1963) تحقیق نمبر (اگست 1967) اردو نمبر (اگست 1968) جدید ہندوستانی شاعری نمبر (اگست 1969) سلور جوبلی نمبر (جون 1970) اردو طباعت و اشاعت نمبر (دسمبر 1970)؛ طنز وظرافت نمبر (اپریل 1974)؛ امیر خسرو نمبر (نومبر 1974) حسرت موہانی نمبر (اگست ستمبر 1981) سہیل عظیم آبادی نمبر (نومبر 1982) چکبست نمبر (فروری 1983) میر تقی میر نمبر (مارچ اپریل 1984) اردو صحافت نمبر (دسمبر 1984) منتخب تخلیقات نمبر (ستمبر اکتوبر 1988) گولڈن جوبلی نمبر (اپریل 1992) اختر الایمان نمبر (فروری 1949)

1946 میں ماہنامہ افکار کا اجراء صہبا لکھنوی اور رشدی بھوپالی کی ادارت میں بھوپال سے ہوا۔ 1950 تک یہ رسالہ بھوپال سے شائع ہوتا رہا اور ترقی پسند تحریک کے ایک اہم آرگن کا کردار ادا کرتا رہا۔ صہبا لکھنوی کی پاکستان ہجرت کے بعد افکار 1951 سے کراچی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ 2002 میں صہبا لکھنوی کی وفات کے بعد ڈاکٹر حنیف فوق کی ادارت کا سلسلہ شروع ہوا۔ 2004 میں افکار کا صہبا لکھنوی نمبر میں شائع ہوا جس کے بعد یہ شاہکار رسالہ بند ہوگیا۔

اردو ادب کی تاریخ میں رسالہ افکار اپنے خاص نمبروں کے لیے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے تراجم پیش کر کے اردو ادب کو دوسری زبانوں کے قریب لانے میں افکار نے بہت اہم کام انجام دیا اور خودنوشت سوانح عمریوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

افکار کے خاص نمبروں کی تفصیل کچھ یوں ہے آزادی نمبر (1952) دس سالہ نمبر (اگست 1955) مجاز نمبر (جون 1956) رائٹرس کنونشن نمبر (مارچ 1959) جوش نمبر (نومبر 1961) حفیظ نمبر (اگست رکتوبر 1963) افسانہ نمبر (اپریل رمئی 1964) فیض نمبر (اپریل رجون 1965) غالب نمبر (فروری رمارچ 1966) غالب نمبر (فروری رمارچ 1969) ندیم نمبر (جنوری رفروری 1975) امیر خسرو نمبر (نومبر دسمبر 1975) برطانیہ میں اردو (اپریل 1981) خاص نمبر (اگست 1987) منتخب افسانہ نمبر (جنوری رفروری 1995) منتخب مضامین نمبر (اپریل رمئی 1995)

جنوری 1947 میں چودھری نذیر احمد نے لاہور سے دوماہی سویرا کی ابتدا کی۔ احمد ندیم قاسمی، فکر تونسوی اور چودھری نذیر احمد اس کے مرتبین تھے۔ سویرا کا مزاج ابتدا سے ہی خالص ادبی رہا اور بہت اہم قلمکاروں کا ساتھ نصیب ہوا چنانچہ سویرا کی روشنی بہت دور تک پھیلتی چلی گئی۔ اس دوران اس کے مرتبین میں عارف عبدالمتین، ظہیر کاشمیری اور احمد راہی ہوگئے۔ لیکن سویرا کے شمارہ 12 سے دائرۂ ادارت میں احمد راہی اور چودھری نذیر احمد کے نام سامنے آئے۔ سویرا کی ادارت مختلف ادوار میں جن ادباء نے اٹھائی ان میں حنیف رامے، ظفر اقبال، محمد سلیم الرحمٰن، ریاض چودھری اور صلاح الدین محمود وغیرہ بھی شامل ہیں۔ سویرا کی اشاعت بے قاعدگی کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ سالوں بعد کبھی کبھار ایک آدھ شمارہ نظر سے گزر جاتا ہے۔ اس کے موجودہ مدیر سلیم الرحمٰن ہیں۔

لاہور کے محمد طفیل صاحب نے مارچ 1948 میں مشہورِ زمانہ رسالہ نقوش کا اجراء کیا جس کے پہلے مدیران احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور تھے (شمارہ 1 تا 10)۔ مئی 1950 تا مارچ 1951 (شمارہ 11 تا 18) سید وقار عظیم نے رسالہ نقوش کے مدیر کی حیثیت سے نقوش کو ''زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا ترجمان'' بنانے میں اہم پیش رفت کی۔ اپریل 1951 میں ادارت کی ذمہ داریاں محمد طفیل صاحب نے خود سنبھال لیں جس کا سلسلہ محمد طفیل کی وفات 1986 تک پھیلا ہوا ہے اور یہی دور نقوش کا تابناک دور ہے جس نے محمد طفیل کو محمد نقوش بنا دیا (شمارہ 19 تا 132)۔ محمد طفیل نے اپنے دورِ ادارت میں نقوش کے ایسے ایسے نادر و نایاب نمبر ترتیب دیے کہ نقوش کے پرانے رسائل آج اہلِ علم اپنے کتب خانوں میں رکھتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔

مدیر نقوش محمد طفیل کی 1986 میں وفات کے بعد نقوش ان کے بیٹے جاوید طفیل کی ادارت میں نکلتا رہا اور خاص نمبروں اور سالناموں کا سلسلہ جاری رہا (شمارہ 133 تا 148)۔ بالآخر 2005 میں شمارہ 148 (گولڈن جوبلی نمبر) کے بعد یہ عظیم الشان رسالہ شائع نہ ہوسکا۔ خاص نمبروں اور سالناموں کے اس جریدہ کے کچھ بہت اہم اور نایاب خصوصی شمارے یہ تھے۔

جشن آزادی نمبر (1948) عالمگیر امن نمبر (جون 1949) شخصیات نمبر (جنوری 1955) افسانہ نمبر (ستمبر 1955) طنز و مزاح نمبر (جنوری رفروری 1959) پطرس نمبر (ستمبر 1959) ادب عالیہ: نقوش کے دس سالہ تحریروں کا انتخاب (جولائی 1960) لاہور نمبر (فروری 1962) آپ بیتی نمبر (جون 1964) خاص نمبر (اکتوبر دسمبر 1966) غالب نمبر (فروری 1969) اقبال نمبر (ستمبر 1977) سالنامہ (جنوری 1979) میر تقی میر نمبر (اکتوبر 1980) ادبی معرکے نمبر 1 و 2 (ستمبر 1981)

ماہِ نو 1948 میں کراچی سے پروفیسر سید وقار عظیم کی ادارت میں جاری کیا گیا۔ یہ سرکاری جریدہ ہندوستان کے سرکاری رسالہ آج کل کے طرز پر ادارۂ مطبوعات و فلمز کے زیر اہتمام نکالا گیا۔ 1950 میں پروفیسر حسن عسکری اس کے مدیر بنائے گئے۔

جولائی 1950 میں رفیق خاور (مدیر اردو لغت بورڈ) اور ظفر قریشی کی ادارت میں یہ شائع ہوا۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے اس کا استقلال ایڈیشن شائع کیا۔ دارالحکومت اسلام آباد بننے کے بعد کراچی سے اس کو اسلام آباد منتقل کر دیا گیا چند شماروں کے بعد پھر لاہور سے جاری ہوا اور کشور ناہید کی ادارت میں اس کے چالیس سالہ انتخاب بعنوان مخزن کے دو شمارے (1987) شائع کیے گئے۔ اب یہ صفدر بلوچ کی ادارت میں مطبوعات و فلمز پبلی کیشنز، حکومت پنجاب، لاہور سے شائع کیا جا رہا ہے۔ سرکاری جریدہ ہونے کے باوجود ماہِ نو کا مزاج خالصتاً ادبی، علمی اور ثقافتی ہے۔ ماہِ نو کے خصوصی شماروں کی تفصیل بھی بہت طویل ہے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں

خاص نمبر (اگست رستمبر 1948) قائد اعظم نمبر (نومبر 1948) ایران نمبر (مارچ 1950) جشن استقلال نمبر (اگست 1951) خاص نمبر: بیادگار تحریک آزادی 1857 (مئی 1957) انتخاب 1953 تا 1958 نمبر (1958) اشاعت خاص (اکتوبر 1962) سیرت رسول نمبر (جولائی رگست 1963) اشاعت خاص (مارچ 1965) غالب کی صد سالہ برسی پر خصوصی اشاعت (جنوری رفروری 1969) انیس نمبر (جولائی 1972) دبیر نمبر (ستمبر راکتوبر 1975) اقبال نمبر (ستمبر 1977) بچوں کا ادب نمبر (نومبر 1979) مسلم فن و ثقافت نمبر (مئی

1980)ادب اور قومی تشخص نمبر (اگست 1982) فن و ثقافت نمبر (مئی 1987) گولڈن جوبلی نمبر (اگست 1997)

جنوری 1949 کو ترقی پسند مصنّفین کا دوماہی ترجمان شاہراہ کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا (پہلے شمارہ پر ماہ و سال کا اندراج نہیں ہے چنانچہ پہلے شمارہ کے ماہ و سال کا اندازہ بعد کے شماروں سے لگایا گیا)۔ پہلے شمارہ کے مدیران ساحر لدھیانوی اور رام پرکاش اشک تھے۔

شاہراہ نمبر 2 میں رام پرکاش اشک ادارت میں شامل نہیں تھے۔ شاہراہ 5 میں سرلا دیوی اور پرکاش پنڈت مدیران تھے بعد میں عرصہ دراز تک پرکاش پنڈت ہی رسالہ نکالتے رہے۔ پھر یوسف جامعی شاہراہ کے مدیر مقرّر ہوئے جنہوں نے کئی خاص نمبر شائع کیے جن میں کہانی نمبر مارچ 1960 اور ناولٹ نمبر فروری 1958 اہم ہیں۔ ناولٹ نمبر ملکی اور غیر ملکی ادب کے معروف ناولٹ جمع کیے گئے تھے۔

رسالہ شاہراہ اپنی اشاعت کے آخری مرحلہ تک ترقی پسند تحریک کی مکمل نمائندگی کرتا رہا اور ترقی پسند تحریک کے اہم لکھنے والوں کو نمایاں طور پر رسالہ میں شائع کرتا رہا۔ کچھ اہم خصوصی شمارے یہ تھے کانفرنس نمبر (اگست 1950) سالنامہ (مارچ 1951) افسانہ نمبر (ستمبر 1953) طنز و مزاح نمبر (جولائی 1955) سالنامہ (جنوری 1956) کہانی نمبر (مارچ 2006)

مارچ 1953 میں آنجہانی گوپال متّل نے ماہنامہ 'تحریک' دہلی کی اشاعت کا آغاز کیا۔ تحریک کی اشاعت کے مختلف ادوار میں گوپال متّل کے علاوہ مخمور سعیدی، تمکین کاظمی اور پریم گوپال متّل نے بڑی جانفشانی سے رسالہ تحریک کو اپنے عہد کی ایک اہم اور بااثر ادبی تحریک بنانے میں بہت موثر کردار ادا کیا۔

29 برسوں تک جاری رہنے والے اس بلند پایہ رسالے کی اشاعت جون 1981 میں مستقل طور پر بند ہوگئی۔

رسالہ 'تحریک' کی مقبولیت میں اس کے خاص نمبروں کا بھی اہم کردار رہا ہے جن کی مختصر تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔ سالنامہ (مارچ 1955) جگر نمبر (اکتوبر 1960) غالب نمبر (اپریل/مئی 1961) خصوصی شمارہ: چین کے ادبی اور ثقافتی رجحانات پر ایک نظر (اگست 1962) تاراسوف نمبر (مئی 1963) جگر نمبر (اکتوبر 1964) اقبال نمبر (جون 1967) انقلاب روس نمبر (نومبر 1967) آزادی نمبر (ستمبر 1975) سلور جوبلی نمبر (جولائی/اکتوبر 1978)

حکومت اتر پردیش کی منسٹری آف انفارمیشن کا رسالہ نیا دور اپریل 1955 میں لکھنو سے جاری ہوا۔ نیا دور کے پہلے ایڈیٹر علی جواد زیدی تھے جنھوں نے اپنی ذہانت اور اعلیٰ ادبی ذوق کی بدولت رسالہ کو عروج عطا کیا اور رسالہ کا ایک اہم ادبی مزاج متعین کیا۔

رسالہ نیا دور اپنے خصوصی شماروں کی وجہ سے اردو کے ادبی رسائل کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ نیا دور کے ذریعہ پیش کیے گئے یہ نمبرات دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔

نیا دور کے موجودہ مدیر امیر احمد صدیقی صاحب ہیں جو رسالہ نیا دور کو آج بھی اردو کے اہم اور مستند رسائل میں شامل کرنے میں کامیاب ہیں۔ جس کی زندہ مثالیں تازہ شائع شدہ نیا دور کے خصوصی شمارے ہیں جن میں رشید حسن خاں نمبر، عرفان صدیقی نمبر اور انقلاب 1857 اہم ہیں۔ کچھ اور اہم خصوصی شماروں کی تفصیل یوں ہے۔ جمہوریت نمبر (26 جنوری 1956) تعمیری ادب نمبر (جنوری 1957) اسپیشل نمبر 1857 (اگست 1957) نہرو نمبر (جولائی/اگست 1964) جعفر علی خاں اثر نمبر (ستمبر 1967) غالب نمبر (فروری/مارچ 1969) گوشہ ڈاکٹر ذاکر حسین (جون 1969) گوشہ اقبال (دسمبر 1973) امیر خسرو نمبر (دسمبر 1974) عبدالماجد دریا بادی نمبر (اپریل/مئی 1978) اطفال نمبر (نومبر/دسمبر 1979) منشی نول کشور نمبر (نومبر/دسمبر 1980) بہادر شاہ ظفر نمبر (اکتوبر 1981) فراق نمبر اول (مارچ تا مئی 1983) فراق نمبر دوم (مئی تا جولائی 1984) یاد رفتگاں نمبر (اپریل تا ستمبر 1988) اودھ نمبر اول (فروری مارچ 1994) اودھ نمبر دوم (اکتوبر/نومبر 1994) نصف صدی نمبر (مارچ تا مئی 1995) حریت نمبر (اگست 1998) وامق جونپوری نمبر (جون 1999)؛ غالب نمبر (دسمبر 1999) کیفی اعظمی نمبر (جولائی/اگست 2002)

1950 میں محمود ایاز نے بنگلور سے رسالہ سوغات کا اجراء کیا۔ یہ ایک رجحان ساز اور جدیدیت کا علمبردار رسالہ تھا۔ گوکہ سوغات کی اشاعت میں کبھی بھی تسلسل نہیں رہا۔ اشاعت میں طویل وقفوں کے ساتھ سوغات کی اشاعت تین مختلف ادوار پر مشتمل ہے۔

سوغات کا ہر شمارہ اپنے آپ میں اہم اور خاص شمارہ ہوتا تھا۔ جدید نظم نمبر بابت اپریل تا اکتوبر 1961 نے اردو ادب میں جدید نظم کی معنویت، اہمیت اور مزاج کے تعین میں اہم کردار عطا کیا۔ (کچھ عرصہ تک پاکستان میں غلام احمد صاحب اس کا کراچی سے ایڈیشن شائع کرتے رہے)

محمود ایاز کی وفات تک رسالہ سوغات اپنے مشمولات کے حوالے سے ایک اہم رسالہ کی حیثیت سے شعراء و ادباء میں بہت مقبول رہا۔ نومبر 1997 میں سوغات کے تیسرے اور آخری دور کا آخری شمارہ مریم ایاز کی ادارت میں شائع ہوا۔

احمد ندیم قاسمی نے 1963 میں لاہور سے ادبی رسالہ سہ ماہی فنون کی اشاعت شروع کی جس کی ادارت وہ آخری سانس تک کرتے رہے۔ فنون کے ذریعہ احمد ندیم قاسمی نے نئی سوچ اور نئی نسل کے شعرا و ادبا کو متعارف کرانے کا اہم کام انجام دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے فنون کے دستاویزی اور یادگار نمبر شائع کیے جن میں غزل نمبر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے اس میں کئی ایسے اہم شعراء کی غزلیں شامل ہیں جو اس سے قبل کہیں نظر نہیں آتیں۔ منصور احمد نے احمد ندیم قاسمی کی وفات تک فنون کی ادارت میں اہم رول ادا کیا۔

10 جولائی 2006 کو احمد ندیم قاسمی کی وفات کے ساتھ فنون کا تابناک عہد ختم ہوگیا تھا لیکن مختصر تعطّل کے بعد ناہید قاسمی دختر اور نیر حیات قاسمی نے پھر سے فنون کی اشاعت کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ فنون کے کچھ خاص شماروں کی تفصیل یوں ہے خاص نمبر (جنوری 1964) اشاعت خاص (اپریل/مئی 1964) خاص شمارہ (مئی/جون 1965) جدید غزل نمبر (جنوری 1969) اختر حسین جعفری نمبر (مئی/اگست 1992)

معروف کہانی کار نسیم درانی نے ستمبر 1964 میں کراچی سے رسالہ سیپ کا اجراء کیا۔ ان کے ساتھ شعبۂ اردو جامعہ کراچی کے پروفیسر جمیل احمد خاں، امید فاضلی، خواجہ رضی حیدر وغیرہ علمی و قلمی معاونت کرتے رہے۔ جبکہ برّصغیر کے ہر اہم لکھنے والے ادیب، نقاد اور شاعر کی تخلیقات و نگارشات کتابوں کے مطالعے اور تبصرے سیپ میں شائع ہوتے رہے۔ سیپ کی شہرت ہر سو پھیلتی چلی گئی۔ اگرچہ سیپ کی اشاعت کبھی بھی باقاعدہ نہیں رہی لیکن اپنی بے قاعدگی کے باوجود اردو ادب کے اہم رسائل میں سیپ نے اپنے لیے جگہ حاصل کرلی اور تاحال نسیم درّانی صاحب کی ادارت میں محوِ سفر ہے۔

اردو افسانے کے فروغ اور ارتقا میں فکر نو کے ترجمان رسالہ سیپ نے بہت اہم رول ادا کیا۔

جنوری 1966 میں اوراق کا اجراء مشہور و معروف ادیب و شاعر وزیر آغا نے بیاد مولانا صلاح الدین بانی و

مدیر ادبی دنیا، لاہور سے کیا تھا جس میں معاون مدیر عارف عبدالمتین تھے۔ جنوری فروری 1976 سے سجّاد نقوی اوراق کی مجلس ادارت میں اعزازی مدیر کی حیثیت سے شامل ہوئے۔

اوراق ابتداء سے ہی عملی طور پر ششماہی رسالہ رہا اور بالعموم سالناموں اور خاص نمبروں کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ اوراق نے انشاپردازی کی صنف کو ایک نئی جہت دی اور اسے اردو ادب میں ایک اہم صنف کی حیثیت سے متعارف کروانے میں اہم رول ادا کیا۔ 'سوال یہ تھا'، 'ادھوری ملاقاتیں' اور 'میرا پسندیدہ فنکار' وغیرہ اوراق کے مختلف ادوار میں اہم سلسلے رہے۔

سن 2000 میں اوراق کی جلد 36 شائع ہوا جس میں اوراق کے گزشتہ 35 سالوں کی اشاعت کا اشاریہ شامل کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ اور شمارے آئے لیکن پہلے سی تب وتاب باقی نہیں رہی تھی پھر یہ رسالہ بند کردیا گیا۔ آخری شمارہ کا سراغ نومبر دسمبر 2005 (جلد 41، شمارہ 11/12) تک ملتا ہے۔ اوراق کے کچھ خصوصی شماروں میں اہم یہ ہیں ۔ شمارہ خاص (1967) افسانہ، انشائیہ نمبر (مارچ/اپریل 1972) جدید نظم نمبر (جولائی/اگست 1977) خاص نمبر (جنوری/فروری 1978) سالنامہ (فروری مارچ 1981) خاص نمبر (اگست/ستمبر 1995)

جون 1966 میں شمس الرحمٰن فاروقی نے الہ آباد سے شب خون کا اجرا کیا۔ شب خون کے پہلے مدیر ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب تھے اور مرتب کی حیثیت سے اہلیہ شمس الرحمٰن فاروقی محترمہ جمیلہ فاروقی کا نام شامل تھا۔ اپنے عہد کے نہایت اہم رسالوں میں شامل شب خون کو جدیدیت کا پیش رو قرار دیا گیا جس نے اردو قلم کاروں کی دو نسلوں کی رہنمائی اور تربیت کی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون کا آغاز جس شان و شوکت سے کیا تھا اسی اہتمام کے ساتھ جون 2005 میں اس کا اختتام بھی عمل میں آیا۔ دو بہت ضخیم جلدوں پر مشتمل شب خون کا آخری شمارہ منظر عام پر آیا جس میں شب خون کے گزشتہ چالیس سال کے شماروں سے بہترین تخلیقات کا انتخاب شامل کیا گیا تھا۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مخزن سے شب خون تک رسائل و جرائد کا یہ تابناک دور ہمیشہ اردو کے ادبی صحافت میں سنہری روشنائی سے لکھا جائے گا۔ اردو کے ادبی صحافت کو امتیاز حاصل ہے کہ برصغیر کی اور زبان میں اس قدر رسائل وجرائد نہیں جاری ہوئے جتنا کہ اردو زبان میں شائع ہوئے۔ بیسویں صدی کے ابتداء سے لے کر اردو رسائل و جرائد کی روشن روایت تا حال برقرار ہے۔ جن رسائل وجرائد کا ذکر کیا گیا ان کے علاوہ بھی بے شمار اہم رسائل و جرائد ایسے رہے کہ جن کے دم سے یہ کہکشاں منور رہی ہے ان میں بہت اہم حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ، عبدالحلیم شرر کا دلگداز، مائل دہلوی کا رسالہ زبان، مولانا راشد الخیری کا تمدن، مولوی عبدالحق کا رسالہ اردو، ممتاز یار جنگ کا افسر، خواجہ حسن نظامی کا نظام المشائخ، پیارے لال شاکر میرٹھی کا ادیب، خواجہ غلام الثقلین کا عصر جدید، احسن مارہروی کا فصیح الملک، ساغر نظامی کا رسالہ ایشیا، عابد سہیل کا رسالہ کتاب، مغنی تبسم اور شہریار کا شعر وحکمت، دہلی اردو اکادمی کا ایوانِ اردو اور مکتبہ جامعہ کے کتاب نما کے علاوہ بہت سارے دیگر رسالے بھی شامل ہیں۔

ادبی صحافت کے جائزہ کا ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ اس کو ادب عوام اور ادب خواص میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ادب خواص میں عموماً خالص ادبی اور لسانی معاملات کو زیر بحث لایا جاتا ہے جب کہ ادب عوام سے مراد وہ تحریریں اور متون ہیں جن میں معاشرتی مسائل کو عمومی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں جاسوسی دنیا، رومانی دنیا اور خاتون مشرق وغیرہ جیسے رسائل اور کتابی سلسلوں کو ہم کیوں فراموش کردیتے ہیں۔

اردو کی ادبی صحافت کی تاریخ جس قدر طویل ہے اسی قدر دلچسپ اور اہم بھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس موضوع پر کام بہت کم ہوا ہے۔ اردو کی ادبی صحافت پر جو بڑے پیمانے پر کچھ کام ہوئے ہیں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ انور سدید کی کتاب 'پاکستان میں اردو رسائل و جرائد' ضیاء اللہ کھوکھر کی 'ماہانہ رسائل کے خصوصی شمارے'، عزیز نبیل کے رسالہ دستاویز کا 'اہم ادبی رسائل و جرائد نمبر' اور حال ہی میں عبدالحی خان کی کتاب 'ادبی صحافت آزادی کے بعد' کے علاوہ اردو کی ادبی صحافت کی ترتیب وتدوین کی سمت کوئی خاص پیش رفت نظر نہیں آتی ہے۔

ادبی صحافت کے روشن اور تابناک ماضی کی کچھ اہم خصوصیات کا ذکر ضروری ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی روشنی ماضی کی سو سالہ ادبی صحافت کی تاریخ سے چھن چھن کر موجودہ ادبی صحافت کے مسافروں کو روشنی کا سرمایہ فراہم کررہی ہیں۔

1. ادبی صحافت کی ابتدا میں رسائل وجرائد میں مسابقہ کا مزاج بہت زیادہ غالب تھا، چنانچہ قبول عام کے حصول کے لیے رسائل نے خود کو زمانے کے ساتھ بہت تیزی سے تبدیل کیا، اہم اور معتبر تخلیق کاروں کی تخلیقات کے حصول کو یقینی بنایا اور نت نئے تجربات کے ذریعہ اپنے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

2. ماضی کی ادبی صحافت کی ایک اور اہم خصوصیت تھی جس کی وجہ سے یہ دور رسائل و جرائد کے معیار اور وقار کے اعتبار سے ایک انقلابی دور تھا۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ ان رسائل کے مدیران اعلیٰ درجہ کے مصنف، شاعر، ادیب اور انشاء پرداز کی حیثیت سے اپنی علیحدہ شناخت اور ادب کی دنیا میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان باکمال اور قابل مدیران کی دیکھ ریکھ میں ادبی رسائل و جرائد نے اردو کی ادبی صحافت کو آسمان بنادیا۔

3. ماضی کے رسالوں میں طبع زاد افسانے کی بہ نسبت دیگر زبانوں کے تراجم زیادہ شائع ہوتے تھے۔ اس لحاظ سے اردو کا سرمایۂ ادب گراں قدر ہوتا گیا۔

4. بدلتے ہوئے زمانہ کے پیش نظر عصرِ حاضر میں ادب کو وہ مقام نہیں حاصل رہا جو کبھی تھا چنانچہ ماہانہ رسائل کے مقابل سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ رسائل کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور جو رسائل جاری ہیں ان میں بھی صرف چند ہی رسائل کی اشاعت میں تسلسل پایا جاتا ہے۔

ایسے رسائل وجرائد کی ایک الگ تاریخ ہے جن کا اجراء بہت تزک واحتشام کے ساتھ عمل میں آیا لیکن گنتی کے چند شماروں سے زیادہ نہیں نکل سکے۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں جن میں سب سے اہم قاری کی قلّت، معیاری تخلیقات کی قلّت اور مالی وسائل کی قلّت ہے۔ ماضی قریب میں بہت سارے شہرۂ آفاق رسالے یا تو بند ہوگئے یا ان میں وہ پہلی سے روشنی نہیں رہی۔ افکار، اوراق، شب خون، سویرا، نقوش وغیرہ رسائل اس صدی کی پہلی دہائی میں اپنی آخری سانسیں لے چکے ہیں لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی ہے کہ بہت سے رسائل مسلسل اپنی موجودگی سے روشن صبح کے باقی ہونے کی امید پیدا کیے ہوئے ہیں چنانچہ طویل العمر معتبر رسائل میں شاعر، ادبِ لطیف، نیرنگِ خیال، نگار، سب رس، ماہِ نو، صحیفہ، آج کل، نیا دور، تخلیق، سیپ، شگوفہ اور کتاب نما جیسے رسائل آج بھی اپنی موجودگی درج کرارہے ہیں۔ نیز ایک حوصلہ افزا بات یہ بھی ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے بہت سارے نئے اور معیاری رسائل کے اجراء کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

■

Aziz Nabeel
Secretary, Anjuman Muhibbane Urdu Hind
Doha Qatar
aziznabeel@yahoo.com

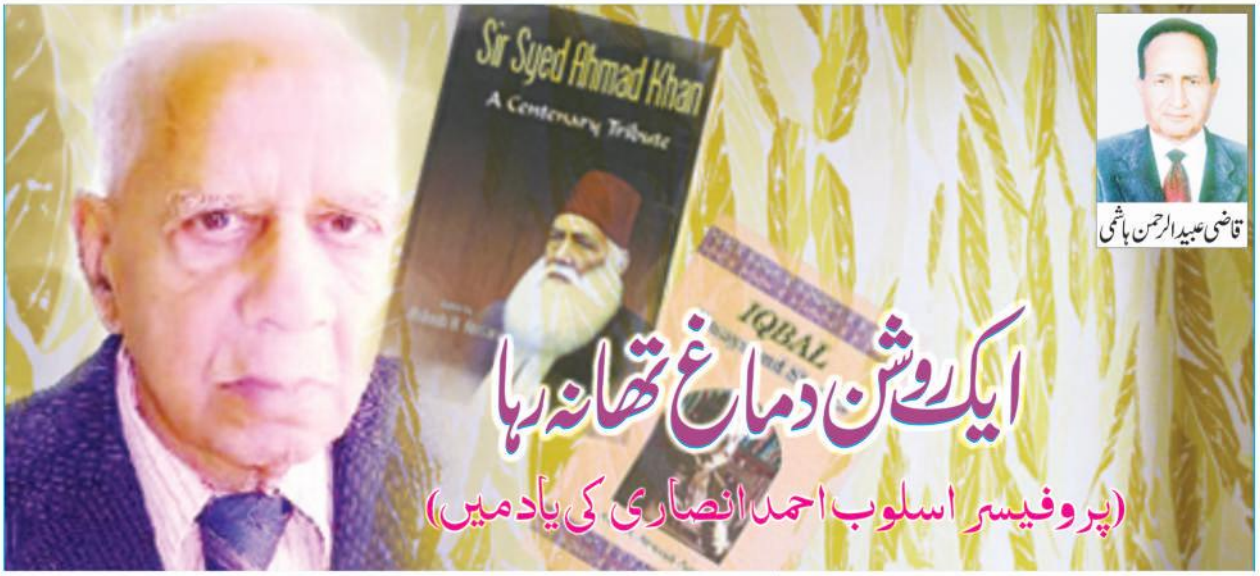

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

(پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی یاد میں)

قاضی عبید الرحمن ہاشمی

پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب گذشتہ کچھ برسوں سے صاحب فراش تھے۔ کہولت کے ساتھ ناطاقتی کوئی نئی بات نہیں لیکن ان کے لیے سب سے بڑا ذہنی آزار ذیابیطس کے باعث ایک آنکھ کی بینائی کا مکمل طور پر چلا جانا تھا، جس کے سبب ان کے تمام علمی و ادبی مشغلے متاثر ہوگئے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان جیسے عالم کے لیے جو ہمیشہ لکھنے لکھانے اور کتب بینی میں ہی مستغرق رہتا ہو اتنی بڑی آزمائش اور روحانی آشوب کی تاب کس طرح لاسکتا تھا۔ اس حادثے نے داخلی طور پر ان کی زندگی کو دربرہم کردیا۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اپنے مزاج اور اعلا ظرفی کے باعث کبھی کسی سے بھی اپنی اس ذہنی اذیت کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ہمیشہ راضی بہ رضائے یار رہنا ہی پسند کیا۔ اس کلفت نے بتدریج ان کی رہی سہی توانائی بھی چھین لی۔

اور بالآخر 4 مئی 2016 کی شب میں علی گڑھ کا یہ بطل جلیل ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہوگیا۔ دانشگاہ علی گڑھ کی جن علما اور فضلا سے شناخت قائم تھی ان میں اسلوب صاحب کا نام ہمیشہ سرفہرست رہا ہے۔ مجھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں 1969 میں علی گڑھ گیا اور اسلوب صاحب کی عنایت سے میرا داخلہ ایم اے (انگریزی) میں ہوا، ہر چند کہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے مجھے انگریزی سے اردو میں منتقل ہونا پڑا لیکن وہاں تقریباً چھ سال قیام کے دوران یونیورسٹی کے علمی حلقوں میں اسلوب صاحب کے بارے میں جس نوع کا حسن ظن احترام اور عقیدت دیکھنے کو ملا وہ کسی بھی دوسرے استاد کا کبھی مقدر نہ بن سکا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میرے اسی طالب علمی کے زمانے میں معروف شاعر اور انگریزی کے استاد ڈاکٹر سید امین اشرف نے مجھے اسلوب صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کا ایک مضمون بعنوان 'خطوط غالب میں نفس کی پرچھائیاں' نقل کرنے کو دی تو میں نے اس خوب صورت تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھا اور مجھ پر اسلوب صاحب کی غیر معمولی علمی شخصیت کا جو رعب قائم ہوا اس میں کبھی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ اس اثر پزیری میں ان کی تحریروں کے مطالعے سے ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ میرے شفیق استاد ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی جو خود ایک معزز شخصیت اور ذی علم انسان تھے وہ اسلوب صاحب کے بے حد قائل اور مداح تھے، وہ ان کا ذکر بڑی عقیدت و محبت سے کیا کرتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس پورے عرصے میں اسلوب صاحب سے براہِ راست میرا کوئی رابطہ نہیں رہا، تاہم ان کی تحریروں کی جستجو ہمیشہ رہتی تھی جن کو پڑھ کر بڑی سرشاری اور تقویت کا احساس ہوتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ میرے اندر کبھی اتنی ہمت ہی نہ پیدا ہوئی کہ میں براہ راست ان کے رابطے میں آسکتا۔ وہاں شعبہ جات کے صدور سے ملنا جلنا یوں بھی کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس لیے میں ان سے بالمصافحہ حسرت کی جست لیے ملازمت ملنے پر دہلی آگیا تاہم یہاں جامعہ میں جب میں (مرحوم) پروفیسر نقی حسین جعفری صاحب کے رابطے میں آیا جو یہاں انگریزی میں استاد تھے تو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ جعفری صاحب بھی علی گڑھ ہی کے تعلیم یافتہ ہیں اور اسلوب صاحب ان کے استاد رہے ہیں۔ ہم دونوں کی رہائش گاہ بھی آس پاس ہی تھی اس لیے رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کے دوران ہماری گفتگو کا محور اکثر علی گڑھ ہی رہتا تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے تجربات سنا کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ جعفری صاحب بھی اسلوب صاحب کے تبحر علمی اور علائق دنیا سے بے نیازی کے بڑے مداح اور معترف تھے۔ جب میں جامعہ کے شعبہ اردو کا صدر ہوا تو ایک موقعہ آیا جب میری نگرانی میں ریفریشر کورس کے کچھ لیکچرز ہونے تھے۔ میری خواہش ہوئی اور میں نے جعفری صاحب سے ذکر کیا کہ وہ اگر دو ایک لیکچرز کے لیے اسلوب صاحب کو دہلی آنے پر رضامند کرلیں تو بہت اچھا ہو۔ میری اس تجویز پر پہلے جعفری صاحب نے، پھر میں نے بڑی ہمت کر کے اسلوب صاحب سے فون پر لیکچر کے لیے مودبانہ درخواست کی۔ پہلے انھیں اپنی مصروفیت کے باعث کچھ تامل تھا لیکن ہم لوگوں کے پیہم اصرار پر وہ راضی ہوگئے۔ مجھے ذاتی طور پر بڑی مسرت ہوئی اور ہمارے شعبے کے رفقا بھی اس خیال سے بہت خوش ہوئے۔ اسلوب صاحب حسب وعدہ جامعہ تشریف لائے۔ میری ان سے بالمصافحہ ملنے کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ ان کے چہرے پر میں نے اس وقت جیسی طمانیت اور شگفتگی دیکھی وہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ لیکچر ہال میں ان کے رسمی تعارف کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا۔ نظریاتی اور اطلاقی تنقید کے موضوع پر اسلوب صاحب نے پورے ایک گھنٹہ تک بے تکلفی، اور نہایت سرشاری کے علاوہ جس علمی سطح سے گفتگو کی ان کی زبان سے نکلا ہر ہر لفظ آب زر سے لکھنے کے لائق تھا۔ پورے ایک گھنٹے تک بولتے رہنے کے باوجود ان پر تھکن کے آثار نہ تھے۔ میں مزید ایک اور لیکچر کی گزارش کرنا چاہتا تھا لیکن انھیں چونکہ شعبۂ انگریزی میں بھی اظہار خیال کرنا تھا اس لیے ہم لوگ مزید استفادے سے محروم رہ گئے، اسی روز شام کو انھیں علی

گڑھ واپس بھی جانا تھا اور وہ چلے گئے۔

کچھ عرصے بعد میری درخواست پر ایک بار پھر ہمارے شعبے کو ان کی ضیافت کا شرف حاصل ہوا۔ ایک جلسہ عام جس میں طلبا کے علاوہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور اہل علم کے روبرو اسلوب صاحب نے اقبال کی شاعری پر معرکۃ الآرا خطبہ پیش فرمایا، اس کی یادیں بھی کبھی حافظے سے محو ہونے والی نہیں ہیں۔ اس اہم خطاب کی صدارت جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے فرمائی اور معزز مہمانوں کے تعارف کا فریضہ پروفیسر سید تقی حسین جعفری نے انجام دیا۔

اس ملاقات کے بعد میرے اندر کسی قدر ہمت پیدا ہوگئی میں خیریت دریافت کرنے کے لیے گاہے بہ گاہے اسلوب صاحب کو فون کرنے لگا اور ہر بار یہی محسوس کیا کہ ان کی کم سخنی نے انھیں بہت کم بولنے دیا، زیادہ تر میرے استفسار کا جواب ہی دینے پر اکتفا کرتے تھے۔ البتہ ایک بار مجھے یہ سعادت مزید حاصل ہوئی جب میں دہلی سے ان کے ہمراہ کار سے علی گڑھ گیا، اس سفر میں ان کے داماد پروفیسر نفیس صاحب بھی تھے۔ اسلوب صاحب یہاں دہلی آنکھ کے علاج کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔ اس تین چار گھنٹے کے سفر میں بھی ان کی متانت، طبعی شرافت اور نیکیِ طینت سے حددرجہ متاثر ہوا۔ کچھ عام دلچسپی کی باتیں انھوں نے ضرور کیں تاہم ایک کمزوری جس پر اکثر لوگ قابو نہیں پاتے یعنی کسی شخص کے بارے میں کوئی سبک بات اس پورے سفر میں ان کی زبان سے نہیں سنا۔ جب علی گڑھ کے حدود میں گاڑی داخل ہوگئی تو بجائے اس کے کہ وہ براہ راست اپنے گھر چلے جاتے، یونیورسٹی کی اقامت گاہ جہاں میرے ٹھہرنے کا انتظام تھا وہاں تک میرے ہمراہ تشریف لائے اور مجھے الوداع کہہ کر اپنے گھر تشریف لے گئے۔

اس کے بعد میرا یہ معمول ہوگیا کہ میں اکثر فون پر ان کی خیر و عافیت معلوم کرتا رہتا تھا۔ لیکن جب کبھی ان سے دہلی آنے کی درخواست کرتا تھا تو وہ خوش ضرور ہوتے تھے لیکن کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے اس سعادت سے مجھے محروم کر دیتے تھے۔ اس اثنا میں ان سے تھوڑی سی خط و کتابت بھی رہی۔ ان کے خطوط میرے پاس اب بھی محفوظ ہیں۔ اسلوب صاحب نے مجھ ناچیز کی کتاب 'شعریاتِ اقبال' پر اپنے وقیع رسالہ 'نقد و نظر' میں تبصرہ بھی کیا۔ انھوں نے ایک استاد کی حیثیت سے میری نارسائی، لغزشوں اور تسامحات کو نشان زد فرما کر میری رہنمائی فرمائی۔

یہ محض اتفاق اور میری خوش بختی تھی کہ ایک بار اسلوب صاحب سے میری ملاقات لکھنؤ میں ہوگئی۔ وہاں اطہر نبی صاحب نے ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کی جانب سے اقبال پر ایک سمینار کیا تھا جس میں اسلوب صاحب کو بطور خاص مدعو کیا تھا۔ میں نے بھی اس سمینار میں اقبال پر اپنا مضمون پیش کیا تھا۔ جس ہوٹل میں اسلوب صاحب ٹھہرے تھے اتفاق سے اسی میں میرا بھی قیام تھا۔ رات میں تو اس خیال سے کہ پورے دن کی مصروفیت کے سبب اسلوب صاحب تھک گئے ہوں گے میں ان کے کمرے میں نہیں گیا۔ تاہم صبح ناشتے سے پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو بڑی محبت سے ملے اور لطف و کرم کا مظاہرہ کیا۔ میں دراصل ان کی خدمت میں ایک درخواست لے کر حاضر ہوا تھا۔ وہاں لکھنؤ میں ایک فیملی تھی جس کا عطریات کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ ان سے میرے بہت بے تکلفی کے مراسم تھے۔ لکھنؤ میں ان کا بہت شاندار مکان اور نہایت پرتکلف رہن سہن تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ناشتہ ان کے گھر پر کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں خود بھی آؤں گا اور کوشش کروں گا کہ میں اپنے مربی اور محسن اسلوب صاحب کو بھی اپنے ساتھ لانے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ میں نے ڈرتے ڈرتے اسلوب صاحب سے اپنی خواہش کا اظہار کیا بلکہ قدرے اصرار کیا کہ میزبان کی عزت افزائی کی خاطر درخواست مسترد نہ فرمائیں۔ میری درخواست اسلوب صاحب نے قبول فرمالی۔ صاحب خانہ نے گاڑی مع ڈرائیور بھیج دی تھی۔ ہم دونوں وہاں پہنچے تو اسلوب صاحب وہاں کی آرائش و زیبائش، شاندار کوٹھی اور قیمتی فرنیچر وغیرہ دیکھ کر نہ جانے کیا سوچنے لگے۔ وہاں پورا گھر ہماری میزبانی کا شرف حاصل کرنے کے لیے باہر موجود تھا۔ اسلوب صاحب سب سے فرداً فرداً ملے۔ سب کے ساتھ ناشتہ کیا اور بہت خوش ہوئے۔ چلتے ہوئے صاحب خانہ نے ہم لوگوں کو بہت عمدہ عطر کا تحفہ بھی پیش کیا۔ اسلوب صاحب کو حضورؐ کی سنت کی اتباع میں عطر بہت پسند تھا۔ اس تحفے سے بہت خوش ہوئے اور شکریہ ادا کر کے قبول کرلیا۔

اسلوب صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ پھر بفضلہٖ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ علی گڑھ جب بھی جانا ہوتا تو اگر وقت ہوتا تو میں کوشش کرتا تھا کہ ان کی خدمت میں ضرور حاضری دوں۔ ان کا کرم تھا کہ وہ بڑی پابندی سے اپنی کتابیں میرے مطالعے اور استفادے کے لیے بذریعہ ڈاک بھجوایا کرتے تھے۔ اسلوب صاحب کے دولت کدے پر میری آخری ملاقات ان کی بیماری کے دنوں میں دو برس قبل ہوئی تھی۔ اس وقت میرے ساتھ میرے صاحب زادے قاضی امان الرحمٰن بھی تھے جن کی عمر اس وقت مشکل سے چودہ برس ہوگی۔ اسلوب صاحب اور محترمہ بیگم صاحبہ دونوں ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بڑی شفقت اور پذیرائی فرمائی۔ اس ملاقات میں بھی ازراہ عنایت اقبال پر اپنی ایک کتاب مجھے عنایت فرمائی۔ پچھلی عید کے موقعے پر میں نے فون کیا تو خود ہی فون اٹھایا۔ بتایا کہ موسم خراب تھا، اس کے باوجود کسی طرح یونیورسٹی کی مسجد میں جا کر نماز ادا کی تاہم اس کا افسوس بھی کیا کہ بینائی کی پریشانی کے سبب اب صبح اٹھ کر سیر کے لیے جانا تقریباً بند ہوگیا ہے۔ ابھی چند ماہ قبل اسلوب صاحب کی بیٹی پروفیسر عفت آرا کے مضامین و تراجم پر مشتمل بڑی عمدہ کتاب 'نشیب و فراز' پر میرا ایک قدرے تفصیلی تبصرہ شائع ہوا تھا۔ مجھے پروفیسر عفت آرا نے بتایا کہ انھوں نے میرا پورا تبصرہ اسلوب صاحب کو پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے ازراہ لطف و کرم کافی پسند فرمایا اور تعریف کی۔ اسلوب صاحب کے انتقالِ پُرملال سے چند ماہ قبل اس ناچیز کے لیے ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات میرے لیے یقیناً بڑے اعزاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلوب صاحب گرچہ صلہ و ستائش سے ہمیشہ دامن کش رہے، اپنی شرائط پر زندگی بسر کرنے کے ماسوا آخری سانس تک اپنے علمی و اخلاقی موقف پر گامزن رہتے ہوئے علمی و ادبی سرگرمیوں میں عبادت کی حد تک منہمک اور سرگرم رہے تاہم جب ان سے عقیدت اور محبت کرنے والے کچھ اہل قلم نے ان کے بارے میں ایک تہنیتی مجلّہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس ناچیز نے بھی اقبال اور غالب پر ان کی گراں قدر خدمات کا حتی المقدور محاکمہ کرنے کی غرض سے ایک مضمون تحریر کیا جو اسلوب صاحب کو نذر کی گئی کتاب میں شامل ہے۔ اسلوب صاحب ہمارے ان اکابر اہل نظر میں ہیں جنھوں نے بیک وقت اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا ہے اور مسلسل لکھا ہے اور اس حقیقت سے کون واقف نہیں ہے کہ وہ اقبال کے ان شیدائیوں میں تھے جنھوں نے برصغیر میں سب سے بڑھ چڑھ کر ان کی شاعرانہ عظمت، صلابت فکر اور لازوال فنی بصیرت کو جس طرح پورے علمی وقار اور استناد و استدلال کے ساتھ واضح کیا ہے اس کی کوئی دوسری نظیر ڈھونڈ پانا بہت مشکل ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو خلد بریں میں اعلیٰ مقام مرحمت فرمائے۔ آمین!

■

Qazi Obaidur Rahman Hashmi
B-10, 2nd Floor, Okhla Vihar,
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 25
Mob.: 09990893596,
E-mail.: quazi_obaid@yahoo.com

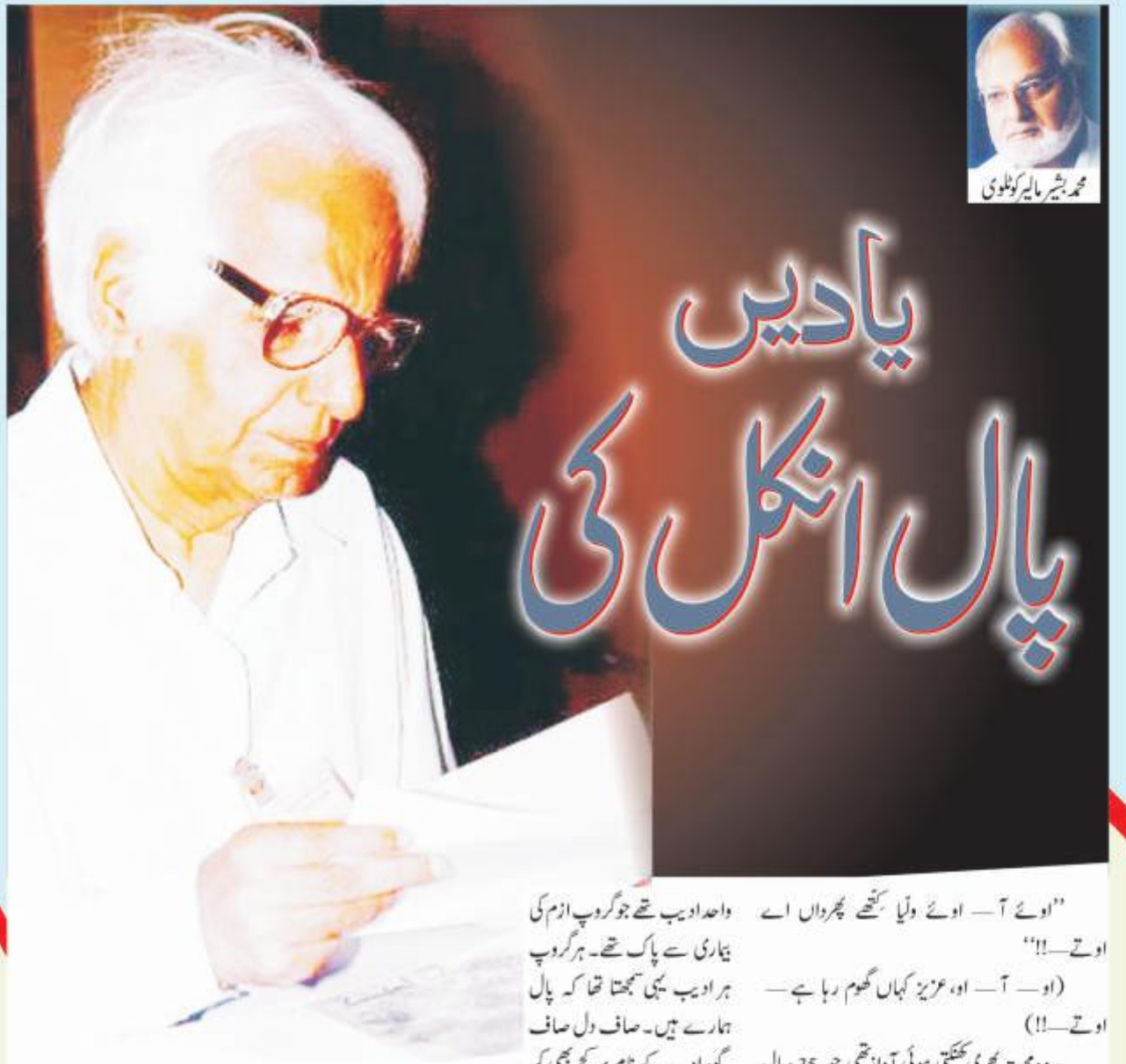

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

یادیں پال انکل کی

''اوئے آ— اوئے ولیا کتھے پھرداں اے اوتے—!!''

(او— آ— او، عزیز کہاں گھوم رہا ہے— اوتے—!!)

یہ وہ محبت بھری کھنکتی ہوئی آواز تھی جو 35 سال پہلے میرے کانوں میں سمائی تھی جس کی گونج آج بھی میں اپنی روح کے اندر محسوس کرتا ہوں۔ پنجابی زبان کا یہ کھلے دل سے نکلا ہوا مکالمہ بہت ہی پیارے انسان جوگندر پال جن کو میں پال انکل کہا کرتا تھا والہانہ میرے لیے ادا کیا کرتے تھے۔ جب وہ کسی ادبی تقریب میں اچانک مجھے دیکھ لیا کرتے تھے۔ پال انکل جن کو میں اکثر و بیشتر اسٹیج سے کہانی کے بھیشم پتامہ کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا، زندگی سے لڑتے لڑتے ہم سے بہت دور چلے گئے پوری امید ہے کہ اُن کے ساتھ ان کی کہانیوں کے کردار بھی روتے بلکتے اپنے لفظی جسم چھوڑ کر ان کے ساتھ ہی چلے گئے ہوں گے۔ پال انکل عادتاً، فطرتاً ایک درویش تھے۔ سادہ پہننا سادہ کھانا، سب کو برابر محبت بانٹنا۔ وہ ہندوستان کے شاید واحد ادیب تھے جو گروپ ازم کی بیماری سے پاک تھے۔ ہر گروپ ہر ادیب یہی سمجھتا تھا کہ پال ہمارے ہیں۔ صاف دل صاف گو، ادب کے نام پر کچھ بھی کر گزرنے والے جوگندر پال۔ میرا فون جاتا کہ انکل مالیر کوٹلہ میں ہم اردو افسانے کا ایک فنکشن کرنے جا رہے ہیں، آپ کو آنا ہے۔ جواب ملتا یار بشیر ولیا آج کل طبیعت خراب رہتی ہے۔ معاملہ افسانے کا اور پنجاب کا ہے۔ چل— آجاؤں گا۔ پر ساتھ میں تیری آنٹی کو بھی لے آؤں گا—!''

سفر کی صعوبتیں اٹھاتے— آجایا کرتے تھے—

پال انکل سے میری ذاتی ملاقات 1983 میں ادبی سنگم فرید آباد کی ایک نشست میں ہوئی۔ فرید آباد سے ان دنوں ان کو خاص شغف تھا۔ ان کے دوست، معروف افسانہ نگار اور شاعر ہیرانند سوز، اوم پرکاش، راحت اور ستیش بترہ فرید آباد میں رہائش پذیر تھے، معروف شاعر ساحر ہوشیار پوری بھی وہیں مقیم تھے۔ شاعری اور افسانے کا وہاں بہت اچھا ماحول تھا، فرید آباد ویسے بھی دہلی کے نزدیک واقع ہے اور پال انکل کا لکا جی میں رہائش پذیر تھے۔ یہ بات میں نے محسوس کی کہ پال انکل پنجاب اور پنجابیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ سوز صاحب، راحت صاحب، بترہ صاحب اور ساحر صاحب چاروں پنجابی ہیں۔ لکھنؤ سے رام لعل چلے آتے تھے اور کسی خاص تقریب میں امرتسر سے شرون کمار ورما بھی چلے آتے تھے۔ دہلی میں ویسے تو ہر ادیب شاعر پال انکل کا اپنا تھا مگر فکر تونسوی اور دیوان سریندر ناتھ سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔ دلیپ سنگھ، مجتبیٰ صاحب اور نصرت ظہیر سے بھی ان کا خاص شغف تھا۔ پنجاب سے آزاد گلاٹی سے بھی ان کی

گہری دوستی تھی۔

1982 میں ملازمت کے سلسلے میں میرا تبادلہ فرید آباد ہوگیا تھا۔ اُس وقت میری عمر 33 سال رہی ہوگی۔ پنجاب کا کم عمر افسانہ نگار ہونے کے ناطے پال انکل میرے لیے بہت مخلص تھے۔ مجھے دیکھ کر اکثر کہا کرتے تھے کہ بشیر تم پنجاب میں افسانہ نگاری کی روایت کو قائم رکھو گے، اور میں آج تک اسی کوشش میں ہوں کہ میں منٹو بیدی اور قاسمی کی اس سرزمین پہ اس روایت کو زندہ رکھ سکوں۔ میں نے زندگی میں پال انکل سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ الفاظ کے سمندر تھے۔ افسانے کے حوالے سے جب وہ بولنا شروع کرتے تو بولتے ہی چلے جاتے۔ جیسے افسانہ کہانی کا کوئی آسیب ان میں سما گیا ہو۔ کئی بار افسانے کی باریکیوں کے بارے میں مختلف جرائد میں ان کے مضامین چھپتے تو ان کی کاپی مجھے دے کر کہتے اسے پڑھو اور جانو افسانہ کیا ہے۔ کہا کرتے تھے بشیر یہ احتجاج۔ یہ غصہ سنبھال کر رکھو اسے پالو یہ تمھارے کام آئے گا۔ میں وقت نکال کر اکثر و بیشتر ان کی رہائش گاہ کالکا جی جاتا رہتا تھا۔ جہاں وہ گھنٹوں ادب کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے۔ وہ مجھ سے بہت مانوس تھے۔ مجھے بیٹے کی طرح مانتے تھے۔ ایک بار ہم سب فرید آباد کی ہی ایک محفل میں بیٹھے تھے۔ تو کہنے لگے: بشیر مالیر کوٹلہ میں کوئی ادبی انجمن بناؤ۔ مل بیٹھ کر ایک دوسرے کو سننا اور سنانا بہت اچھی بات ہے۔ مجتبیٰ بھائی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تو مجھے تحریک ملی۔ 1984 میں میں نے مقامی شاعر پروفیسر محمود عالم اور افسانہ نگار انوار انجم کی مدد سے انجمن القلم بنائی جس کا واحد مقصد فروغ افسانہ تھا۔ القلم کے سالانہ اجلاس کے موقعے پر جو اپریل 1985 میں منایا گیا۔ جوگندر پال ہمراہ آنٹی کرشنا پال، رفیعہ منظورالامین ہمراہ منظورالامین صاحب، قبلہ فکر تونسوی، ستیش بترہ، ہیرانند سوز، اوم کرشن راحت، خاص طور پر مالیر کوٹلہ تشریف لائے۔ مہمان خصوصی اُس وقت کے ڈپٹی کمشنر تھے اور صدارت محترمہ ساجدہ بیگم ایم ایل اے (مرحومہ) کی تھی۔ جلسے کی ناکام نظامت کیول دھیر نے کی تھی جو یونانی آیورویدک کے ڈاکٹر ہیں۔ پال انکل مالیر کوٹلہ کے ماحول کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سنہ 2000 میں ہم نے افسانہ کلب کی بنیاد ڈالی۔ اور نئی نسل کی آبیاری کا کام شروع صرف اور صرف افسانہ کے حوالے سے سنہ 2002 میں افسانہ کلب کی جانب سے منٹو ایوارڈ جاری کیا گیا جو اُس وقت پنجاب کی عظمت شرون کمار ورما کو دیا گیا۔ گو پال انکل کی طبیعت ان دنوں بہتر نہ تھی۔ میرے فروغ

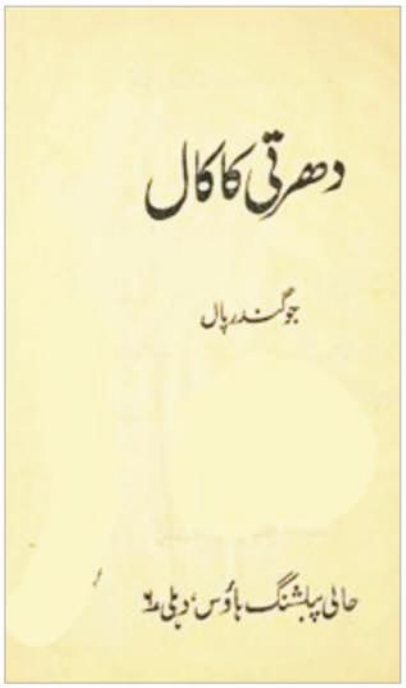

افسانہ کے کام سے وہ بہت خوش تھے وہ آنٹی کے ہمراہ 2002 میں مالیر کوٹلہ تشریف لائے اور اپنے ہاتھوں سے انھوں نے منٹو ایوارڈ ورما جی کو دیا۔ فنکشن کے اگلے روز ہم نے نوجوان افسانہ نگاروں کے لیے پال انکل کا ایک پرمغز لیکچر رکھا جس سے ہم سب فیضیاب ہوئے۔ میں 1986 سے 1988 تک سونی پت میں رہا۔ وہاں کی ادبی انجمن نے دن کا اجلاس مجھے سونپ دیا جس میں افسانے اور طنز و مزاح کے مضامین سنائے جاتے، تقریباً تین سو آدمیوں کو افسانے سنائے۔ رات کو مشاعرہ ہوتا۔ دن کے پروگرام میں پال انکل ہر سال میری دعوت پر آتے رہے۔ ان کے ہمراہ سونی پت میں دیوان بیریندر ناتھ، شرون کمار ورما، مجتبیٰ حسین صاحب، دلیپ سنگھ، نصرت ظہیر، قمر رئیس، ہیرانند سوز، اوم کرشن راوت وغیرہ آتے رہے۔ پال انکل حیران ہوکر مذاق میں کہتے ''یار بشیر— توں کِداں تین سو بندے اکٹھے کر لینا ہے کمال ہے!، کہانیاں وی بڑی خاموشی نال سن دے ہن—!''

2005 کے بعد میں پنجاب میں ہی رہا۔ دہلی کا فاصلہ کافی بڑھ گیا تھا۔ پال انکل بھی سفر کرنے سے گریز کرتے تھے۔ پھر وہ مالیر کوٹلہ نہ آسکے۔ میں بھی دہلی کی طرف نہ جاسکا۔ ایک دوبار مجھے میرٹھ میں ملے اُن کا گلہ ہی رہا کہ میں اُن سے ملتا نہیں۔ پال انکل بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ میں نے اُن کے منہ سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں درویش صفت انسان تھے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا کہانی تھا۔ اُن کی ایک بات میں کبھی نہیں بھول پاتا وہ کہا کرتے تھے بشیر کردار کے منہ میں اس کی اوقات کے مطابق زبان رکھا کرو۔ کردار کے مزاج کے خلاف اس کے منہ میں زبان رکھو گے تو مر جاتا ہے اور اُس کی موت کا ذمے دار افسانہ نگار خود ہوتا ہے۔ اُن میں ایک صفت یہ تھی کہ کوئی کتنا ہی گھٹیا لکھے کبھی اُس کو برا نہیں گردانتے تھے۔ کہتے تھے او یار— کچھ کر تو رہا ہے نا وہ بھی اردو زبان میں۔

ان کے دل میں سب کے لیے جگہ تھی۔ وہ سب سے محبت کرتے تھے۔ وہ جس ماحول میں سانس لیتے اُسے اپنا بنا لیتے۔ سیالکوٹ (پاکستان) اُن کا وطن تھا جہاں کی مٹی کا وہ خمیر تھے۔ تقسیم کے بعد وہ انبالہ آگئے۔ وہ اس بات کو عیاں کرتے ہوئے کبھی برا محسوس نہیں کرتے تھے کہ انھوں نے انبالہ میں دودھ کا کام کیا۔ وہ سائیکل پر گاؤں گاؤں گھوم کر دودھ لے کر آتے۔ اُن کے مطابق وہ روزانہ تیس چالیس کلومیٹر سائیکل چلاتے تھے۔ انبالہ میں ہی وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئے اور افریقہ چلے گئے۔ نیروبی سے وہ کینیا گئے وہاں سے پھر وہ بھارت لوٹ آئے۔ حیدرآباد میں ان کو لیکچرار کی نوکری ملی مگر وہ اورنگ آباد میں چلے گئے جہاں وہ پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ایک لمبے عرصے تک وہ اورنگ آباد رہے۔ یہاں کے لوگوں نے ان کو بہت پیار اور عزت دی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ پال انکل کی ایک لمبے عرصے تک اورنگ آباد میں موجودگی ہی وجہ رہی کہ اورنگ آباد میں افسانچوں کی فصل زیادہ ہوتی ہے۔ میرے بھائی ڈاکٹر عظیم راہی تو افسانے کی جائے پیدائش اورنگ آباد کو ہی ٹھہراتے ہیں صرف پال انکل کی وجہ سے میں کہتا ہوں پال ہمارے پنجاب کے تھے۔ وہ کہیں بھی رہ کر افسانچے تخلیق کرتے نام تو پنجاب کا ہی ہوگا۔

مغرب سے تحریک پا کر استاد منٹو نے 'سیاہ حاشیے' کی تخلیق کی بلاشبہ 'شمع' اور 'روبی' نے افسانچے کو پرموٹ کیا۔ افسانچے کو افسانچے کا نام جوگندر پال نے ہی دیا اور انھوں نے افسانچوی ادب کی خوب خدمت کی۔ اُن کی سیریل تخلیق رحمٰن بابو بھی افسانچے کی ہی ایک شکل ہے۔ یادیں بہت ہی زیادہ ہیں وقت کم ہے۔ اتنا کہہ کر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ دنیا میں دوسرا جوگندر پال پیدا ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

■

Mohd Bashir Malerkotlvi
Retd. Estate Officer, Near Urdu Academy
8/8 Manto Street, OS Delhi Gate
Malerkotla - 148023 (Pb)

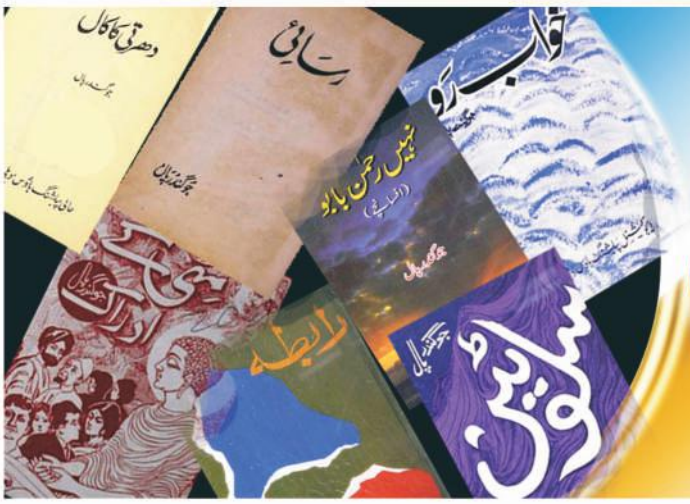

جوگندر پال کا تخلیقی کمال

اسلم جمشید پوری

جوگندر پال کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو آزادی کے آس پاس سے لکھ رہے ہیں اور جنھوں نے اُردو افسانے کے سفر میں بہت زیادہ نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ کبھی اس نشیب و فراز کا حصّہ بنے اور کبھی خاموش تماشائی بنے رہے۔ ترقی پسند تحریک کا عروج، پال کے بھی شباب کا عہد تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے متوازی کچھ افسانہ نگار بالکل منفرد انداز میں افسانے تخلیق کر رہے تھے اور اچھے افسانے لکھ رہے تھے، افسانہ نگاروں کے اسی گروہ میں جوگندر پال بھی شامل ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک، برائے تحریک اور تشہیر ہوکر رہ گئی۔ ایسے میں وقت کے بطن سے جدیدیت کی تخلیق ہوئی۔

ایک لہر آئی اور سب کچھ بدل گیا۔ اُردو افسانے میں خارجیت سے داخلیت اور اجتماعیت سے انفرادیت کا سفر شروع ہوا۔ افسانے کی ساخت بھی متاثر ہوئی۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے اثرات قبول کیے۔ جوگندر پال بھی اس سے متاثر ہوئے لیکن انھوں نے اسے کلی طور پر نہیں اپنایا۔ کچھ افسانوں میں یہ اثر نمایاں ہوا لیکن اپنا مخصوص انداز پھر بھی حاوی رہا۔ یہ عہد بھی گزر گیا۔ افسانے نے نئی کروٹ لی۔ جسے کچھ لوگ مابعد جدید افسانہ کہتے ہیں، کچھ ۷۰ء کے بعد کا افسانہ وغیرہ۔ پال یہاں بھی نئی نسل کی مناسب رہنمائی کے لیے آگے آئے اور جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مابین پل کا کام انجام دیا۔

جوگندر پال کا پہلا افسانوی مجموعہ 'دھرتی

کے لال' 1961 میں منظرِ عام پر آیا۔ پھر 'میں کیوں سوچوں؟' 1962 میں، 'رسائی' 1963 میں، 'مٹّی کے ادراک' 1971 میں 'لیکن' 1977 میں 'بے محاورہ' 1978 میں 'بے ارادہ' 1981 میں اور منی کہانیوں کے مجموعے 'سلوٹیں' اور 'کتھا نگر' بالترتیب 1975 اور 1986 میں شائع ہوئے۔

جوگندر پال نے اپنی ابتدائی زندگی کا بڑا حصّہ افریقہ میں گزارا۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'دھرتی کے لال' میں افریقہ کی زندگی اور وہاں کے لوگوں کے مسائل کو موضوع بنا کر لکھے گئے کئی افسانے شامل ہیں۔ 'دھرتی کے لال' اور 'ملٹی ریشیل' اس ضمن کے نمائندے افسانے ہیں، اس میں افریقی زندگی کے نشیب و فراز کی بہترین عکاسی موجود ہے۔

'میں کیوں سوچوں' کے بیشتر افسانے آزادی کے بعد کے ماحول، انسانی اقدار کی شکست و ریخت، جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے اثرات اور فرد کی داخلی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ 1963 میں 'رسائی' کی اشاعت ہوئی۔ بعض افسانوں میں جدیدیت کی بو موجود تھی۔ تجرید، علامت اور ابہام جیسے اوصاف بھی در آئے تھے۔ ایسے افسانوں میں رسائی، بھوں بھاں، دوسری کایا کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

جوگندر پال کا گہرا مشاہدہ اور عمیق مطالعہ انہیں جلد ہی جدیدیت کے اس سیلاب سے باہر نکال لایا۔ ہجرت اور فسادات کے دیرپا اثرات، سماج میں ہونے والے معاشی، سیاسی اور سماجی تغیر اور وقت کے ساتھ ساتھ، پامال ہوتی اخلاقی قدروں نے انہیں متوجہ کیا۔ 1965 کی جنگ اور اس کے اثرات، زوال پذیر معاشرے کے شب و روز کا مشاہدہ انھوں نے کھلی آنکھوں سے کیا۔ پال کے عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے نے انہیں فکری سطح پر مفکّر بنا دیا۔ ایسا مفکر جو ظہور پذیر ہونے والے واقعات کو صرف سوچتا نہیں بلکہ ان میں ڈوب جاتا ہے۔ پال بھی زندگی کی اعلیٰ قدروں کی پامالی کا صرف نوحہ تحریر نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے اندر شدت سے محسوس کر کے الفاظ کا پیکر عطا کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے اس کرب کے مظہر ہیں۔ بازیافت، پھول، بابا، بستیاں اور ایک طویل کہانی کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

جیسے جیسے زندگی کی ترجیحات بدلتی گئیں، پال کے فکری رجحان میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ نئی تہذیب، فلیٹ کلچر کے نام پر روایتی اقدار سے یکسر انحراف، خود کو خود مختار سمجھنا، برائیوں کو بُرا نہ سمجھنا، انسانیت کا دم توڑنا، یہ سب پال کو متاثر کرتا ہے اور ان کی کئی کہانیوں میں اس کا اظہار بھی ملتا ہے۔ وہ روایت اور اقدار کی پامالی پر آواز بلند تو کرتے ہیں لیکن نئی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس زمرے میں ان کے افسانے بیک لین، خدارا، جوگن، تہیں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

'رامائن' جوگندر پال کا ایک مشہور افسانہ ہے۔ اس میں پال نے اساطیر کو موضوع بنایا ہے۔ 'رامائن' کے واقعات کو ہم عصر زندگی سے ملاتے ہوئے ہم عصر زندگی کے کرداروں کی نقاب کشائی کی ہے۔ دسہرہ کے موقع پر راون، میگھ ناد اور کنبھ کرن کے پتلے جلائے جاتے ہیں اور اس عمل کے پیچھے صرف ایک ہی ذہنیت کام کرتی ہے کہ ایسا کر کے ہم برائی کا خاتمہ کر رہے ہیں اور اس میں وہ لوگ آگے آگے ہوتے ہیں جو خود برائی میں ملوث ہوتے ہیں۔ راون کا خاتمہ، رام نے اس وقت کیا تھا جب راون کے بھائی وبھیشن نے راون کی موت کا راز اسے بتا دیا تھا۔ پال نے اپنی کہانی میں ان واقعات کے پس منظر میں دسہرہ کے موقع پر ہونے والی رام لیلاؤں میں سیتا اور رام کے کردار نبھانے والوں کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ یہ رام بابو نام کے کلرک کی کہانی ہے۔ جو اپنی ذاتی زندگی میں شیطان صفت ہے اور ہر سال رام لیلا میں رام کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی بیوی اس کی دوہری زندگی سے دکھی ہے، وہ اسے بُرا سمجھتی ہے اور اس حد تک بُرا خیال کرتی ہے کہ یہ بھی خواہش کرتی ہے۔

''کاش میں کسی راکشس کے پلّے بندھی ہوتی۔ اس کے پلّے بندھنے پر تو میرے بھاگ ہی پھوٹ گئے۔'' (رامائن)

دراصل پال نے کہانی کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کی سیتا، رامائن والی سیتا نہیں۔ آج ان چھوٹی، بھولی بھالی، معصوم اور پاکیزہ سیتا جیسی لڑکی کا تصور ناممکن نہیں تو مضحکہ خیز ضرور ہے۔ آج کے رام بھی ان اوصاف سے خالی ہیں بلکہ آج کے رام اور سیتا اعمال کے لحاظ سے راون، کنبھ کرن اور وبھیشن سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جوگندر پال کی کہانی، 'رامائن' الفاظ کی سطح پر انتہائی سادہ اور عام ہے لیکن کہانی اپنی تہوں میں مختلف معانی کے جواہر پارے رکھتی ہے۔ عصری سماج کی بہترین عکاسی کا نمونہ ہے۔

پال کے فکری رجحان نے عصری تہذیب کی روح کو قریب سے محسوس کرنے کے بعد اس سے تاثر لیا ہے۔ شہروں کی زندگی، خاص کر فلیٹ کلچر میں مہذب زندگی کی آڑ میں کیا کیا گل کھلتے ہیں، یہ وہ اپنی کہانی 'بیک لین' میں بڑی چابکدستی سے بیان کرتے ہیں۔ یہ کہانی دراصل سماج کی حقیقتوں کی آئینہ دار ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار صیغۂ واحد متکلم ہے جو کوڑا کرکٹ بیننے کا کام کرتا ہے، وہ روزانہ پاش کالونی کی پچھلی گلیوں میں رکھے کوڑے کے ڈبوں میں سے اپنے کام کی چیزیں چنتا ہے اور شام کو لا کر منو کباڑیے کو دے دیتا ہے، جو اسے کچھ پیسے تھما دیتا ہے۔ کوڑے میں اسے سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے، شراب کی بوتلیں، کھانا، پلاسٹک کا سامان وغیرہ مل جاتا ہے اور وہ اس سے اپنی زندگی بسر کر رہا ہے۔ کہانی کار نے اپنے کردار کے ذریعہ اس بڑی کالونی کے گھروں میں جھانکنے کا کام کیا ہے اور ان گھروں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ایک گھر میں دو بھائی ہیں۔ ایک ذرا پاگل سا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی بیویوں کا استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ماں بیچاری مکان کے سب سے اوپری حصّے میں پڑی کھانے کی خاص کر کھیر کی رٹ لگائے ترستی رہتی ہے اور ان کے نوکر، کوڑے دان میں اتنا کھانا ڈال دیتے ہیں جس سے کئی آدمیوں کے پیٹ کی آگ بجھائی جاسکتی ہے لیکن دونوں بھائیوں کو اس کی فکر نہیں اور وہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ ایک اور گھر کا حال یہ ہے کہ شوہر ادیب ہے، راتوں کو جاگ جاگ کر کاغذ سیاہ کرتا رہتا ہے اور عین اسی وقت اس کی بیوی اپنے نوکر کا بستر گرم کرتی ہے۔ ایک اور گھر کا حال کچھ اس طرح ہے کہ بیوی ہوٹلوں میں دھندہ کرتی ہے اور شوہر اس کے گھر آنے کا بے صبری سے انتظار کرتا ہے اور آنے پر اس کے بیگ پر جھپٹتا ہے، اسے صرف پیسے سے مطلب ہے۔

جوگندر پال نے اپنی فنکارانہ آنکھ سے سماج کے اعلیٰ طبقے کے سفید پوش لوگوں کے گھروں میں ہونے والے شرمناک افعال کی تصویر کشی کی ہے۔ طنز کے تیر کہانی کو گہرائی بخشتے ہیں:

''تم بدمعاشوں کو خوب جانتا ہوں۔ خالی جھولا لٹکائے موقع کی تاک میں گھومتے پھرتے ہو۔'' یہ بات اس کی جھوٹی بھی نہیں مگر سبھی لوگ یہی تو کرتے ہیں۔ ہر ایک اپنے دل میں جھولا لٹکائے اسی تاک میں مارے مارے پھرتا رہتا ہے کیا معلوم، کیا کیا ہاتھ آجائے۔''

''بھاگ جاؤ، ورنہ خون پی جاؤں گا۔''

''میں یہ سوچتے ہوئے آگے ہولیا ہوں کہ ہزار غصّے کے باوجود جنگلی جانور بھی پیّں تو پانی ہی پیتے ہیں، پھر آدمی کیوں اپنا پارہ چڑھتے ہوئے آدمی کے لہو کا پیاسا ہوجاتا ہے؟''

''بابو (کتا) کو اس کا نام میرا ہی دیا ہوا ہے اور کچھ

دینے کو میرے پاس ہے کیا؟ یہاں کے نوکروں اور کتوں کو بابو کہہ کر بلاتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔'' (بیک لین)

پال کا یہ افسانہ سماجی حقیقت نگاری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ کہانی میں کردار نگاری بھی خوب ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار پال کے فن کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ پال نے 'بیک لین' کے ذریعہ سماج کی بیماریوں کو آئینہ دکھایا ہے۔

جوگندر پال کے یہاں فنّی تغیر بھی ملتا ہے۔ انھوں نے منٹو کے 'سیاہ حاشیے' کے انداز پر منی کہانیوں (افسانچوں) کے دو مجموعے 'سلوٹیں' اور 'کتھا نگر' دیے۔ ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں کہانی پن کے علاوہ اسلوب کی ندرت بھی ہے اور کہیں کہیں طنز کا استعمال ان افسانچوں کو پر اثر بنا دیتا ہے۔ ایک افسانچہ 'بھوت' ملاحظہ ہو:

بھوت

''چند بھوت حسبِ معمول اپنی اپنی قبر سے نکل کر چاندنی رات میں گپیں ہانکنے کے لیے کھلے میدان میں اکٹھا ہو کر بیٹھ گئے اور بحث کرنے لگے کہ کیا واقعی بھوت ہوتے ہیں۔

''نہیں!'' ایک نے ہنس کر کہا ''سب من گھڑت باتیں ہیں'' ایک اور بولا ''کسی بھی بھوت کو علم نہیں ہوتا کہ وہی بھوت ہے۔''

اسی اثنا میں ایک اور نے ایک جھاڑی کی طرف اشارہ کر کے خوف زدہ لہجے میں بولا ''وہ دیکھو!'' جھاڑی کے پیچھے ایک غریب آدمی بڑے انہماک سے لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔

''ہاں وہی.....''

سارے بھوت بے اختیار چیخیں مارتے ہوئے اپنی اپنی قبر کی طرف دوڑے۔''

اس چھوٹی سی کہانی میں قصہ پن، حیرت و استعجاب Suspence، اختتام اور وحدت تاثر، سبھی کچھ موجود ہے۔ ساتھ ہی گہرا طنز بھی کہ انسان جس شے کو بھوت تصور کرتا ہے، وہ خود انسان کو بھوت سمجھتی ہے۔

جوگندر پال اردو کے کہنہ مشق ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے افسانچے کو نہ صرف نام عطا کیا بلکہ اپنی کاوشوں سے مضبوط بنیادیں بھی فراہم کیں۔ جوگندر پال جب ادب میں داخل ہوئے تو نئی روشنی سے معمور تھے۔ انگریزی کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے غیر ممالک خصوصاً جنوبی افریقہ میں

خاصا وقت گذارا۔ ان کے افسانے، ناول اور افسانچے ان کی بالیدہ نظر، نئی فکر اور فن پر مضبوط دسترس کے غماز ہیں۔ انھوں نے ''نہیں رحمٰن بابو'' کے عنوان سے سینکڑوں افسانچے قلم بند کیے۔ انہیں اردو افسانچے کا سعادت حسن منٹو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے دو افسانچے ملاحظہ کریں:

کچا پن

''بابا، تم بڑے میٹھے ہو''

''یہی تو میری مشکل ہے بیٹا۔ ابھی ذرا کچا اور کھٹا ہوتا تو جھاڑ سے جڑا رہتا''

یہ دو سطر کا افسانچہ اپنے اندر مکمل کہانی لیے ہوئے ہے۔ یہ علامتی افسانچہ ہے۔ میٹھا ہونا، کئی طرف اشارے کر رہا ہے۔ یعنی پھل بہت میٹھا ہے اور جب کوئی پھل زیادہ میٹھا ہوتا ہے تو وہ یا تو خود بخود ٹوٹ کر شاخ سے الگ ہو جاتا ہے یا پھر زمانے کے ذریعہ توڑ لیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچے اور کھٹے پھل مضبوطی سے پیڑ سے جڑے ہوتے ہیں۔ اسے نہ صرف پیڑ کے اندرون سے غذا حاصل ہوتی رہتی ہے بلکہ پیڑ کے مالک اور محافظ اس کی خاطر مدارت بھی کرتے رہے ہیں۔ اس کا ہر طرح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی معاملہ بزرگوں کا بھی ہے۔ آج کل اولادیں اپنے والدین کو گھر سے نکال دیتی ہیں۔ پورا افسانچہ سماج پر ایک گہرا طنز ہے۔

بے درد

''آخر اس کا درد تھم گیا،
اور درد تھمتے ہی اسے چین آ گیا،
لیکن نہ تھمتا تو بے چارہ مرنے سے بچ جاتا۔''

'بے درد' نام کا یہ افسانچہ جوگندر پال کے عمیق ذہن کی فکری غوطہ زنی ہے۔ افسانچے میں کون بے درد ہے۔ بے درد یعنی ظالم، وہ جس نے اس کے درد کا علاج کر دیا۔ یعنی اسے مار ڈالا، لیکن بظاہر تو وہ اس کا ہمدرد ہے کہ اس سے اس کا درد، دیکھا نہ گیا اور اس نے اسے مار کر ہمیشہ کے لیے درد سے نجات دلا دی۔ قاری یہ طے نہیں کر پاتا ہے کہ اسے درد سے نجات دینے والا اس کا ہمدرد ہے یا بے درد۔ اس میں ایک پہلو اور ہے۔ بے درد، یعنی ایسا شخص جس کے پاس درد نہ ہو۔ یعنی وہ صاحب درد، اب بے درد ہو گیا۔ اسے ہمیشگی کا سکون عطا ہو گیا ہے۔ آپ کسی ایسے مریض کا تصور کریں جو بری طرح زخمی ہو، جس کی سانسیں اکھڑ رہی ہوں۔ دوا کا اثر نہ ہو رہا ہو اور اس کی یہ حالت طوالت اختیار کر گئی ہو۔ پھر کیا ہوتا ہے۔ پھر ہر کوئی اس کے دکھ درد کو دیکھ کر اس کی موت کی تمنا کرتا ہے۔ بے درد ایسے ہی کسی مریض کی حالت کا بہترین ترجمان ہے۔

جوگندر پال نے شعور کی رو تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے زیادہ تر افسانوں میں اس تکنیک کی ہلکی سی چھاپ ضرور ملتی ہے۔ پال اس تکنیک میں آزادانہ تلازمۂ خیال سے کام لیتے ہیں۔ اس زمرے میں ان کے افسانے دریاؤں پیاس، بے محاورہ، باز دید اور سواریاں آتے ہیں۔ دریاؤں پیاس ان کا اس زمرے کا بہترین افسانہ ہے جس میں انھوں نے دو نسلوں کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے۔ نئی پرانی نسلوں کے بیچ جو Generation Gap ہوتا ہے، اس کی بہترین عکاسی اس کہانی میں موجود ہے۔ دراصل پال نے اس کہانی میں دکھایا ہے کہ نسلوں کے مابین اسی Gap سے سماج انتشار کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔

پال کے یہاں فکری اور فنّی تغیر آہستہ آہستہ آیا ہے اور کئی ایک کہانیوں میں یہ تغیر بلند آواز اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اندر اندر وابستہ نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا ان کی تمام کہانیوں میں درد و کسک کی ایک لہر ہے جو کبھی اندر کبھی باہر اٹھتی، بیٹھتی رہتی ہے۔ وہ خود اپنی کہانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میری مراد یہ نہیں کہ کہانی کار کے ارادے کو اپنی کہانی میں یکسر دخل نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ ساری بات تو وہی بناتا ہے مگر بات بنتی اُسی دم ہے جب وہ ارادے کو میک اپ کی طرح برتنے کی بجائے اسے کہانی کے تار و پود کا باطنی وسیلہ بنالے اور کہانی اپنے ہی عمل کی ٹوٹ پھوٹ سے بن بن کر اپنی فطری پہچان کے خطوط اختیار کرے۔'' (پس لفظ۔ بے ارادہ)

پال کے گہرے مطالعے اور مشاہدے نے انہیں نہ صرف انسانیت کے درد و کرب کو محسوس کرنا سکھایا ہے بلکہ پال اسے کہانی میں ڈھالنے سے قبل اسے اوڑھتے، بچھاتے ہیں، اسے اپنے اندر اُتارتے ہیں پھر وہ خود کہانی بن جاتے ہیں۔ کسی کہانی کا ایک کردار بن جاتے ہیں اور اس طرح جو کہانی وجود میں آتی ہے وہ کہنے کو کہانی ہوتی ہے لیکن حقیقت ہوتی ہے، یہ پال کا کمال ہے۔

بیسویں صدی کے ساتھ ساتھ اُردو افسانے نے بھی ایک صدی پوری کر لی ہے۔ اس صدی کا جائزہ افسانے کے پس منظر میں لیا جائے تو میں کہنا چاہوں گا کہ بیسویں صدی نے ہمیں تحفہ میں جو چند افسانہ نگار عطا کیے ہیں ان میں جوگندر پال کا نام بھی شامل ہے۔ پال صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن وہ اپنی تخلیقات کی شکل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

■

Aslam Jamshedpuri, Head, Dept of Urdu, Choudhary Charan Singh University, Main Road, Meerut - 200005 (UP)

پٹیالہ میں اردو

عابد علی خاں

تاریخ گواہ ہے کہ پنجاب قدیم زمانے سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے یہاں کا ہر صاحبِ ذوق فرد اپنی مادری زبان پنجابی سے بے انتہا محبت رکھتے ہوئے بھی اُردو کی شیرینی، لطافت، فصاحت، بلاغت اور نزاکت کا مداح اور قائل رہا ہے۔ اِس کے دِل میں ہمیشہ اس محبوب زبان اور اس کے ادب سے روشناس ہونے کی تڑپ موجود رہی ہے۔ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ پنجابیوں نے اُردو ادب کے باغِ سخن کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ہے۔ اس سرزمین نے جہاں علاّمہ اقبال، فیض احمد فیض، مولانا حالی اور ساحر لدھیانوی جیسے نامور شعرا پیدا کیے ہیں، وہیں کرشن چندر، منٹو، منشی تلوک چند محروم اور راجندر سنگھ بیدی جیسے ادیب و دانشور بھی دُنیائے اُردو ادب کا بے بہا سرمایہ ہیں۔ غرضیکہ اُردو زبان ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والے اشخاص کی مشترکہ میراث رہی ہے۔

تقسیم وطن کے بعد بے شک تقاضائے وقت نے اس زبان کی صورتِ حال بدل دی اور پنجاب کے لگ بھگ سبھی اسکولوں، کالجوں اور دفتروں سے یہ زبان غائب ہوچکی ہے لیکن پنجابیوں کے دِلوں میں اس کی اُلفت ہمیشہ دامن گیر رہی ہے۔ آج بھی پنجاب کے صاحبِ ذوق افراد اِس کی بھینی بھینی خوشبو کو اپنے رگ و پے میں بسائے ہوئے ہیں۔ اکثر لائبریریوں میں اُردو نہ جاننے والے افراد گورمکھی یا دیوناگری رسم الخط میں اُردو کے کسی شاعر کا کلام ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ جو اِس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ پنجابیوں کو اپنے شعرا و ادبا سے کس قدر محبت رہی ہے۔ بقول صابر دَت:

کاغذ پہ ہوئے میرے وطن کے کئی ٹکڑے
پنجاب کی بانہوں کو کٹا دیکھ رہا ہوں
کل تک جو دیے محفلِ یاراں میں تھے روشن
آج ان کو ستاروں میں چھپا دیکھ رہا ہوں

پنجاب کی قدیم ریاستوں میں سے پٹیالہ ایک ایسی ریاست ہے جو اپنی انتہائی دل فریب اور گراں قدر تہذیب کی بدولت جداگانہ پہچان رکھتی ہے۔ اِس ریاست کے بیشتر فرمانروا عمومی طور پر ادب نواز اور اُردو کے دِلدادہ رہے ہیں۔ زمانۂ ریاست میں نہ صرف بہت سے شعرا و اُدبا کی ایک معقول تعداد ہمہ وقت ریاستی دربار میں موجود رہتی تھی بلکہ وقتاً فوقتاً انھیں انعام و اکرام سے بھی نوازہ جاتا تھا۔ بلکہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے ادیبوں اور عالموں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جس کا بیّن ثبوت حکیم مومن خاں مومن اور مرزا اسداللہ خاں غالب جیسے اُردو کے قدآور شعرا کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرنے سے بخوبی مِل جاتا ہے۔ حکیم مومن خاں مومن نے اپنی زندگی میں صرف دو قصیدے لکھے جن میں سے ایک ریاست پٹیالہ کے راجہ اجیت سنگھ کی شان میں لکھا گیا تھا۔ مومن نے یہ قصیدہ اُس وقت لکھا تھا جب ریاست پٹیالہ کی طرف سے اُنھیں ایک ہتھنی اور بہت سا قیمتی سامان بطور تحفہ بھیجا گیا تھا۔ اِسی طرح غدر کے زمانے میں جب غالب اپنی جان بچاتے پھر رہے تھے تو مہاراجہ پٹیالہ کی طرف سے بھیجی گئی فوج کے ذریعے ہی اُن کے گھر کی حفاظت کی گئی تھی۔ اُردو کے نامور ادیب اور شاعر جوش ملیح آبادی بھی ایک لمبے عرصے تک اِس ریاست

سے وظیفہ پاتے رہے۔

ریاست پٹیالہ کے وزیراعظم خلیفہ محمد حسن خان اور اُن کے چھوٹے بھائی محمد حسین خان اُردو ادب کے بیدار مغز عالم اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسیّد احمد خاں، مولانا حالی اور محمد حسین آزاد کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے وقت جب سر سیّد احمد خاں کو مالی امداد کی سخت ضرورت تھی اُس وقت بھی ریاست پٹیالہ کی طرف سے ہی سب سے زیادہ چندہ دیا گیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی کے 'سرسیّد ہال'، 'سینٹرل ہال' وغیرہ کے کمروں اور دیواروں پر جگہ جگہ آج بھی بہت سے پنجابیوں اور خاص کر ریاست پٹیالہ کے حکمرانوں کی تختیاں لگی دکھائی دیتی ہیں۔ جن میں اہم ترین نام ریاست پٹیالہ کے وزیراعظم خلیفہ محمد حسن خان کا ہے۔ یہاں تک کہ آج بھی سر سیّد احمد خاں کی قبر کے بالکل ساتھ ہی ''کمرہ قرآن خوانی'' پر رئیس پٹیالہ ڈاکٹر کریم اللہ کا نام اور اُن کی طرف سے دیا گیا عطیہ درج ہے۔

ریاست کے زمانہ سے ہی اُردو زبان و ادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے فراخ ظرف حکمراں ہمیشہ ہی پنجابی زبان کے ساتھ ساتھ اُردو شعرا و ادبا کے بھی قدر دان رہے ہیں۔

پٹیالہ کے مایہ ناز سپوتوں میں اہم ترین نام نَو بہار صابر کا لیا جاسکتا ہے۔ آپ کے شعری مجموعے پیام بیداری، دھرتی کی خوشبو، زرد پتے، کاروان خیالوں کے اور دھنک رنگ اُردو ادب کا بے بہا سرمایہ ہیں۔ نَو بہار صابر غزل اور نظم دونوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے وطن کی محبت میں بہت سی انقلابی نظمیں کہیں اور وقتاً فوقتاً اُن کی نثری تحریریں بھی ادبی جرائد کی زینت بنتی رہیں۔

نَو بہار صابر کے بعد دوسرا بڑا نام پروفیسر کرپال سنگھ بیدار کا ہے۔ آپ آزادی کے بعد اپنے آبائی وطن ننکانہ صاحب کو خیر باد کہہ کر پٹیالہ آ گئے تھے اور ایک عرصے تک پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے شعبۂ اُردو و فارسی کے تحت تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جہاں تک آپ کی شاعری کا تعلق ہے موصوف خالص غزل کے شاعر تھے۔ آپ کی وفات کے بعد ایک شعری مجموعہ 'صفیر خیال' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اِس ضمن میں تیسرا بڑا نام دیوان تیجونت رائے ساحر سنامی کا لیا جاسکتا ہے۔ آپ ریاست پٹیالہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ساحر سنامی نے غزلوں سے زیادہ نظموں کی طرف دھیان دیا۔ 'شاہ نامہ پنجاب' کے عنوان سے ان کی ایک رزمیہ نظم اور شاعری کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔

اِن شعرا کے علاوہ اور بھی بہت سے زندہ دِل اور سخن گو شعرا و اُدبا ہیں جو اِس سرزمین سے اُردو کے چمن کو مہکاتے رہے ہیں۔ جن میں اہم نام ساغر شفائی، مہیش پٹیالوی، مرتضیٰ حسین مسرور، کمل جیت شرما، جوہر بھارتی، امرت پال سنگھ شیدا کے لیے جاسکتے ہیں۔ علاوہ براِیں کچھ ایسے ادیب و شاعر بھی ہیں جو ملازمت یا کسی دوسری غرض سے پٹیالہ آئے اور اپنی تابانیاں بکھیرتے ہوئے یہاں کی ادبی فضاؤں میں گھل مِل گئے۔ خاص طور پر جگر جالندھری، زار علامی، پریم ناتھ حسرت، ہرِبنس لال سوز، جسونت سنگھ راز، محسن عثمانی، ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، ڈاکٹر طارق کفایت اور ڈاکٹر ناشر نقوی جیسے مشاہیر یہاں کی ادبی محفلوں کی جان رہے ہیں۔ نئی نسل میں چند نوجوان شعرا بھی اِس میدان میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ لیکن پروِندر سنگھ شوخ کے سوا اُردو شعر و ادب میں اور کوئی نام اُبھر کر سامنے نہیں آیا ہے۔

خیر! مسرّت کی بات ہے کہ دورِ حاضر میں پنجابی یونیورسٹی اور خالصہ کالج پٹیالہ کی طرف سے اُردو سرٹیفکیٹ کورس، اُردو ڈپلومہ وغیرہ کروا کر پٹیالہ میں اُردو کو سہارا دینے کا کام کیا جا رہا ہے۔ خاص کر محکمہ السنہ یعنی بھاشا وِبھاگ پنجاب جس کا قیام 1949 میں ریاست پیپسوٗ کے ساتھ ہی عمل میں آیا تھا اُردو زبان کی بحالی میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ بھاشا وِبھاگ کی طرف سے پنجابی کے ساتھ ساتھ اُردو کی ترقی کے لیے متعدد اقدامات کیے جاتے رہے ہیں۔ جن میں اُردو سیمینار، مشاعرے، نادار اُردو شعرا و اُدبا کی مالی معاونت، اچھی تخلیقات کے لیے اُردو اُدبا کی مالی امداد، اُردو کی بہترین ادبی کتب پر انعامات، طباعت کی رو سے بہترین کتاب پر انعام، ہر سال ایک ممتاز اُردو ادیب کا اعزاز اور ادبی رسالہ 'پروازِ ادب' کا اجرا وغیرہ اِس ادارے کے منصوبوں میں شامل ہے۔ اس ادارے کا اہم کارنامہ پٹیالہ اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں اُردو کی مفت تعلیم کے مراکز قائم کرنا ہے۔ جہاں چھ ماہ کا اُردو کورس کروانے کے علاوہ طلبا کو سرٹیفکیٹ بھی دیا جاتا ہے۔ اِس اسکیم کی بدولت اُردو زبان سے محبت رکھنے والے بہت سے افراد جو اُردو رسم الخط سے بے بہرہ تھے دھیرے دھیرے بہرہ مند ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ آج جبکہ شہر مالیر کوٹلہ کو چھوڑ کر پنجاب کے تقریباً سبھی شہروں میں اُردو جاننے والوں کی تعداد کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے، ایسے میں پٹیالہ شہر میں پنجابی یونیورسٹی، خالصہ کالج اور خاص کر بھاشا وِبھاگ کی اُردو کے تئیں خدمات مایوسی کے اندھیروں میں شُعاعِ نُور کی حیثیت رکھتیں ہیں۔ خدا کرے روشنی کی یہ کرنیں یوں ہی پھیلتی رہیں اور اُردو زبان کی کشش پنجابیوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے۔

■

Abid Ali Khan, Pandian, Maler
Malerkotla-148023 (Punjab)
Mobile: 099886-27308, 098781-98938
E-mail : abid_sherwani55@yahoo.co.in

لداخ میں اردو

محمد سجاد

ریاست جموں وکشمیر کے تینوں خطوں میں یکجہتی اور رابطے کا بہترین وسیلہ اُردو زبان ہے۔ ڈوگرہ حکمرانوں میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اُردو سے پہلے ریاست میں فارسی زبان مروج تھی۔ تاریخی حوالوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے سے بہت پہلے خطہ لداخ کو جوڑنے اور آپسی تبادلہ خیال باہمی لین دین اور ذریعے اظہار کے لیے اُردو زبان کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس وقت لداخ خود مختار خطہ تھا اور وسط ایشیا کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ بہت سے ترکی، پنجابی، کشمیری اور تبتی تاجر تجارت کی غرض سے لیہہ آتے تھے۔ مقامی لوگ ان کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بات کر لیتے تھے۔ کشمیری تاجروں کے حوالے سے عبدالغنی شیخ لکھتے ہیں:

''فادر ڈیزی نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے۔ ''اون (پشمینہ) کی تجارت سے وابستہ بہت سے کشمیری تاجر لداخی قلمرو میں بستے ہیں۔ انھیں مسجدیں تعمیر کرنے اور اپنے مذہب پر چلنے کی پوری آزادی ہے۔''

ان تاجروں کے آپسی لین دین سے لداخ میں اردو زبان کو فروغ ملا۔ 1822 میں انگریز ولیم میور کرافٹ لداخ میں تھا، وہ لکھتے ہیں: ''کرگل میں ہر گاؤں میں ایک یا دو فارسی اور ہندوستانی جاننے والے تھے۔''

تجارتی امور سے وابستہ جو لوگ جموں وکشمیر اور ملک کے دوسرے حصوں سے لداخ گئے۔ انھوں نے اُردو کو رابطے کی زبان بنایا۔ حبیب کیفوی لکھتے ہیں: ''گلگت، بلتستان اور لداخ میں جہاں کی زبانیں شینا، بروشسکی، اور لداخی تھیں اُردو رابطہ کی زبان بن گئی۔ ان علاقوں میں ڈوگرہ راج کے تسلط کے بعد انتظامی امور کے لیے جو ملازمین گئے، اُن کا تعلق جموں اور کشمیر سے تھا۔''

1874 میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سنسکرت کی درس و تدریس کے لیے لداخ میں ایک پاٹھ شالہ کھولی اُستاد سرینگر سے سنسکرت پڑھانے کے لیے بھیجا۔ اور مقامی لوگوں کو نمبر داروں اور چوکیداروں کی وساطت سے یہ پیغام بھجوایا کہ اپنے بچوں کو سنسکرت کا علم سیکھنے کے لیے پاٹھ شالہ میں بھیجا جائے۔ لیکن عام لداخی بچوں نے سنسکرت کی طرف توجہ نہیں دی اور رفتہ رفتہ اس میں زیر تعلیم بچے اسکول سے بھاگ گئے۔ عبدالغنی شیخ انگریزی جوائنٹ کمشنر کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''لداخی بچے سنسکرت کے چند صفحات رٹانے میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ ان لڑکوں کو بڑی مشکل سے اسکول میں حاضر رکھا جاتا ہے۔ مہاراجہ کی طرف سے فراغ دِلانہ، وظائف کی ادائیگی خوراک وغیرہ کی فراہمی کے باوجود لگاتار طلبا اسکول سے بھاگتے رہے۔ مہاراجہ کو پاٹھ شالہ کی ناپسندیدگی کا علم رہا ہے۔ ہر سال طلبا کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔ لیکن اُس نے اسکول بند نہیں کیا۔''

تاہم عرصے کے بعد لوگوں کی عدم توجہی کی وجہ سے مجبوراً اسکول کو بند کرنا پڑا۔ 1885 میں موراوین مشن عیسائی مشینری نے لیہہ میں ایک اسکول کھولا اور اس میں انگریزی اور اُردو دونوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ اُردو حالانکہ ابھی سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اس کی مقبولیت کے پیش نظر اسے نصاب میں رکھا گیا تھا۔

1888 میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے جموں کی عدالتوں میں اُردو کو سرکاری زبان بنایا تھا۔ جبکہ خطہ لداخ میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں عدالتوں اور محکمہ مال میں مروج ہوئی ڈوگرہ حکومت میں ریاست میں اخبارات کی اشاعت پر پابندی تھی اور بیرون ریاست سے بھی اخبارات کو ریاست میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ چوری چھپے اخبارات منگواتے تھے۔ ان اخبارات میں خلافت، زمیندار، صداقت، انقلاب، پرتاب اور ملاپ شامل تھے۔ ان اخبارات کے مطالعے سے لوگوں کے دلوں میں تحریک آزادی کا ولولہ پیدا ہوا لداخ کے واحد مجاہد آزادی منشی عبدالستار تھے۔ انھیں اخبارات کے مطالعے سے اس قدر تحریک ملی کہ تحریک آزادی میں حصہ لیا اور جیل گئے۔

بعد میں ریاست میں، ہمدرد، اور صداقت، نام کے اخبارات شائع ہوئے اور اُن کی رسائی لداخ میں ہونے لگی۔ ڈوگرہ حکمرانوں نے اُردو کے فروغ کے لیے اسکولوں میں انسپکٹر تعینات کیے اور اُردو ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پر انھیں اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا۔

لداخ میں اُردو کی تعلیم و تربیت کے بارے میں عبدالغنی شیخ یوں رقمطراز ہیں:

''ڈوگرہ حکمرانوں نے اُردو کی ترقی و ترویج میں بڑی دلچسپی لی۔ 1940 میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے جانشین مہاراجہ ہری سنگھ 1925، 1947 کے دور حکومت میں سیدین کمیٹی کی سفارشات پر اُردو کو ریاست کے اسکولوں میں ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ خواجہ غلام السیدین ریاست میں محکمہ تعلیم کے ناظم تھے''۔

آزادی کے بعد اُردو نے لداخ میں نمایاں ترقی کی، اُردو کے اور بہت سے قدر دان پیدا ہوئے۔ لداخ میں اُردو کے تئیں عام لوگوں کا رویہ مخلصانہ رہا۔ آج بھی کوئی تقریب ہو۔ کھیل کے میدان میں آنکھوں دیکھا احوال بیان کرنا ہو۔ یا کسی مہمان کا خیر مقدم کرنا ہو اُردو کو ہی ذریعہ اظہار بنایا جاتا ہے۔

1956 میں ریاستی قانون ساز اسمبلی نے دفعہ 145 کے تحت اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ 1975 میں شیخ محمد عبداللہ نے ہندی اور اُردو مضمون کو ریاستی اسکولوں میں لازمی قرار دیا۔ جو بچہ ابتدائی جماعت میں اُردو پڑھتا ہے۔ اسے چوتھی جماعت کے بعد ہندی کا مضمون اختیار کرنا ہوتا تھا۔ لیکن یہ تجربہ کامیاب نہیں رہا۔ کیونکہ عموماً دیکھا گیا کہ جو بچے ابتدائی کلاسیں جس زبان میں پڑھتے ہیں۔ اس مضمون میں بچوں کو اچھی مہارت ہو جاتی ہے۔ لیکن چوتھی کے بعد ثانوی زبان اختیار کرنے سے وہ اسے

اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے اور دونوں زبانوں میں ایک میں بھی مہارت حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے حکومت نے سرکاری ملازمت کے لیے بھی اُردو اور ہندی مضمون دونوں کا جاننا ضروری قرار دیا تھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد حکومتی فیصلے کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا گیا۔ رہی سہی کسر پرائیوٹ اداروں نے پوری کی۔ انھیں اس ضمن میں بے اعتنائی پر کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ سبھوں نے اس کو خیر باد کہا۔

لداخ کے اہم ادیبوں میں کا چوسکندر خان کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کی تین تصانیف میں قدیم لداخ، نر بوز انگپو وایت ٹھوق لہامو، اور افکار پریشان ہیں قدیم لداخ، 733 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کا چونے بلتستان لداخ کی تاریخ اور تہذیب پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسری تصنیف مشہور لداخی داستان کا اُردو ترجمہ ہے۔ ''افکار پریشان کا چوکی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے تجربات، مشاہدات کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ اولذکر اُن کی دو کتابوں پر ایوارڈ بھی ملے ہیں۔ کا چو نے لداخ کے اٹھارہ لوک گیتوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اکبر لداخی نے لداخ کے حالات اور طرز زندگی پر کئی کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں۔ بابو عبدالحمید نے لداخی، اُردو اور انگریزی لغت مرتب کی ہے۔ بقول عبدالغنی شیخ۔

''یہ پہلی لغت ہے۔ جس میں لداخی الفاظ کے اُردو متبادل دیئے گئے ہیں۔ مصنف نے اپنی دوسری کتاب میں ایک ہزار لداخی کہاوتوں کے متبادل اُردو کہاوتیں یا اُن کے ترجمے پیش کیے۔

یہ دونوں کتابیں اس نوعیت کی منفرد تصنیفات ہیں جن سے اُردو قارئین لداخی زبان اور کہاوتوں سے رو شناس ہوئے۔''

لیہہ کے ہی ایک اور ادیب عبدالقیوم کے مضامین تعمیر، محراب 'ہمارا ادب' پیام تعلیم 'خدمت' آواز وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی ایک کتاب 'رنگین سپنے' کے نام سے منظر عام پر آئی ہے جس میں اُن کی چند کہانیاں ہیں۔

لداخ سے متعلق ایسے قلم کاروں نے بھی اُردو میں کتابیں لکھیں ہیں۔ جن کا تعلق لداخ سے نہیں ہے۔ ان میں امین پنڈت کی کتاب، لداخ کی کہانی، ستیش بترا کا سفر نامہ 'جولے لداخ' اور وزیر حشمت اللہ کی معرکتہ الاراء تصنیف، 'تاریخ لداخ، جموں وکشمیر' شامل ہیں۔

عبدالغنی شیخ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ لداخ کے سرفہرست ادیبوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت محقق، سوانح نگار، فکشن نگار اور تاریخ دان ہیں۔ شیخ اُردو کے ساتھ والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ اُن کی خداداد صلاحیت سے لداخ میں اُردو زبان کو کافی تقویت ملی۔ شیخ کے اب تک دو افسانوی مجموعے، دو ناول، ایک سوانح حیات، تحقیق، پر تین کتابیں، مذہبیات پر ایک تصنیف اس کے علاوہ پچاس سے زائد مضامین ریاست اور بیرون ریاست کے رسائل جن میں شمع، بانو، ہمارا ادب، وا قعات، العطش، دیش، پمپوش، فلمی ستارے، موئی سٹار، ایوان اُردو، پالیکا سماچار، وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے علاوہ لداخ سے متعلق متعدد مضامین: آجکل، شیرازہ، ہمارا ادب، شاعر، تعمیر، شبستان وغیرہ میں چھپے ہیں۔ شیخ کی بہت سی کہانیوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔

کلچر اکادمی کی طرف سے اُردو زبان میں لکھی تصنیفات پر انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔

لداخ کے مقامی شعرا میں منیر احمد، خالدہ باری، رقیہ بانو (مرحومہ) چھرنگ آنگموں، پچنگ آنگموں، نے اپنی تخلیقات اور مضامین پیش کیے ہیں۔ عبدالغنی شیخ رقمطراز ہیں:

''لداخی زبان کے اسکالر اور ادیب ٹشمی ریگیس، چھوانگ تولدن، ستزین، آنگچک، عبدالقیوم، وغیرہ نے اُردو میں اکا دکا مضامین قلم بند کیے ہیں۔''

لداخ میں اُردو کے قارئین تو ہزاروں میں۔ لیکن اگر لداخ میں شاعروں اور ادیبوں کی بات کی جائے۔ تو ان کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ لیہہ ضلع میں اکثریت بودھ دھرم کے ماننے والوں کی ہے۔ یہاں پر اُردو کی حالت قابل رحم ہے۔ جبکہ کرگل میں شیعہ لوگوں کی اکثریت کی وجہ سے اُردو زبان نے اپنی گرفت بنائی ہوئی ہے۔

حال ہی میں لداخ اٹونامس ڈیولپمنٹ کونسل کے زیر نگرانی ایک غیر سرکاری تنظیم، Secmol نے اسکولوں میں ابتدائی جماعت سے ہی انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ Operation New hope کے تحت اس تنظیم نے پورے لداخ میں مہم چلائی۔ اس تنظیم کا براہ راست اثر اُردو پر پڑا۔ لیہہ ضلع میں اکثر طلبہ، انگریزی کو بطور اختیاری مضمون اختیار کر رہے ہیں۔ جبکہ کرگل میں اس تنظیم کا خاص اثر نہیں رہا۔

اس کی وجہ وہاں پر لوگوں کی اُردو سے جذباتی وابستگی ہے۔

اس تنظیم کا کہنا ہے کہ آٹھویں جماعت تک طلبہ کو اُردو پڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ آٹھویں کے بعد اُسے انگریزی یا اور کوئی مضمون رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے بچے مضمون میں زیادہ مہارت حاصل نہیں کر سکتے۔ پرائیویٹ اسکولوں کی طرح ابتدا سے ہی بچوں کو انگریزی پڑھائی جائے۔ جس سے بچہ زبان میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ لیہہ میں اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد پہلے ہی کم ہے۔ بقول عبدالغنی شیخ:

''لداخ میں اُردو کی کتابت کرنے والا کوئی (کاتب) نہیں ہے۔ کئی دفعہ مضامین، پمفلٹ، اشتہارات وغیرہ کی کتابت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اشاعت کے لیے سرینگر اور دہلی بھیجے جاتے ہیں۔''

لداخ میں لیہہ اور کرگل کے ریڈیو اسٹیشن بھی اُردو کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً اردو میں پروگرام نشر کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاستی کلچرا کادمی کے رسائل شیرازہ اور ہمارا ادب کے ذریعے لداخ کی تہذیب ثقافت، تمدن، حالات، رہن سہن، تاریخ جغرافیہ، پکوان، لباس، اساطیر اور دیومالائی کتھاؤں پر مختلف مضامین اُردو میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ لداخ میں اُردو کی بقا کے لیے فلموں کا بھی بڑا اہم کردار ہے۔ ٹی وی سیریلز اور فلموں کے گیتوں کے مکالمے لداخ کے ناخواندہ لوگوں کی بھی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ لداخ میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں شیخ لکھتے ہیں:

''اُردو کا المیہ یہ ہے ریاست کی سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی اس کی حیثیت سرکاری زبان جیسی نہیں ہے۔ کوئی پڑھے یا نہ پڑھے اس کی بلا سے اگر رجحان برقرار رہے تو وہ دن دور نہیں جب لداخ خطے میں اُردو پڑھنے والے افراد کی تعداد گھٹ کر نصف یا اس سے بھی کم رہ جائے گی۔''

حوالے

- پروفیسر نذیر احمد ملک، ریاست جموں وکشمیر میں اُردو بحیثیت سرکاری زبان، بازیافت شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی، کشمیر، 2009
- عبدالغنی شیخ، لداخ تہذیب وثقافت
- حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو، تسلسل شعبۂ اردو جنوری جون، 2006
- عبدالغنی شیخ، لداخ میں اُردو، بشمولہ، شیرازہ، اُردو (جموں وکشمیر اردو نمبر)، جلد 37، شمارہ 716

Mohd Sajjad, Research Scholar, Dept of Urdu, Jammu University, J&K

حفیظ ہوشیار پوری
شاعرِ شہرِ محبت

محمد علی اثر

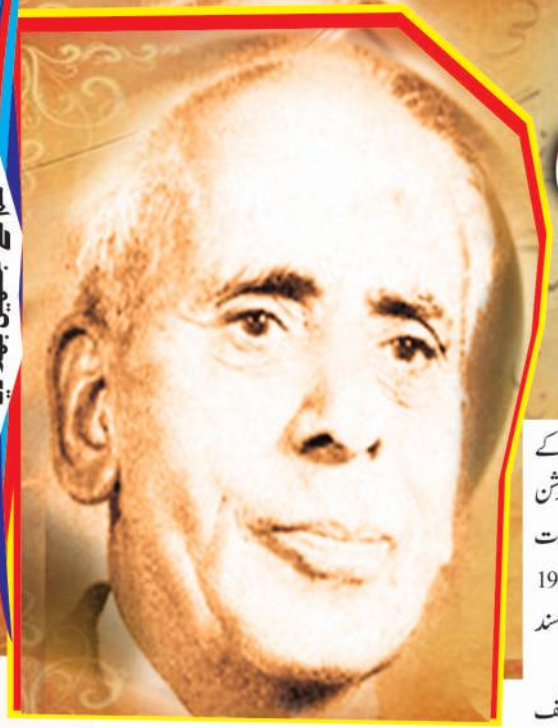

عہد قدیم کے متغزلین محمد قلی وغواصی، حسن شوقی و شاہی، ولی وسراج، میر وغالب اور حسرت وجگر سے لے کر عہد حاضر تک متعدد سخنوروں نے صنف غزل میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے لیکن حفیظ ہوشیار پوری کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ان تمام سخنوروں میں ان کے لب ولہجے کو بہ آسانی پہچانا جاسکتا ہے۔ حفیظ کی غزلیں مختلف گلوکاروں کی آواز میں ساری دنیا میں گونجتی رہیں اور اجتماعی حافظے کا حصہ بھی بن گئیں لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ اشعار حفیظ ہوشیار پوری کے ہیں۔

حفیظ ان شعرا میں سے ہیں جو ''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا'' کے مصداق بار بار پیدا نہیں ہوتے اور جب پیدا ہوتے ہیں تو ایک دنیا کو اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں۔

شیخ عبدالحفیظ اپنے آبائی وطن ہوشیار پور کے لاحقے کے سبب حفیظ ہوشیار پوری کہلاتے ہیں لیکن ان کی پیدائش دیوان پور ضلع جھنگ (پاکستان) میں 5 جنوری 1912 کو ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام شیخ فضل محمد خاں تھا۔ ان کے تین بیٹے شیخ عبدالرشید، شیخ عبدالحفیظ اور شیخ عبدالمجید تھے۔ بڑے بیٹے عبدالرشید وہی ہیں جو بعد کو راحل ہوشیار پوری کے قلمی نام سے مشہور ہوئے اور تاریخ گوئی میں کمال حاصل کیا۔ چھوٹے بیٹے عبدالمجید کی تعلیم معمولی ہوئی تھی۔ ان کی زندگی بھی غیر منظم اور لاابالی تھی۔

حفیظ ہوشیار پوری کی تعلیم میٹرک تک اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیار پور میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے وہیں گورنمنٹ انٹر کالج سے ایف۔اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اگرچہ اُن کی مالی حالت اعلا تعلیم کا بار اٹھانے کے قابل نہیں تھی لیکن اس کے باوجود گریجویشن کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ لاہور پہنچے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے میں داخلہ لے لیا۔ لاہور میں حفیظ کی رہائش کا سب سے مشکل مرحلہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صوفی تبسم نے اس طرح آسان کردیا کہ انھوں نے حفیظ کو اپنے یہاں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔

لاہور میں حفیظ کی طالب علمی کا زمانہ نہایت تنگ دستی اور عسرت میں گزرا۔ اس زمانے میں اپنی گزر بسر کے لیے فرصت کے اوقات میں وہ چند طالب علموں کو ٹیوشن پڑھایا کرتے اور ساتھ ہی بعض رسائل وجرائد میں اُجرت پر کام بھی کرلیا کرتے تھے۔ اس طرح حفیظ نے 1933 میں بی اے اور 1936 میں فلسفے میں ایم۔اے کی سند حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد حفیظ نے مختلف رسائل جیسے ادبی دنیا، نمک دان، پھول، تہذیب نسواں اور ریاست کے ادارۂ تحریر میں کچھ عرصے تک کام کیا لیکن زیادہ عرصے تک کہیں بھی جم کر کام نہ کرسکے۔ لاہور واپس آگئے اور یہاں بعض احباب کے توسط سے 1940 میں ریڈیو کے محکمے سے وابستہ ہوگئے اور پروگرام اسسٹنٹ بن کر دلی پہنچے۔ ریڈیو کی ملازمت میں کچھ عرصے تک انھیں بمبئی، لاہور اور کراچی میں قیام کرنا پڑا۔ ریڈیو کے محکمے میں ترقی کرتے کرتے وہ ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر پہنچے اور 1967 میں وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔ تنفس کے عارضے کے سبب 10 جنوری 1973 کو انھوں نے کراچی میں انتقال کیا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گے۔ عرشی امرتسری کے مادۂ تاریخ 'آہ خوش بیان حفیظ' سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

حفیظ نے ابتداً سلیم تخلص اختیار کیا تھا لیکن بہت جلد انھوں نے اسے تبدیل کرکے حفیظ کردیا۔ شاعری میں انھوں نے پہلے اپنے نانا شیخ غلام محمد سے تلمذ کا شرف حاصل کیا اور 1930 میں جب ان کا انتقال ہوگیا تو اپنے بڑے بھائی عبدالرشید راحل سے استفادہ کرنے لگے۔ لاہور میں انھیں 'حلقہ ارباب ذوق' سے وابستہ متعدد نامور احباب کی صحبت میسر آئی۔ خصوصاً غلام مصطفیٰ خاں تبسم اور پطرس بخاری، جو لاہور کالج میں ان کے اساتذہ بھی تھے، اُن کی سرپرستی اور ہمت افزائی نے حفیظ کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو خوب چمکایا۔ پطرس کے ایما پر انھوں نے انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے انگریزی میں بھی نظمیں لکھیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے بعض انگریزی نظموں کا بچوں کے لیے اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا جو بقول مالک رام ''نورنگی'' کے عنوان سے انگریزی اور اردو میں شائع بھی ہوا۔ حفیظ نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ مالک رام نے لکھا ہے کہ حفیظ نے کچھ نظمیں ضرور لکھی تھیں لیکن بعد کو یہ میدان یکسر ترک کردیا جو کلاسیکی رچاؤ، وقار اور رکھ رکھاؤ انھوں نے اپنی غزلوں میں نمایاں کیا، وہ ان کے معاصرین میں بہت کم شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ وہ غزل گوئی کی دنیا میں ایسے گم ہوگئے کہ پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بقول احمد ندیم قاسمی ''جگر، حسرت، فانی، اصغر، فراق اور یگانہ کے سے غزل گو شعرا کے دور میں حفیظ ہوشیار پوری کی غزل ہر لحاظ سے سربرآوردہ رہی۔ کمی صرف یہ رہی کہ خود اپنی غزلوں کو کتابی صورت میں مرتب وشائع کرنے سے وہ بے نیاز رہے۔ حفیظ کا پہلا مجموعۂ کلام ان کی پہلی برسی کے موقع پر شائع ہوا۔

تاریخ ادب کے طالب علم اس بات سے بہ خوبی واقف ہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدآور فن کاروں کے ہجوم میں بعض اہم فن کار اپنے تمام تر فنی کمالات اور خوبیوں کے باوجود اس طرح نمایاں نہیں ہو پاتے جیسے ان کا حق ہوتا ہے۔ اقبال کے بعد اردو ادب کے منظر نامے میں شاعری اور خصوصاً غزل کے حوالے سے جو فن کار اپنے فن کی دل نشینی اور دل آویزی کے باوجود گم نامی میں رہے اُن میں ایک بڑا اور اہم نام حفیظ ہوشیار پوری کا ہے۔

حفیظ کا کلام اُن کی زندگی میں مختلف رسائل وجرائد میں بھی شائع ہوتا رہا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے متعدد

گلوکاروں کی آوازوں میں نشر بھی ہوتا رہا، انھیں کما حقہ داد بھی ملتی رہی اور ان کی غزلوں کے اشعار زبان زدِ خاص و عام بھی ہوتے رہے۔ لیکن ان کا واحد شعری مجموعہ جسے انھوں نے اپنی حیات ہی میں 'زیرلب' کے عنوان سے مرتب کرلیا تھا ان کی وفات (جنوری 1973) کے نو ماہ بعد 'مقامِ غزل' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔

حفیظ کی غزل اردو غزل کی اس روایت سے منسلک ہے جس کی پہلی کڑی میر تقی میر تھے اور اس سلسلے کی دیگر کڑیوں میں فراق اور ناصر کاظمی بھی جڑے ہوئے ہیں۔ محبوب کا انتظار شاعر کو کن کن تجربات سے گزارتا ہے اور اس کے صلے میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے، انتظار کی عمر جتنی طویل ہوگی اسی قدر اسے متاعِ محبت اور سکونِ حیات بھی حاصل ہوگا۔ اس موضوع پر حفیظ نے بہت خوبصورت شعر کہا ہے:

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے ہم نے پیار کیا

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حفیظ نے اپنی زندگی میں کلام کی اتنی مقبولیت کے باوجود اپنا مجموعۂ کلام کیوں نہیں چھپوایا؟ حالانکہ وہ ایک طویل عرصے تک اہم سرکاری عہدے پر فائز رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطری بے نیازی اور بے داغ تکمیلیت کی عادت کے سبب ایک مختصر انتخاب بھی شائع نہیں کر سکے۔

حفیظ کے معاصرین کا خیال تھا کہ تمام اچھے شعر حفیظ کے کھاتے میں چلے جاتے ہیں اور ان کی غزل میں میر کا سوز، غالب کی ایمائیت، جگر کا ایجاز، اصغر کی فلسفیانہ ژرف نگاری، حسرت کی شائستگی اور فراق کی محبوبیت سبھی کچھ موجود ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ تاریخ ادب کے تین اہم تاجدارِ سخن ایک ہی وقت اور ایک ہی کالج (گورنمنٹ کالج لاہور) کے متعلم تھے، ان کی عمروں میں زیادہ تفاوت نہ تھا۔ راشد 1910 میں پیدا ہوئے، فیض 1911 میں اور حفیظ 1912 میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران تینوں نے اپنے لیے جداجدا راستے منتخب کیے۔ راشد نے آزاد نظم کو وسیلۂ اظہار بنایا اور اسی کے فروغ وارتقا کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔ فیض نے بہ حیثیت شاعر خود کو ایک سیاسی مسلک سے وابستہ کرلیا۔ حفیظ نے کلاسیکی غزل کے انداز ہی کو اپنا کر اس میں نئی جہتیں پیدا کیں۔

تینوں سخنوروں نے اردو، فارسی اور انگریزی ادب کا وسیع پیمانے پر مطالعہ کیا تھا اور تینوں فن کے تعلق سے محتاط رویہ اختیار کرتے تھے۔ راشد نے آزاد نظم کے تجربے کیے اور اس میں کمال حاصل کیا۔ فیض نے اپنی سیاسی اور نیم سیاسی منظومات میں غزل کی غنائیت اور رومانیت کے امتزاج سے ایک نئی کیفیت اور نئی فضا تیار کردی۔ حفیظ نے اردو شاعری کے مروجہ اور روایتی ہیئتوں کو اپنا کر ان میں نئی تازگی و توانائی پیدا کی۔ انھوں نے اردو شاعری کے دائمی اور لازوال موضوع 'محبت' کو ہی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا اور اس کو آفاق گیر وسعتوں سے ہم کنار کیا۔ حفیظ گریجویشن میں فلسفے کے طالب علم تھے اور اسی موضوع پر انھوں نے ایم اے بھی کیا۔ وہ نفسیات کے مضمون میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ حفیظ بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے رجحانات سے بہ خوبی واقف تھے جب انھوں نے غزل گوئی کا آغاز کیا تھا تو ہر طرف اس صنف کے خلاف آواز اٹھائی جارہی تھی۔ اس کو نیم وحشی اور قابل گردن زدنی قرار دیا گیا۔ ایسے حالات میں غزل کے محاذ پر ایک سپاہی کی طرح ڈٹے رہنا بڑی ہمت اور حوصلے کا کام تھا۔ حفیظ کی غزل میں عمومی موضوعات پر ایسے موثر اور دل نشیں اشعار مل جاتے ہیں جہاں کسی اور شاعر کے تخیل کی پرواز نہیں پہنچ پاتی:

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے
اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے
ہم تو اپنے غم سے پہچانے گئے
اپنے فن میں منفرد مانے گئے
پھر نہ دینا مجھے الزام محبت دیکھو
تم چلے جاؤ تمھیں دیکھ کے پیار آتا ہے
ہمیں جہاں میں ہیں راز آشنا قیامت کے
کہ فاصلے ہیں قیامت رہِ محبت کے
یہ ترکِ محبت ہے کہ تجدید محبت!
پہلے سے بھی آنے لگے وہ مجھ کو سوا یاد
ترے لطف وکرم ہیں، تو بھی ہے تری وفا بھی ہے
مگر کوئی مداوا اس دل بے تاب کا بھی ہے

سیاسی نشیب وفراز کے موضوع پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

خوفِ رہزن بھی ہے اندیشۂ رہبر بھی حفیظ
منزلیں سخت ہیں آغازِ سفر سے پہلے
سنا رہا ہوں بہ رنگِ غزل زمانے کو
حکایتِ غم دوراں، فسانۂ غم دل
جب خموشی پہ تکلم کا گماں ہوتا ہے
دل پہ وہ لمحۂ غم سخت گراں ہوتا ہے

یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ حفیظ ہوشیار پوری نے اپنی شاعری کی ابتدا باغیانہ نظموں سے کی اور سیاسی جلسوں میں اس نوع کی تخلیقات سنانے کے سبب ایک بار انھیں جیل بھی جانا پڑا لیکن اپنے منصبی فرائض کی پاسداری کے لیے انھوں نے سیاسی نظموں سے کنارہ کشی اختیار کرکے غزل گوئی کی طرف توجہ کی۔

حفیظ کی غزل، اردو غزل کی اس روایت سے وابستہ ہے جہاں عشق ہی کے دم سے کاروبارِ حیات میں رونق اور گرما گرمی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ جذبہ ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے، اسی کے عزم وہمت کی بدولت فرہاد نے کوہ بے ستون کو کاٹ کر نہر نکالی تھی، یہ آگ کے دریا میں ڈوبنے سے ڈرتا ہے اور نہ آتش نمرود میں کودنے سے گھبراتا ہے۔

عشق کی کارفرمائی کا تجربہ ہر شخص پر مختلف ہوتا ہے۔ عشق کے ہزار رنگ ہوتے ہیں اور اگر عشق مجازی کی بات ہو تو ہر رنگ جدا ہوگا۔ تخلیق کائنات میں شاید غم عشق کا خمیر شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں اسی کی حکومت اور اسی کا راج ہے:

کچھ غم عشق کے سوا بھی ہے
غم ہستی ترے خزینے میں

حفیظ نے اپنی غزل کی روح کو عشق ومحبت، پیار، شوق اور جنون سے مالا مال کیا۔ یہی سبب ہے کہ صنفِ غزل نے حفیظ کے ہاتھوں ایک نئی آن بان اور منفرد پہچان بنائی چند شعر دیکھیے:

سکھائے عشق نے آدابِ مرگ وزیست ہمیں
اس ایک غم میں غم دو جہاں بھی ہوتا ہے
آج جی کھول کے روئے اے دوست
تیری صورت بھی نہ جب یاد آئی
توفیق درد عشق مقدر کی بات ہے
ملتی ہے زندگی سے اماں اتفاق سے
زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے
محبت کو دعائیں دے رہا ہوں
کہاں میں اور کہاں یہ دولت غم

حفیظ کے مجموعہ کلام 'مقام غزل' میں 200 غزلیں شامل ہیں اور جملہ اشعار کی تعداد 1472 ہے جس میں غم عشق کا موضوع 243 اشعار میں آیا ہے، غم کے متعلقات جیسے رنج، آہ، ملال، محن ماتم وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔

■

Mohd Ali Asar, Kashana-e-Asar, 20-4-226/9
Mahboob Chowk
Hyderabad - 500002 (Tlingana)

حسین الحق

منشی نول کشور

(ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی)

انجیل شریف میں کہا گیا ہے کہ ''ابتدا میں لفظ تھا اور خدا کی روح پانی پر تیر رہی تھی'' پھر قرآن شریف میں جہاں پہلی وحی کا پہلا جملہ 'اقرا' نظر آیا، وہیں سورہ قلم بھی نظر آئی، اس طرح خود بخود لفظ قرأت اور قلم کی اہمیت کا احساس قوی ہوا اور بالآخر جب آوازۂ ازل 'کُن' سے آشنائی ہوئی تو سمجھ میں آیا کہ ابتدا میں لفظ کے ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اندازہ ہوا کہ حرف، لفظ، قلم اور قرأت شاید اس کائنات کی جبلت ہے یا کائنات کے بنیادی وظائف میں سے ایک اہم وظیفہ ہے، اور اِس وظیفے کی ادائیگی کا پہلا ذریعہ تو زبان (Oral) ضرور ہے مگر شاید ابتدا ہی سے زبانی بیان، یا آموختہ اور حفظ سے زیادہ اہمیت تحریری تحفظ کردیا گیا تبھی تو مذہبی کتابوں میں بھی مخاطبین کو بار بار صحف وصحائف سے آشنا کرایا گیا، نتیجہ ہمارے سامنے ہے، صحف سماوی کی پیروی میں بے شمار ارضی وفانی صحائف لگاتار وجود میں آتے رہے اور آتے رہیں گے۔

جب چھاپہ خانوں کا دور شروع ہوا تو تحفظِ صحف و کتب کا یہ عمل نسبتاً آسان ہوگیا۔

گویا چھاپہ خانے منشائے الٰہی یعنی تحفظ و توسیع حرف ولفظ کی انسانی کوشش کا ایک نمونہ ہیں۔

ہم جب کتابوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو خبر ملتی ہے کہ پہلے پتھر پر، درخت کے پتوں پر، چمڑوں پر اور کپڑوں پر الفاظ کو محفوظ کیا گیا، پھر جب کاغذ اور چھاپہ خانے وجود میں آئے تو گویا ایک انقلاب سا آگیا۔

حرف ولفظ اور جملوں پر مشتمل کتابیں ایک خاموش بادنما ہیں جو اپنے موضوع کے لحاظ سے اپنے عہد کی علمی، ادبی، نثری، شعری، تہذیبی، مذہبی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور خیالات کے اگلے سفر کے لیے سمتوں کا تعین بھی کرتی ہیں اور یہ سب کچھ ان کتابوں کے سبب ہیں جو ہمیں آج چھاپہ خانوں کی وجہ سے بہ آسانی دستیاب ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ چھاپہ خانے تو تجارت کا ایک ذریعہ ہیں، یہ سچ ہے، معاشی نقطۂ نظر سے چھاپہ خانوں کی تجارتی اہمیت و افادیت سے انکار ناممکن ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ زیادہ تر چھاپہ خانے تجارتی مقصد سے ہی قائم کیے گئے مگر اس کے باوجود بعض تاجروں کے یہاں جذبہ اور خدمت کا عنصر بھی بیش از بیش نمایاں ہے۔

منشی نول کشور ایسے تاجروں کی صفِ اول میں بھی اولیت کے مستحق ہیں—

منشی نول کشور صاحب اور ان کے چھاپہ خانے کے بارے میں سوچتا ہوں تو خوش گوار ٹھنڈی ہوا کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی محنت اور محنت کی کامیابی پر رشک آتا ہے اور مرعوبیت بھی طاری ہوتی ہے۔ تاریخ ادب اردو سے خبر ملتی ہے کہ منشی نول کشور صاحب کی موت 1895 میں ہوئی اور ترکے میں اُن کے بیٹے منشی پراگ نرائن کو تقریباً ایک کروڑ کی جائداد اور کاروبار حاصل ہوا تھا، آپ اندازہ لگائیے کہ 1895 میں ایک کروڑ کی جائداد اور کاروبار کا آج کی تاریخ میں کیا تخمینہ لگایا جاسکتا ہے۔

بہرحال! یہ تو ایک برسبیلِ تذکرہ گفتگو تھی، کہنے کا مقصد یہ کہ منشی صاحب کی شخصیت اور فعالیت دونوں مثالی ہے کیونکہ معاشی خوش حالی بالعموم جذبے کو سرد کردیتی ہے اور اقدار کو بے معنی قرار دے دیتی ہے۔ مگر منشی نول کشور صاحب کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تعلق کتابوں سے تاجرانہ نہیں تھا بلکہ انھیں کتابوں سے اور بالخصوص علم و ادب کے ذخائر سے محبت تھی اور ان کی وابستگی صرف اور صرف فروغِ علم سے تھی۔

آج کے موجودہ صارفی سماج میں لفظ وابستگی ایک لایعنی اصطلاح اور عمل ہے، مگر ہم جن اقدار کے سائے میں پل کر ہوش مند ہوئے ہیں وہاں یہ وابستگی جب ہوش مندی و دردمندی کے ساتھ اپنا اظہار کرتی تھی تو رواداری کے روپ میں ڈھلتی تھی، آج بھی جس کا ایک خوب صورت نمونہ گلزار دہلوی ہیں، اور یہی وابستگی جب جذبے سے جڑ کر اپنی انتہا تک جاتی ہے تو وفا بنتی ہے۔

منشی صاحب کی شخصیت میں ایسی وابستگی نظر آتی ہے جو رواداری سے زیادہ جذبۂ محبت کا احساس کراتی ہے۔

منشی صاحب کا معروضی مطالعہ ہمیں مطلع کرتا ہے کہ ان کے دادا اور والد زمین دار بھی تھے اور سرکاری ملازم بھی، خود نول کشور صاحب نے بھی تعلیم سے فراغت کے بعد پہلے ملازمت ہی اختیار کی مگر یہ حسنِ اتفاق ہے کہ یہ ملازمت لاہور کے 'کوہِ نور' اخبار کی تھی، جس کی وجہ سے کتابوں کی طباعت کا اچھا خاصا تجربہ انھیں حاصل ہوگیا اور یہی تجربہ بعد میں ان کے کام میں آیا—

ملازمت کا یہ ذکر 1857 سے پہلے کا ہے۔ 1857 کے بعد انھوں نے ملازمت ترک کردی اور 1858 میں اپنا چھاپہ خانہ شروع کیا، اس سلسلے میں پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ اپنے چھاپہ خانے سے اُس عہد کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کو جوڑا، نسیم دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیم، منشی احمد علی کسمنڈوی، وغیرہ درجنوں شعرا، ادبا اور علما سے منشی صاحب کی ذاتی اور تجارتی وابستگی رہی۔

منشی صاحب نے مرزا غالب سمیت اُس عہد کے تمام مستند اور قابلِ ذکر شعرا کے دواوین چھاپے، داستانیں جن کی بنیادی روایت زبانی قصہ گوئی کی تھی، اُسے بھی میر محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر کے تعاون سے کتابی صورت میں محفوظ کیا، شیخ تصدق حسین سے نوشیرواں نامہ کا ترجمہ کرایا، قصہ مختصر یہ کہ سترہ اٹھارہ ہزار صفحات پر مشتمل

داستانِ امیر حمزہ، پھر بوستانِ خیال کی نو جلدیں، مرزا رجب علی بیگ سرور کا فسانہ عجائب، رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد، سب کے سب مطبع منشی نول کشور سے منظر عام پر آئے۔

دوسری طرف قرآن کریم، احادیث کے مجموعے، تفسیر کی کتابیں، فقہ اور اصولِ فقہ یعنی تمام تر اسلامی اور دنیاوی علوم کی کتابیں منشی صاحب کے مطبع سے شائع ہوئیں، اور قرآن و حدیث کی طباعت کے حوالے سے لکھنے والوں نے جو باتیں درج دفتر کی ہیں وہ بھی بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں اور منشی صاحب کی بے تعصبی، رواداری اور ان کے اندر موجود جذبۂ احترام کی طرف اشارہ کرتی ہیں، مثلاً یہ کہ قرآن و حدیث کی کتابت و طباعت کے لیے جو عملہ منشی صاحب نے متعین کر رکھا تھا اُسے ہدایت تھی کہ بغیر وضو نہ تو وہ قرآن و حدیث کا کوئی نسخہ چھوئے اور نہ ہی کتابت کرے، یہاں تک کہ لیتھو طباعت میں جو پلیٹیں استعمال کے بعد دھوئی جاتی تھیں اس 'دھوون' کا پانی بھی اِدھر اُدھر گرانے اور پھینکنے کی اجازت نہیں تھی۔

زبیر رضوی نے اپنی خودنوشت 'گردش پا' میں دریا گنج کے چھاپہ خانوں اور کتب فروشوں کا جو رویہ قرآن کریم کے نسخوں کے تئیں بیان کیا ہے، اس کو سامنے رکھیے تو منشی نول کشور صاحب کے لیے بے ساختہ ایک مصرعہ یاد آتا ہے کہ: پا سباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔

سچ یہ ہے کہ منشی نول کشور اپنی علم دوستی، کشادہ دلی، جذبۂ خدمت اور تمام صحائف و کتب کے تئیں جذبۂ احترام کے سبب اپنے عہد کے یکتائے روزگار میں سے تھے اور اِسی لیے ان کے مشاہیر ہم عصروں نے ان پر توجہ دی، ان کی قدر کی اور ان کے رابطے میں رہے، غالب اور سرسید اس کی نمایاں مثالیں ہیں، غالب نے مطبع نول کشور سے کتاب کا چھپنا اس کے استناد کا ایک سبب تسلیم کیا ہے اور جب منشی احمد علی کسمنڈوی کا 'روح' کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تو سرسید احمد نے منشی نول کشور کو خط لکھا کہ ''میں اِس مضمون میں سے کچھ اخذ کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا صاحب مضمون سے اس کی اجازت چاہتا ہوں۔'' سرسید کا یہ خط منشی نول کشور سے ان کے ذاتی ربط کا ثبوت ہے۔

سرسید کے ذکر پہ یاد آیا کہ سرسید نے نہایت سخت حالات میں بالعموم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے مسائل کا حل 1857 کے بعد منظر نامے پر غالب ہونے والی نئی لسانی اور تعلیمی صورتِ حال سے تطابق میں تلاش کیا، نتیجتاً ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جس میں انگریزی تعلیم پر زور دیا گیا اور مغربی زبان و تہذیب اور علوم سے مشرق کی دوستی کرانے کا بیڑہ اٹھایا گیا، اِس کوشش سے سرسید کے ہم مذہب خود کو شروع میں جوڑ نہ پائے، اختلاف کیا، سرسید سے ذاتی اختلاف بھی کیا، مخالفت کی، کفر کا فتویٰ لگایا مگر سرسید کے قدموں نے ڈگمگانا نہیں سیکھا تھا، نتیجہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

دوسرا منظر 1947 کے آس پاس نظر آیا جب مسلمان خوف زدہ ہوکر جوق در جوق ہندوستان سے بھاگ رہے تھے، حالانکہ مولانا ابوالکلام آزاد انھیں بار بار سمجھا رہے تھے مگر ایک مرتبہ پیر اکھڑ جاتا ہے تو پھر اس کا جمنا مشکل ہوتا ہے، فرار پسندی کا وہ رن پڑا جس میں لاکھوں کھیت رہے، مگر اس عرصۂ کشتنی میں بھی حکیم عبدالحمید نام کا ایک دبلا پتلا مرنجاں مرنج شخص کھیت کرنے پر مائل ہوا، لوگ بھاگ رہے تھے اور وہ شخص دہلی کے نواح میں زمینیں خریدتا چل رہا تھا۔ اس مجنوں کے عشق کا نمونہ، اس کا بویا بیج، اس کی لگائی کھیتی آج جامعہ ہمدرد کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ہمدرد کے بیچ منشی نول کشور صاحب کھڑے نظر آتے ہیں، منشی صاحب نے کوئی تعلیمی ادارہ نہیں قائم کیا، مگر سچ یہ ہے کہ اگر منشی نول کشور نہ ہوتے تو اس پورے علمی منظر نامے کا تصور و تحفظ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہوتا، یا معشوق کی موہوم کمر۔ منشی صاحب نے تنہا وہ کارنامہ انجام دیا جو بڑے تعلیمی ادارے، بڑی انجمنیں، اور بہت بااثر لوگوں کا ایک بڑا گروہ بہت سارے لوگوں کی مدد سے کر پاتا ہے۔

ایسا صرف اس لیے ہوا کہ منشی صاحب کی روح تاجر کی نہیں عاشق کی روح تھی جس نے 1857 کے بعد اردو والوں کے مسائل کا حل 'تحفظِ علوم و کتب اور تحفظِ تہذیب' میں تلاش کیا۔ کتابوں کے تئیں ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ قدیم کتابیں اور نادر مخطوطے وہ ذاتی رقم لگا کر خرید لیا کرتے تھے اور اسے صرف خاص سے شائع کر کے گویا افادۂ عام کے اسباب فراہم کرتے تھے، ہزاروں ہزار عربی فارسی اردو ہندی اور سنسکرت کی کتابیں تو انھوں نے شائع کیں ہی، مگر ان کی شخصیت کا ایک اور رُخ ہے جس نے انھیں مزید وسعت عطا کی، یہ رخ گنگا جمنی تہذیب کا ہے، سب سے پہلے ان کی وضع قطع کا تصور کیجیے تو ایسا احساس ہوتا ہے کہ آپ کسی متشرع عالم کی تصویر دیکھ رہے ہیں، اتنا ہی نہیں ان کے ذاتی، خانگی اور مجلسی حالات کے بارے میں جو تحریری اشارے ملتے ہیں اُن کی روشنی میں یہ بات بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ وہ ازسرتاپا گنگا جمنی تہذیب کا استعارہ تھے، گھریلو رہائش، ذاتی لباس، بول چال، آداب گفتگو اور آدابِ مجلس ہر رُخ سے وہ اس گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کرتے تھے جو دراصل اردو تہذیب تھی، اور گنگا جمنی تہذیب کے اسی روشن رُخ نے انھیں وہ وسعت قلبی عطا کی جس نے پورے ہندوستان کو اپنے اندر سمیٹ لیا، منشی نول کشور صاحب نے صرف قرآن شریف یا وید اور پران ہی نہیں شائع کیے، منشی صاحب کے مطبع سے انجیل شریف اور گروگرنتھ صاحب کی اشاعت بھی ہوئی اور اردو فارسی عربی کے ساتھ ہندی سنسکرت، بنگالی، مراٹھی، پنجابی اور پُشتو میں بھی کتابیں شائع ہوئیں۔

منشی صاحب نے تجارت کے پیشے میں خدمت اور جذبہ دونوں کو شامل کیا، تجارت جیسے خالص مادّی عمل میں جذباتی وابستگی اور جذبۂ خدمت کی شمولیت آج کے صارفی سماج (Consumer's soceity) کی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے مگر منشی نول کشور کے عصر کو اور اس عہد کے اقداری ڈھانچے کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نظر نہیں آئے گی۔

افسوس کہ آج کے چھاپہ خانوں کے مالکوں اور عملے کے یہاں مذکورہ بالا عنصر کا فقدان ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کی روشنی میں حسبِ ذیل نتائج بہ آسانی اخذ کیے جاسکتے ہیں:

(1) حرف و لفظ اور کتب و صحائف کی اہمیت مذہبی اور غیر مذہبی دونوں ادبیات میں تسلیم کی گئی ہے۔

(2) حرف و لفظ اور کتاب کی قرأت و تحفظ پر بھی ہمیشہ زور دیا گیا۔

(3) چھاپہ خانے تحفظ و توسیع حرف و لفظ کی ایک کوشش ہیں۔

(4) منشی نول کشور صاحب صرف تاجر ہی نہیں تھے علوم و فنون کے عاشق بھی تھے۔

(5) منشی صاحب گنگا جمنی تہذیب کا سراپا نمونہ تھے۔

(6) سرسید نے تعلیمی فروغ کا جو کام شروع کیا اُسے منشی نول کشور کے تعاون نے مکمل کیا۔

(7) منشی نول کشور اور مطبع نول کشور ایک ایسی وراثت ہے جسے کسی دن اگر بدقسمتی سے اردو نے فراموش کر دیا تو وہ دن اردو اور اہل اردو کی خود فراموشی کا دن ہوگا—!!

■

Dr. Husainul Haque Sir Syed Colony, New Karim Ganj, Road No:6, Gaya- 823001 (Bihar)
Mob.:9934066720

سنجے کمار

لالہ رام نرائن لعل

میں ایک ایسے پبلشر اور کتب فروش کے بارے میں تعارف کرانا چاہتا ہوں جس سے اردو دنیا واقف تو ہے لیکن پوری طرح سے نہیں۔ وہ ہیں لالہ رام نرائن لعل اگروال۔ ہندی، سنسکرت، انگریزی، اردو، فارسی، عربی، بنگالی اور نیپالی بک سیلر اور پبلشر، 2 کٹرہ روڈ، الہ آباد 211002۔ اس کتب فروش اور پبلشر کا پریس نول کشور پریس (قائم شدہ 1858) کے 26 برس بعد یعنی 1884 میں 'رام نرائن لعل بک سیلر' کے نام سے قائم ہوا اور آج بھی چل رہا ہے۔ اِس وقت لالہ رام نرائن لعل کے خاندان کے آخری چشم و چراغ (اردو کے تعلق سے) انج کمار اس اشاعتی اور طباعتی کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ لالہ رام نرائن لعل سے پہلے ہی ان کے والد ماجد دوارکا پرشاد اگروال الہ آباد میں کتاب کے کاروبار کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ اصلاً اٹاوہ کے رہنے والے تھے:

''دوارکا پرشاد کا جنم 1844 میں اٹاوہ اتر پردیش میں ہوا۔ وہاں کے ہیونس ہائی اسکول میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ وہ بہت ہی ذہین طالب علم تھے۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد 1866 میں معلم (استاد) کے عہدے پر ان کا تقرر ہو گیا۔ 1883 میں وہ اٹاوہ سے الہ آباد منتقل ہوئے اور گورنمنٹ ہائی اسکول الہ آباد میں ان کا ٹرانسفر ہوا۔ الہ آباد آنے پر یہیں انھوں نے اپنی مستقل رہائش گاہ بنائی۔ وہ 1900 تک درس و تدریس کا کام کرتے رہے اور مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لعل نہرو (والد پنڈت جواہر لعل نہرو) وغیرہ کو تعلیم دی... الہ آباد آنے کے بعد ان کی توجہ کتاب کے کاروبار کی طرف گئی اور اپنی زندگی میں ہی انھوں نے اس کاروبار کو ترقی کی منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے''۔

(ماسٹر دوارکا پرشاد جی کا پریوار ایوم پریچے، از، پروفیسر بھوانی دت اُپریتی، 2009، ص 21)

لالہ رام نرائن لعل اپنے والد محترم کے کاروبار کو آگے بڑھانے میں پوری لگن، محنت اور ایمانداری سے مدد کیا کرتے تھے۔ روزنامہ امرت پربھات کی خبر کے مطابق:

''رام نرائن لعل نے گورنمنٹ ہائی اسکول کے سامنے سڑک کی پٹری پر بیٹھ کر کاپی، کتاب، پنسل اور اِسٹیشنری کا سامان بیچا۔ انھیں کافی کامیابی ملنے کے بعد بھی چھوٹا سا چھوٹا کام کرنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ انھوں نے بہت بار کاپی، کتابوں کے گٹھر خود باندھے اور انھیں اُٹھا کر تانگے اور گاڑی پر لادا بھی۔ وہ معمولی کپڑے کا کرتا پہنتے اور گھٹنے تک دھوتی۔ انھیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ الہ آباد کے بہت بڑے دولت مند آدمیوں میں سے تھے''۔

(امرت پربھات، 25 جولائی، 1997، الہ آباد)

لالہ رام نرائن لعل نے معمولی کاروبار سے ترقی کرتے ہوئے ہندوستان کے جانے مانے کتاب بیوپاری بن گئے۔ الہ آباد میں اَنج کُمار اِس وقت اردو کتابوں کا سیکشن دیکھتے ہیں۔ انج کمار سے پہلے ان کے والد اَرُن کمار اس کاروبار کو دیکھتے تھے۔ پھر ان کے والد پُرشوتم داس، پھر ان کے والد بنی مادھو، پھر رام نرائن لعل پھر دوارکا پرشاد یعنی انج کمار ابن ارن کمار ابن پرشوتم داس ابن بنی مادھو ابن رام نرائن لعل ابن دوارکا پرشاد۔ یہاں میں نے صرف اردو، عربی اور فارسی کتب کے کاروبار کے تعلق سے یہ شجرہ لکھا ہے ورنہ ان کے خاندان کی دوسری شاخ کی پُشتیں بھی اس کاروبار میں لگی ہوئی ہیں (وہ سنسکرت اور ہندی کی کتابیں شائع کرتے ہیں)۔ اس سے پہلے کہ ان افراد کے بارے میں فرداً فرداً کچھ لکھا جائے، ضروری ہے کہ ان کے زمانے کا تعین کر دیا جائے تا کہ سمجھنے میں سہولت ہو۔

دوارکا پرشاد	1844-1935
لالہ رام نرائن	1860-1935
بنی مادھو	1887-1964
پرشوتم داس	1972 - ......
ارن کمار	1942-2011
انج کمار	1967۔تا حال

لالہ رام نرائن لعل کا نام اس شہر کی جانی مانی شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد اس شہر الہ آباد کی ایک اہم سڑک بینک روڈ کا نام بدل کر لالہ رام نرائن لعل روڈ کر دیا گیا۔ ان کے دو بیٹے بنی مادھو اگروال اور بنی پرساد اگروال ہوئے۔ جس میں بنی پرساد اگروال الہ آباد کے پہلے Mayor ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ ایجوکیشن بورڈ کے چیرمین بھی رہے۔ (اگروال ونشاولی)۔ پرشوتم داس قانونی کتابوں کا سیکشن دیکھتے تھے۔ انھیں قانونی کتابیں شائع کرنے کا خاص شوق تھا۔ انج کمار کے مطابق آپ کے پاس الہ آباد ہائی کورٹ کے وکیل اور جج آتے تھے اور ان کے ساتھ نشستیں ہوتی تھیں۔ عدلیہ کے لوگوں سے ان

کے خاص مراسم تھے۔ رام نرائن لعل کے بعد ارن کمار نے اپنے دور میں جن کتابوں کو شائع کیا ان پر فرم کا نام اپنے نام کے اضافے کے ساتھ 'رام نرائن لعل ارن کمار' کر دیا اور آج بھی یہ فرم اسی نام سے چل رہی ہے۔ مندرجۂ بالا ناموں میں سب سے اہم نام، فرم کے بانی لالہ رام نرائن لعل کا ہے۔ انھوں نے خاص طور سے اردو، عربی اور فارسی کتابوں کو شائع کرنے کی بنیاد رکھی۔ اُس عہد کی ضرورت کے مطابق تعلیمی، سیاسی، معاشی، قانونی، تاریخی اور ادبی کتابیں شائع کیں۔ 'لغاتِ فارسی' نام کی ایک لغت لالہ رام نرائن لعل نے اپنے دو صفحات کے دیباچے کے ساتھ 1931 میں شائع کیا۔ یہ لغت بہت نایاب اور مفید ہے۔ اس میں عربی، فارسی، ترکی، یونانی، عبرانی الفاظ اور محاورات داخل ہیں۔ لغت کُل 985 صفحات کی ضخامت پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف کتابیں اور لغات دیگر زبانوں میں بھی شائع کیں۔ کتابوں کا ایک انتخاب یہاں درج کر رہا ہوں:

اردو ادب:

باغ و بہار	مکتوبات مشاہیر
دیوان داغ	مثنوی گلزار نسیم
دیوان غالب	مثنوی سحر البیان
دیوان حالی	عود ہندی
فسانۂ عجائب	اردوئے معلّٰی
ہمایوں نامہ	حکایات لقمان
ابن الوقت	جدید علم العروض
کلیات آتش	جدید علم البلاغت
کلیات مومن	قواعد اردو
کلیات میر	موازنۂ انیس و دبیر
کلیات سودا	صبح وطن
طلسم ہوش ربا	امراؤ جان ادا

فارسی ادب:

انوار سہیلی	رباعیات عمر خیام
انتخاب بوستان سعدی	کریما
قصائد عرفی	اشعار حافظ
اشعار خاقانی	اشعار مولانا روم
چہار مقالہ	ایرانی زبان کا قاعدہ

لغات:

لغات فارسی	فردوس اللغات
مجمع اللغات	جامع اللغات
ہندی اردو شبد کوش	اردو ہندی شبد کوش
لوکوکتیاں	ہندی شبد ارتھ پاریجات وغیرہ

ان زبانوں کے علاوہ بھی دیگر زبان و موضوعات پر لالہ رام نرائن لعل نے کتابیں شائع کیں۔

اس اشاعتی گھر کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا محمد ہادی رسوا کا ناول امراؤ جان ادا پہلی بار یہیں سے شائع ہوا تھا۔ اور رسوا صاحب یہاں خود آیا کرتے تھے۔ یہ بات مجھے انج کمار صاحب سے معلوم ہوئی۔ اور اس بات کی تصدیق استادِ محترم پروفیسر سید محمد عقیل صاحب نے بھی کی ہے۔ عقیل صاحب کی ملاقات رسوا صاحب کے صاحبزادے سے بھی ہوئی ہے جو یہاں Royalty لینے آتے تھے۔ انج کمار صاحب

افسوس کہ ایک صدی سے زیادہ وقفے پر محیط یہ اشاعتی گھر آخری سانس لے رہا ہے۔ حالانکہ ان کی بہت خواہش ہے کہ وہ اردو اس کاروبار کو آگے بڑھائیں۔ اسی بات کے پیش نظر انھوں نے اردو NET اور JRF کی کوچنگ بھی چلا رکھی ہے۔ ان کی آمدنی اب دوسرے ذرائع سے ہوتی ہے لیکن وہ اپنی وراثت کو دل میں سنجوئے ہوئے اس کاروبار میں لگے ہیں۔ انج کمار کے مطابق وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک ہندو ہو کر بھی اردو، عربی اور فارسی کی کتابوں کو فروغ دے رہے ہیں جو ایک سماجی ہم آہنگی کا کار ثواب ہے۔

کے مطابق کبھی کبھی Royalty رسوا صاحب کی دونوں بیویوں کو بھیجوا دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ انج کمار صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فراق گورکھپوری اور ہریونش رائے بچّن بھی یہاں آتے تھے۔ ہریونش رائے بچن کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ان کی مدھوشالا کا قلمی نسخہ (دستی تحریر) ڈیڑھ سال تک یہاں رکھا رہا لیکن شائع نہیں کیا گیا۔ ان کا (انج کمار صاحب کے اجداد کا) کہنا تھا کہ ہم انھیں کتابوں کو شائع کرتے ہیں جن سے سماج کو فائدہ ہو اور تعلیم کا معیار بلند ہو سکے۔ ان کی شائع کی ہوئی کتابیں گورنمنٹ کالجوں میں چلتی تھیں۔ جن میں تعلیمی اور نصابی کتابیں خاص ہوتی تھیں۔ مدھوشالا ان کے نزدیک اہم کتاب نہیں تھی۔ ہندی میں مدھوشالا کو وہ سمجھتے تھے کوئی معمولی درجے کی تصنیف ہوگی جو شراب وغیرہ کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ حالانکہ بعد میں اس کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس کی مقبولیت پر شک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندی میں خمریات پر اس طرح کی یہ پہلی تخلیق تھی۔

انج کمار صاحب نے بتایا کہ ان کا اپنا خود کا پریس بھی تھا جو نیشنل پریس کے نام سے مچھلی بازار، کٹرہ، الہ آباد میں نصب تھا لیکن اب وہ فروخت ہو چکا ہے۔ اُس دور میں انھوں نے اپنے چھاپہ خانہ کو بہتر بنانے کے لیے بدیس جا کر نئی تکنیک سیکھی تھی۔ ایک بدیسی بُک پبلشر ان کے کاروبار میں حصے دار بھی بننا چاہتا تھا اور ان کے کاروبار کو دیکھ کر اسے بین الاقوامی سطح پر لے جانا چاہتا تھا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ انج کمار صاحب کے آباو اجداد اپنی محنت کی کمائی کے کاروبار میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انج صاحب نے کہا کہ اگر اس وقت ہم حصے دار بن جاتے تو آج بین الاقوامی سطح کے بُک پبلشر ہوتے۔

لالہ رام نرائن لعل کی آخری پُشت (اردو کے حوالے سے) انج کمار صاحب اِس وقت اس کتب گھر کے مالک و منتظم ہیں۔ وہ اردو نہیں جانتے اس لیے انھیں اردو کتابوں کے کاروبار میں دقت ہوتی ہے۔ نیز اس مقابلے اور صارفیت کے دور میں ان کے یہاں سے اردو کی کتابیں بھی بہت کم فروخت ہوتی ہیں۔ یہ اشاعتی گھر ان کے بعد شاید ہی آگے چل سکے۔ اسے قسمت کا کھیل کہیے یا اور کچھ کہ انھوں نے شادی بھی نہیں کی۔ ان کے بعد شاید ہی اردو کا سیکشن دیکھنے والا کوئی ہو۔ افسوس کہ ایک صدی سے زیادہ وقفے پر محیط یہ اشاعتی گھر آخری سانس لے رہا ہے۔ حالانکہ ان کی بہت خواہش ہے کہ وہ اردو کے اس کاروبار کو آگے بڑھائیں۔ اسی بات کے پیش نظر انھوں نے اردو NET اور JRF کی کوچنگ بھی چلا رکھی ہے۔ ان کی آمدنی اب دوسرے ذرائع سے ہوتی ہے لیکن وہ اپنی وراثت کو دل میں سنجوئے ہوئے اس کاروبار میں لگے ہیں۔ انج کمار کے مطابق وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک ہندو ہو کر بھی اردو، عربی اور فارسی کی کتابوں کو فروغ دے رہے ہیں جو ایک سماجی ہم آہنگی کا کار ثواب ہے۔ انج کمار صاحب کے والد جب بقید حیات تھے تب بھی راقم ان کے یہاں کتابیں خریدنے جاتا تھا تو ان سے سنتا تھا کہ اب بھی پرانے لوگ پاکستان سے آتے ہیں اور لالہ رام نرائن لعل کا گھر پوچھتے ہیں۔ یہ ان کی مقبولیت کا سبب تھا۔

Dr. Sanjay Kumar Dept. of Urdu
Allahabad University, Allahabad - (UP)

ہندوستان اور ازبکستان کے درمیان سماجی اور تہذیبی روابط

ابوسعد اعجاز

بیسوی صدی کی آخری دہائی کے اوائل میں سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے کے بعد وسط ایشیائی ممالک ایک عجیب وغریب آزمائش کے دور سے گزر رہے تھے۔ جدید دور کی نئی سرحدوں کے بیچ مختلف لسانی اور تہذیبی وراثت کے حامل ممالک کا وجود عمل میں آیا۔ ان ممالک کی اہمیت مختلف وجوہ کی بنا پر مسلم تھی جو اپنے وجود کو منوانے کی صلاحیت کی تمام تر خوبیوں سے آراستہ تھے۔ وسط ایشیائی ممالک، خاص کر قزقستان، ازبکستان اور کرغستان میں بہت سی قدرتی معدنیات کا ذخیرہ موجود ہے۔

وسط ایشیا دنیا کی قدیم لسانی، تہذیبی آماجگاہ ہے۔ یہاں کی تہذیب نے دنیا پر اپنے نقوش چھوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے رنگ میں رنگنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔ اس خطے سے نہ جانے کتنے تاریخی قصے کہانیاں وابستہ ہیں۔ اسی سرزمین سے سگد ینا تہذیب کا عروج ہوا، اسی سرزمین سے البیرونی (1048ھ۔ 1973) جیسا عالم، امام بخاری (870-810) جیسا مستند محدث، امام ابو حنیفہ جیسا جید فقیہ، ابن سینا (1037-980) جیسا جدید میڈیکل سائنس کا موجد، موسیٰ الخوارزمی (850-780) جیسا ماہر حساب داں، الغ بیگ (1449-1344) جیسا ہئیت داں اور علی شیر نوائے (1501-1441) جیسا شاعر پیدا ہوا۔ البیرونی نے نہ صرف اپنے پڑوسی ممالک کی سیر وسیاحت کی، بلکہ وہاں کے مذہبی، سماجی، ثقافتی، تاریخی اور روایتی علوم پر تحقیق بھی کی اور 'کتاب الہند' جیسی شہرۂ آفاق کتاب لکھ کر وسطی ایشیا میں ہندوستان کو متعارف کرایا۔

ازبکستان وسط ایشیائی ممالک سے چاروں طرف سے گھرے ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اموار سیر دریا کے بیچ واقع یہ ملک تقریباً 447 مربع کلومیٹر رقبے پر محیط ہے۔ اس خطے میں بہت سے مشہور شہر آباد ہیں جیسے بخارا، سمرقند، فرغنہ، خیوہ اور خوارزم وغیرہ۔ قدیم ریشمی شاہراہ اسی خطے سے ہوکر گزرتی ہے جس پر تجارتی قافلوں کے ساتھ ساتھ تہذیب وثقافت کا سفر رواں دواں رہا۔ آج کا ازبکستان جس کے کرشمائی اور دلفریب مناظر کو سیاح کی نگاہیں دیکھ کر لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ازبک پلاؤ اور سبز چائے سے خود کو محظوظ کرتی ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروعاتی دور میں ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد وسط ایشیائی ممالک میں سکونت پذیر رہی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سات سے آٹھ ہزار کے درمیان ہندوستانی وہاں آباد تھے جس میں غالب اکثریت سندھ، پنجاب اور ملتان کی تھی ان میں ہر مذہب کے لوگ پائے جاتے تھے۔

ہندوستان اور ازبکستان کے بیچ تہذیبی اور ثقافتی روایت صدیوں پرانی ہے۔ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس رشتے کا رنگ مدہم نہیں ہوا۔ سیاسی، تجارتی اور عصری دانشوری کی روایت کے آثار ہر جگہ ہمیں نظر آتے ہیں۔ ہندوستان اور وسط ایشیا میں نمایاں طور پر مذہب کو اولیت حاصل ہے جن میں بدھ مذہب اور صوفی ازم زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ بدھ مذہب جو انسانی قدروں کا پاسدار ہے، ہندوستان میں پیدا ہوا لیکن ہندوستان کے باہر پروان چڑھا۔ یہ مذہب اپنے پیروؤں کے ذریعہ مذہبی اصولوں اور اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب وثقافت کے علاوہ یہاں کی زبانوں کو بھی اپنے ساتھ دنیا کے مختلف حصوں میں لے گیا۔ اس ضمن میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بدھ مذہب کی تعلیمات نے ہندوستانی زبانوں، رسم الخط اور فلسفہ کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

روایتی رشتوں کی بنیادیں آٹھویں صدی کے نصف اول میں عباسی خلافت کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں تجارتی اور تہذیبی رشتوں کو جلا ملی۔ دہلی سلطنت اور مغل شہنشاہ خاص کر التمش، محمد بن تغلق اور جلال الدین محمد اکبر نے اپنے زمانے میں علوم وفنون کے ماہر لوگوں کو اپنے دربار میں اعلیٰ مقام پر فائز کیا۔ انہیں زمانوں میں فارسی، سنسکرت اور ترکی زبانوں کے بہت سے کاموں کا ترجمہ ہوا۔

مغل فرمانروا اپنی سرحدوں کو مسلسل وسعت دینے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے علوم وفنون کی ترقی سے کبھی غافل نہیں رہے۔ انہوں نے جہاں دنیا بھر کے علماء و دانشوروں سے استفادہ کیا وہیں وسط ایشیا کے علماء و دانشوروں سے چشم پوشی نہیں کی، بلکہ ان کے علم سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان حکمرانوں کا نسبی تعلق بھی انہیں خطوں سے تھا۔

صوفی ازم زندگی گزارنے کا ایک روحانی تصور پیش کرتا ہے جس کے توسط سے ہم خدا تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ سلسلے صوفی ازم کے اہم سلسلے گردانے جاتے ہیں۔ ان تمام کا وجود کہیں نہ کہیں وسط ایشیائی ممالک میں ملتا ہے اور ہندوستان میں اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔ صوفی ازم مذاہب اور تہذیبوں کے بیچ ربط کا کام سرانجام دینے کے علاوہ امن اور بھائی چارگی کو فروغ دینے میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ تمام صوفی امن کے پیغامبر ہونے کے ساتھ ساتھ روحانی اور اخلاقی قدروں کو پروان چڑھانے میں یقین رکھتے تھے۔ ان کی خانقاہیں تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے یکساں طور پر کھلی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں صوفی ازم کے ابتدائی نقوش وسط ایشیائی ممالک سے ملتے ہیں۔ خواجہ سید جلال الدین، حمید الدین ناگوری، بختیار کاکی، فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیا، بابا حاجی علی بخاری اور امیر خسرو کے اجداد کا تعلق ان ہی ممالک سے رہا ہے۔

ہندوستان میں بہت سی دستاویزی اصطلاحات بھی وسط ایشیائی زبانوں سے مستعار لی گئی ہیں۔ جیسے فرمان، فتح نامہ، مثال، تمغہ، حکم، منشور، نشان، مہر اور ایلچی کے علاوہ بہت سے ہتھیاروں کے نام بھی ہم استعمال کرتے ہیں، جیسے توپ، توپچی، بندوق وغیرہ۔ مغلئی کھانے اپنے آپ میں ایک الگ قسم کا ذائقہ رکھتے ہیں جو ہندوستان میں مغل حکمرانوں کے مرہون منت ہیں۔ یہ طرز طباخی وسط ایشیا میں ترکوں نے متعارف کرایا اور اس کے بعد ہندوستانی سرحد میں داخل ہوئی۔ یہاں تک کہ ہندوستان نے ذائقہ کے ساتھ ساتھ ناموں تک کو اپنے یہاں رائج کر لیا، جیسے قورمہ، پلاؤ، قلفی، باقر خانی، حلوا، قیمہ، چائے، سموسہ وغیرہ۔ کھانوں کے علاوہ ہم مختلف سماجی ناموں کو بھی استعمال کرنے لگے جیسے دادا، بابا، باجی، آقا، آپا، خاتون وغیرہ۔

وسط ایشیا میں ہندوستان کے نامور شعرا اور مصنفوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور آج بھی نئے ناموں کو وہاں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بہت

ساری نظموں اور کہانیوں کو ازبک میں اور وسط ایشیائی زبانوں کے ادب کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ ہندوستانی مصنف جن کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان میں مہاتما گاندھی، رابندرناتھ ٹیگور، جواہر لال نہرو، علی سردار جعفری، سجاد ظہیر اور خواجہ احمد عباس قابل ذکر ہیں۔ ان کو وہاں پسند کرنے کی کئی وجوہات تھیں ایک تو وہ دور اشتراکی نظام کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھے مزید یہ کہ ان میں سے بیشتر اشتراکی نظام کے پروردہ تھے۔ اس فکر کے مفکر دنیا میں کہیں بھی ہوں اشتراکی نظام حکومت میں ان کی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ 1947 میں ہندوستان آزاد ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان کا جھکاؤ سوویت یونین کی طرف زیادہ تھا۔

ہندوستانی فلمیں صرف ہندوستان ہی میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی اپنی پہچان بنانے میں کامیاب رہی ہیں۔ وسطی ایشیائی ممالک بھی اس کے سحر سے اچھوتے نہیں رہے۔ وسط ایشیائی ممالک خاص کر ازبکستان میں ہندوستانی فلموں اور نغموں کو بڑے شوق سے دیکھا اور سنا جاتا ہے۔ جس طرح سے ہندوستانی عوام اپنے محبوب سپر اسٹارز کو دل کے قریب رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے انداز کو اپناتے ہیں اسی طرح ازبکستان کی عوام بھی ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ہماری فلموں کے بہت سے ایسے نام ہیں جن کی قدر ومنزلت دونوں ملکوں میں ایک جیسی ہے راج کپور، نرگس دت، سنیل دت، دلیپ کمار، سلمان خان، شاہ رخ خان، امیتابھ بچن، رانی مکھرجی اور عامر خان کے نام قابل ذکر ہیں۔ ازبکستان میں فلمی نغمہ 'میرا جوتا ہے جاپانی' ہر خاص و عام کی زبان پر اپنی نغمگی کا احساس دلاتا ہے۔ آج بھی ازبکستان میں ہندوستانی فلموں کی نمائش بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے اور وہاں کے سرکاری نیشنل چینل پر ہفتے میں کم از کم دو فلموں کی نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ہر دور میں تہذیبی و ثقافتی روابط کو ایک مضبوط ستون کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کے میدان خود اپنے آپ میں وسیع النظری، رواداری، اخوت اور محبت کی شکل میں اجاگر ہو کر لوگوں کے سامنے مثال بنتے ہیں۔ اس ضمن میں انسٹی ٹیوشن اور اکیڈمیاں ایک اہم کڑی سمجھی جاتی ہیں۔ 1955 میں ہندوستان نے ازبکستان میں اپنے کلچرل سنٹر کا افتتاح کیا جس کے تحت ازبکستان میں ہندوستان کی رنگا رنگی کو بروئے کار لانے یا ازبکستان میں ہندوستان کی لسانی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی جہتوں کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس سنٹر نے ازبکستان میں مختلف تنظیموں کے ساتھ مل کر کام شروع کیا۔ اسی سنٹر کے تحت موسیقی اور رقص کے ساتھ ساتھ یوگا کی کلاسوں کا بھی اہتمام کیا گیا۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد وسط ایشیائی ممالک کی جامعات میں ہندی اور اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام تھا۔ تاشقند یونیورسٹی اس لحاظ سے ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ تاشقند یونیورسٹی میں شعبہ برائے انڈیالوجی بھی قائم ہے۔ اس شعبے میں نہ صرف زبانوں کی تدریس بلکہ وہاں پر ہندوستانی تاریخ وثقافت کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں 1962 میں پہلی بار ڈاکٹر قمر رئیس کو اردو اور ڈاکٹر بھولے ناتھ تیواری کو ہندی کے ماہر کے طور پر تقرر کیا گیا تھا۔ آج شعبہ برائے مطالعات شمالی ایشیا تاشقند یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے، ساتھ ہی ہندوستان میں مختلف جامعات میں مطالعات برائے وسطی ایشیا کے شعبے اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہیں ان میں خاص کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ برائے بین الاقوامی مطالعات، جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں اسکول برائے بین الاقوامی مطالعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ممبئی یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی کے علاوہ بہت سارے سنٹر اپنے فرائض کو انجام دے رہے ہیں جس میں تاریخ وثقافت، سیاسی، معاشی، غرض شعبہ ہائے زندگی کے ہر پہلو پر تحقیق وتدریس کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ازبک زبان میں سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کا کورس بھی کرایا جاتا ہے۔

1965 کی ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے دوران سوویت یونین کی مداخلت کی وجہ سے موجودہ ازبکستان کے دارالخلافہ تاشقند میں ایک امن معاہدہ کے لیے دونوں ممالک کے رہنما تیار ہوئے جس میں ہندوستان کی جانب سے اس وقت کے وزیر اعظم جناب لال بہادر شاستری اور پاکستان کی جانب سے جنرل یحییٰ نے امن معاہدہ پر دستخط کئے۔ اس امن معاہدہ کی وجہ سے تاشقند کو امن کا شہر اور بھائی چارگی کی علامت کے طور پہ دیکھا جانے لگا۔ تاشقند سمجھوتے کے بعد ہندوستان اور ازبکستان کے بہت سے شعرا نے منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا جس کو 'ارمغان تاشقند' کے نام سے شائع کیا گیا۔

سوویت یونین کے بکھراؤ کے بعد وسط ایشیائی ممالک میں لسانی، تہذیبی اور نسلی بنیاد پر الگ الگ ملک کا وجود عمل میں آیا۔ پوری دنیا نے اس خطے کو اپنی خارجہ پالیسی کے تحت اپنے سماجی، ثقافتی، سیاسی، معاشی رشتوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ ہندوستان نے بھی اس عمل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی اسی کی وجہ سے ازبکستان کے صدر کا پہلا بیرون ملک سفر ہندوستان کا تھا جس سے دونوں ممالک کے درمیان سفارتی، سیاسی، معاشی، ثقافتی، تہذیبی رشتوں کو جلا ملی اور آج بھی یہ رشتے اپنی کامیابی کی طرف گامزن ہیں۔ اسی کڑی میں انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن کے تحت ہر سال ازبکستان کے طلبہ کو ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ دیا جاتا ہے جس سے وہ طلبہ ہندوستانی جامعات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سنہرا موقع پاتے ہیں۔ 2013-14 کے سیشن میں 14 طلبہ کو وظیفہ دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ICET کے تحت ٹکنیکل تعلیم کے لیے بھی وظیفہ کا انتظام ہے۔ ICET نے وظیفہ کی تعداد کو بڑھا کر 150 تک کر دیا ہے۔ جس کا فائدہ وہاں کے طلبہ کو براہ راست مل رہا ہے۔

2003 میں ہندوستان اور ازبکستان کے ثقافتی رشتوں کو مضبوط کرنے کے مقصد کے تحت ایک دوطرفہ پرگرام کا انعقاد کیا گیا اسی ضمن میں تاشقند میں ایک نمائش کا انعقاد کیا گیا جس میں ہندوستانی موسیقی اور اس کے ساز وسامان کے علاوہ ہندوستان کی مشہور مدھوبنی پینٹنگ کی نمائش کی گئی جس کی وہاں کی عوام نے دل کھول کر پذیرائی کی۔ 2005 میں ہندوستانی موسیقی گروپ نے وہاں کے مشہور کلچرل میلے 'شرق' میں شرکت کی۔ ساتھ ہی ساتھ ازبکستان کی تہذیبی و ثقافتی وراثت کو پروان چڑھانے میں اہم کڑی اور عوامی اسٹیج کی نئی پہچان 'سگدینا' آرکیسٹرا کے ایک گروپ نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ 2013 میں ازبکستان کا ایک ڈانس گروپ، ہندوستان کے صوبہ ہریانہ کے سورج کنڈ میلے میں اپنے فن سے لوگوں کے دلوں میں اپنی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب رہا۔

غرض وسط ایشیائی ممالک بالخصوص ازبکستان کی تہذیب و ثقافت، عادت واطوار وغیرہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور عادت و اطوار میں ایک حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جو دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب تو کرتی ہی ہیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو سمجھنے میں مددگار بھی ثابت ہوتی ہیں۔ اس کا اثر دونوں ملکوں کے درمیان بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے اور آئندہ بھی اس کی مثالیں ملتی رہیں گی۔

■

Abu Sad Aijaz Research Scholar, Academy of International Studies, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025
Mob.: 9968401636, Email.:sad1984@gmail.com

موسیقی اور ہماری زندگی

اختر آزاد

انسان ارتقائی دور میں جیسے جیسے تہذیب کی منزلوں سے آگے بڑھتا رہا، سنگ تراشی، رقص، مصوری، موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ بھی ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ آج 'فنون لطیفہ' ہماری زندگی کا ایک حصہ ہے اور اس کا ایک اہم جُز 'موسیقی' ہے، جسے اپنی زندگی سے اگر الگ کر دیں تو سماجی توازن بگڑ جائے گا۔

سُر کی پُر مغز زبان 'موسیقی' ہے۔ یعنی ایک ایسی زبان جو ساز کی سنگت میں آ کر کائنات کو اپنے حصار میں محصور کر لے اور فطری طور پر اس کا مثبت یا منفی اثر اس طرح پڑے کہ زندگی کے نگار خانے میں ہلچل مچ جائے... سُر تال سے سجے الفاظ جب نغموں میں ڈھل کر ہماری سماعت سے ٹکراتے ہیں اور دماغ کے تاروں پر انگلی پھیرتے ہوئے روح سے ہم کلام ہوتے ہیں تو اس کیفیت سے گزرتے ہوئے کبھی ہماری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور کبھی خوشیوں کی قوس وقزح چہرے پہ اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے۔

موسیقی کی بنیاد جہاں 'ترنُّم' ہے وہیں شاعری کی روح 'علم عروض' ہے۔ ایک بہترین موسیقی کے لیے دونوں کے درمیان آہنگ کا ہونا ضروری ہے۔ جسے نہایت ہی فنکاری کے ساتھ ایک دوسرے میں اس طرح پرویا جائے کہ دونوں کا حُسن دوبالا ہو جائے۔ کبھی کبھی کمزور شاعری کو بہترین موسیقی اپنے دم پر سامع کے لیے ایسی صدا بند کرتی ہے کہ وہ اس کے سحر میں ڈوب جاتا ہے۔

مولانا رومی جیسے عظیم شاعر نے ہی اپنی مثنوی کا آغاز کسی حمد، نعت سے نہ کر کے ایک ایسے شعر سے کیا ہے جس میں بانسری کی گونج سُنائی دیتی ہے۔ شعر دیکھیے:

بشو از نے چون حکایت میکند
وز جدائی ہا شکایت میکند

(بانسری کو سنو جب وہ اپنی کہانی سناتی ہے، اور جدائیوں کا رونا روتی ہے)

آیئے اب اصل موضوع کی طرف چلتے ہیں۔ موسیقی انسانی گلے سے پیدا ہونے والا وہ سُر تال ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی کے تقریباً تمام شعبہ جات میں اپنا اثر رکھتی ہے۔ لیکن یہ انسان کی اپنی ذہنیت پر منحصر ہے۔ وقت، موسم، واقعہ، حادثہ، خوشی، غم یہ ساری چیزیں انسانی ذہن کو مہمیز کرتی ہیں۔ حالات کے پیش نظر موسیقی انسان کی پسند کا حصہ بنتی ہے۔

جہاں بچے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہیں، وہیں موت کے بعد گاجے باجے کے ساتھ ارتھی لے جانے کی روایت ہمارے ہندوستانی سماج میں موجود ہے۔ پیدائش اور موت کے درمیان بے شمار ایسے لمحات خوشیوں کے آتے ہیں جسے ہم رقص و سرود سے مناتے ہیں۔ اگر موسیقی کا تڑکا نہ ہو تو گویا ہم نے خوشیاں منائی ہی نہیں۔ بڑے بڑے لاؤڈ سپیکر کا استعمال دور دراز تک اپنی خوشیاں پہنچانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

بیش تر لوگ تہوار کے موقع پر موسیقی سے لطف اندوز ہونا پسند کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ہلکی موسیقی سے تو کچھ تیز آواز کو ترجیح دیتے ہیں۔ شادی میں ہلدی کے گیت گا کر عورتیں ماحول کو خوشگوار بناتی ہیں۔ بارات میں ڈسکو پر نوجوانوں کے پاؤں تھرکتے ہیں۔ دلہن کے گھر پہنچتے ہی 'دل والے دُلہنیا لے جائیں گے' جیسے گیت اپنا جادو بکھیرتے ہیں، وہیں 'بابل کی دعائیں لیتی جا، جا تجھ کو سکھی سنسار ملے' جیسے نغموں کے بغیر ہندوستانی دُلہن کی رخصتی ہی ممکن نہیں۔

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

پندرہ اگست اور چھبیس جنوری جیسے قومی تہواروں پر جب ایسے نغمے اور ترانے فضاؤں میں رقص کرتے ہیں تو لوگ حبّ الوطنی کے جذبے سے سرشار شہیدوں کی قربانیوں کو یاد کرتے ہیں۔ آنکھیں نم ہوتی ہیں اور ساتھ ساتھ آزادی کا جشن بھی جاری رہتا ہے:

اے میرے وطن کے لوگو! ذرا آنکھ میں بھر لو پانی
جو شہید ہوئے ہیں ان کی ذرا یاد کرو قربانی

جوانوں کے اندر جوش وولولہ پیدا کرنے کے لیے علامہ اقبال کا قومی گیت 'ترانۂ ہندی' 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' کی دُھن چاروں طرف گونجتی ہے۔ مقبولیت میں آج تک کوئی گیت اس کی برابری نہیں کر سکا۔ یہاں تک کہ جب خلا میں پہلی بار ہندوستان کی نمائندگی کرنے والے راکیش شرما سوویت راکٹ Soyuz T-11 سے 02 اپریل 1984 کو پہنچے اور سات دن تک رہے تو اس وقت کی وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی نے پوچھا تھا۔ ''تمھیں بھارت ورش کیسا لگ رہا

ہے۔'' خلا سے بے ساختہ ان کی زبان سے یہی نکلا تھا۔ ''سارے جہاں سے اچھا.....'' اس واقعہ کا جب بھی ذکر آتا ہے اردو والوں کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے..... قومی اور بین الاقوامی سطح پر جو بھی پروگرام ہوتے ہیں اس میں قومی ترانہ 'جن گن من' ہماری شان میں اضافہ کرتا ہے۔

دوران سفر موسیقی سے لطف اندوز ہونا لوگوں کی فطرت میں شامل ہے تاکہ پریشانی موسیقی میں تحلیل ہو کر کافور ہو جائے اور ان کا سفر آسان سے آسان تر ہو جائے۔ لیکن یہ منحصر ہے کہ سفر کیسا ہے؟ اس کی مناسبت سے لوگ ویسی ہی تیاریاں کرتے ہیں۔ آج تو موبائل اور پین ڈرائیو کا زمانہ ہے۔ لوگ اپنی پسند کے اتنے سارے نغمے محفوظ کر لیتے ہیں کہ سفر جیسا بھی ہو، موسیقی ان کی تھکان کو زائل کر کے تازگی بخشتی رہتی ہے۔ کچھ لوگ موسیقی کے اتنے عادی ہوتے ہیں کہ صبح سویرے ضروریات سے فارغ ہوتے ہی میوزک آن کر دیتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کی سماعت میں میٹھے بول کے رس جب تک ٹپ ٹپ نہ ٹپکے، نیند کی دیوی مہربان ہی نہیں ہوتی۔

اس نفسیات سے جڑے لوگوں کے لیے جب تک میوزک چلتا رہتا ہے۔ طمانیت سے بھرپور نظر آتے ہیں۔ لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور دوسرے کام کو نپٹاتے بھی رہتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی بجلی گئی، رفتار میں کمی آ جاتی ہے۔ کام میں دل نہیں لگتا۔ جیسے کوئی اہم شے اس کے وجود سے کٹ کر الگ ہو گئی ہو۔ حرکات وسکنات میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ لیکن بجلی واپس آتے ہی ایک بار پھر موسیقی کمرے میں جادو بکھیرنا شروع کر دیتی ہے۔ جسم میں توانائی لوٹ آتی ہے اور کام کرنے کی رفتار پہلے کی طرح تیز ہو جاتی ہے..... ایسا کچھ طالب علموں کے ساتھ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب تک میوزک سسٹم آن ہے تب تک وہ دلجمعی کے ساتھ اپنے نوٹس بناتے ہیں لیکن جیسے ہی موسیقی کا رشتہ ٹوٹا ایک بے چینی سی دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تعلیم کے دوران موسیقی طالب علموں کے لیے مضر ہے لیکن کچھ کے لیے یہی مدھر سُر دلچسپی کا سبب بھی بنتا ہے۔

موسیقی سے قوت حافظہ پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اوائل عمری میں طالب علموں کے ادراک و وجدان کو موسیقی جلا بخشتی ہے۔ آج پوری دنیا کمپیوٹر ایج میں داخل ہو چکی ہے۔ لوگ کمپیوٹر پر کام بھی کرتے ہیں اور ہلکی موسیقی بھی سنتے ہیں۔ دیر تک کام کرنے والوں کے لیے موسیقی ایک طرح سے توانائی کے حصول کا کام کرتی ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب انسان تنہا ہوتا ہے تو موسیقی کا سہارا لیتا ہے۔ جب سنسان راہوں پر چلتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے تو وہ ہم سفر کے طور پر موسیقی سے دوستی کر لیتا ہے، گنگنانا شروع کر دیتا ہے تاکہ خوف پر غالب ہو سکے۔ کھانے کے درمیان بھی لوگ مدھم سر میں موسیقی سننا پسند کرتے ہیں۔ غمگین اور ذہنی طور پر پریشان شخص خود کو باہر نکالنے کے لیے موسیقی کا سہارا لیتا ہے۔

کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بھی 'چک دے انڈیا' جیسے گیت توانائی کا کام کرتے ہیں۔ انسانیت کا درس دینے کے لیے بھی 'ہندو بنے گا نا مسلمان بنے گا، انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا' جیسے گیتوں نے قومی بھائی چارے کے پیغام کو عام کیا ہے۔ بڑے بڑے مفکر، دانشور، سیاست داں اپنی تقاریر میں جان ڈالنے کے لیے کچھ ایسے اشعار کا استعمال کرتے ہیں جو سننے والے پر فوری طور پر اثر انگیز ہوتے ہیں۔ زندگی کے اسٹیج پر کھیلا جانے والا کوئی بھی ڈرامہ ہو اس کی کامیابی کی ایک ضمانت موسیقی بھی ہے۔

میوزک انٹلی جنس (جارجیا ٹیک) کے ڈائرکٹر پراگ کورڈیا ان دنوں ایک ایسی چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں کہ ''سائنسی مسائل اور ریاضی کو حل کرنے کے لیے موسیقی کس طرح معاون ثابت ہو سکتی ہے''۔ ان کا یہ بھی سوچنا ہے کہ جب موسیقی غنائی تجربات، قلب و ذہن کو جلا بخش رہی ہیں تو پھر سائنس اور ٹیکنالوجی پر بھی اس کے مثبت اثرات پڑیں گے۔

ایک دلچسپ بات جو مجھے یہاں گوش گذار کرنی ہے کہ بہت سارے ڈاکٹر علاج کے لیے موسیقی کا سہارا لیتے ہیں۔

موسیقی ابتدائی دور سے معاشرے میں روشن فکر پیدا کرنے میں معاون رہی ہے، یہ آرٹ اور ادب کی طرح ہمارے کلچر کا حصہ بھی ہے۔ یہ کلچر اپنے سینے میں کائنات کی طرح پھیلاؤ رکھتا ہے۔ اس سے معاشرتی اقدار کو سنوارنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ موسیقی کا نہ کوئی وطن ہوتا ہے اور نہ ہی سرحد:

پنچھی، ندیاں، پون کے جھونکے
کوئی سرحد نہ انھیں روکے

موسیقی سرحدوں کی بندشوں کو نہیں مانتی۔ ہواؤں کے دوش پر سفر کرتی ہے۔ ایسے وقت میں بھی جب ملکوں کے درمیان ماحول کشیدہ ہو۔ لیکن فن کے پرستاروں کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ (یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی کوئی نازیبا حرکت وقتی طور پر کسی فنکار کے پیروں میں بیڑیاں باندھ دیتی ہے) جنگ کے میدان میں حریف اپنے پسندیدہ فنکاروں کے نغمے سنتے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ فن کار کبھی ایک ملک کا نہیں ہوتا۔

آج لَے اور سُر کے بغیر ہم زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں موسیقی ایک انڈسٹری کا درجہ رکھتی ہے۔ بے شمار لوگ اس فن کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ کوئی لکھتا ہے۔ کوئی ساز تیار کرتا ہے اور اس کے بعد کوئی اسے اپنی آواز کے جادو میں ڈھال کر لوگوں کی روح میں اُتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ موسیقی نے آج کتنے گھروں میں زندگی کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ کتنے لوگوں کو روزی روٹی سے جوڑ رکھا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو تب ہوگا جب آپ اس کے متعلق ریسرچ کرنے بیٹھیں گے۔

لوری موسیقی ہے۔ رونا موسیقی کا ہی ایک حصہ ہے۔ نیند کے خراٹے میں بھی موسیقی ہے۔ پہاڑوں سے گرتے ہوئے پانی میں موسیقی۔ بارش کی رِم جھِم میں موسیقی۔ ہوا کی سرسراہٹ میں موسیقی۔ بادل کی گڑگڑہٹ میں موسیقی۔ سوکھے پتّوں کی چرچراہٹ میں موسیقی۔ پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ میں موسیقی۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ میں موسیقی۔ ہونٹوں کی تھرتھراہٹ میں موسیقی۔ چوڑیوں کی کھنک میں موسیقی۔ پائل کی چھم چھم میں موسیقی۔ سمندر کی لہروں میں موسیقی۔ آنکھوں کی جھیل سی گہرائی میں موسیقی۔ کتابوں کے اوراق میں موسیقی۔ پنکھے کی رفتار میں موسیقی۔ جلتی آگ سے اُٹھتی چنگاریوں میں موسیقی۔ ٹرین کی چھک چھک میں موسیقی۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک میں موسیقی۔ ہوائی جہاز کی اُڑان میں موسیقی۔ پھولوں پر منڈلاتے بھنوروں کی گنگناہٹ میں موسیقی۔ کمپیوٹر کے کی بورڈ پر رقص کرتی انگلیوں میں موسیقی۔ قلم کی صرصر میں موسیقی۔ کبوتر کی غٹرغوں میں موسیقی۔ کوئل کی کوک میں موسیقی۔ شیر کی دہاڑ میں موسیقی۔ سائل کی فریاد میں موسیقی۔ گھائل کی آہ میں موسیقی۔ حسن کی انگڑائی میں موسیقی۔ موسیقی کہاں نہیں ہے...؟ یہاں تک کہ دو نفوس کے درمیان سانسوں کی بے ہنگم آمد و رفت میں بھی موسیقی اپنا جلوہ دکھاتی ہے جس کے نتیجے میں افزائش نسل کا کاروبار پروان چڑھتا ہے۔ یعنی زندگی کے ہر رنگ میں موسیقی ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے میں موسیقی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہماری زندگی بے لطف اور بے کیف ہو کر رہ جائے گی۔

■

Dr. Akhtar Azad House No-38, Road No.:1
Azad Nagar Mango, Jamshedpur - 832110
Mob.: 9572683122 , dr.akhtarazad@gmail.com

سید اطہر رضا بلگرامی

ہندوستان میں غربت وافلاس کا تصور

اقتصادی ومعاشرتی دائرے میں

مفلسی، تنگ نظری، زبوں حالی، مفلوک الحالی، کم مائیگی و افلاس نہ جانے کتنے الفاظ ہیں جو معاشرے کی اقتصادی، سماجی ومعاشرتی پستی کے اظہار کے لیے مروج ہیں۔ ایک مطمئن و آسودہ زندگی گزارنے کے اثاثوں سے محرومی کا نام مفلسی ہوسکتا ہے۔ تنگ دستی ہوسکتا ہے، غربت ہوسکتا ہے، مفلوک الحالی ہوسکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسانی معاشرے کا ایک حصہ ہمیشہ سے ان اثاثوں سے محروم رہ کر تنگ دست رہا ہے۔ فاقہ زدہ چہرے، بیمار و لاغر جسم، لباس سے محروم بدن، تنگ دست و تاریک اور گندی کوٹھریاں بیماریوں کا لامتناہی سلسلہ ان کی خصوصی شناختیں بن جاتی ہیں۔ مفکرین نے غربت کی ان ہی شناختوں کے ہمراہ پہچان کرائی ہے۔ ان ہی شناختوں کو تولا، ناپا ہے اور غربت کی سنگینی کا احساس کرایا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صحت مند دماغ وتعمیری رجحانات صحت مند جسم وصحت مند معاشرے کی غمازی کرتے ہیں۔ جہاں صحت مند جسم ہی نہ ہو وہاں صحت مند خیالات، تعمیری رجحانات، حوصلہ افزا جہد، اچھی تہذیب و معاشرت کی کوئی کیا امید کرسکتا ہے۔ غربت وافلاس کا یہ ایسا مہلک دائرہ ہے جو تنگ حالی و ناآسودگی کے نتیجے میں دھیرے دھیرے پنپتا ہے اور پورے معاشرے کو ذہنی، اخلاقی، تہذیبی و معاشرتی افلاس میں لپیٹ کر انسانیت کو ہی فنا کردینے کی قوت رکھتا ہے۔ مادی و اقتصادی ناآسودگی کے طول وعرض، گہرائی و بلندی کو مختلف عوامل کی مدد سے ناپنے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ اس کی سنگینی کا اندازہ لگایا جاتا رہا ہے لیکن جہاں ذہنی، اخلاقی وتہذیبی پستیاں شروع ہوجائیں وہاں ایسے وبائی افلاس کی احاطہ بندی چند نمایاں عوامل کی شماریاتی مشقوں کے ذریعے نہیں کی جاسکتی۔ اب تک غربت وافلاس کے سلسلے میں تمام تر ریسرچ، مطالعہ و پیمائش، اقتصادی دائرے تک محدود نظر آتی ہیں۔ اقتصادی افلاس، ذہنی و اخلاقی پستیوں کی کن سطحوں تک معاشرے کو گرا دیتا ہے اس طرف توجہ کم نظر آتی ہے۔

ہاں علامہ اقبال نے اس پستی کا احساس کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف 'علم الاقتصاد' (1930) کے دیباچے میں فرمایا:

''یہ بات روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ہے اور چپکے چپکے اس کے ظاہری و باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا کہہ لو ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسان پر بہت برا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّہ آئینے کو اس قدر زنگ آلود کردیتی ہے کہ اخلاقی وتمدنی لحاظ سے اس کا وجود عدم برابر ہوجاتا ہے۔''

غور کیجیے علامہ اقبال نے 1930 میں ہندوستان کی غربت کی جو حقیقی تصویر پیش کی کیا اس کو ہندسوں اور ان کے سافٹی کیٹیڈ (Sophistecated) تجزیوں کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے۔ عصر حاضر کے مفکرین کو سماجی مسائل کے تجزیوں میں Quantitative Demension کی کوتاہیوں بندشوں کا احساس بخوبی ہے۔ اسی لیے غربت جیسے سماجی مسائل کے تجزیوں میں وصفی پیمائشوں

آج معاشرے کی غربت و افلاس کی جس شدت سے تشہیر کی جارہی ہے شاید ہی کسی دوسرے سماجی مسئلہ کو ایسی شہرت ملی جو سماجی و اقتصادی علوم کے ماہرین، مقتدر تحقیقی اداروں و تنظیموں اور حکومت کی وزارتوں میں مختلف مطالعوں، ریسرچ سروے اور سمیناروں کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ غربت و افلاس کا صحیح تصور کیا ہے؟ اس کی پہچان کیا ہے؟ ماہیت کیا ہے؟ عوامل کیا ہیں؟ وجوہات کیا ہیں؟ اور اس کے سدباب کے راستے کیا ہیں؟ مزید علم ریاضی و اعداد و شمار کی مختلف ٹیکنیک کے ذریعے غربت کے طول و عرض، گہرائی و بلندی کی پیمائش بھی جاری ہے۔

(Qualitative Dimension) کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔

غربت وافلاس کی بدلتی قدریں

ہر دور اور ہر ملک میں غربت و افلاس کو سمجھنے، پہچاننے اوراس کے دائرۂ اثر کو متعین کرنے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔لیکن معاشرتی قدروں کی تبدیلیوں کے ساتھ اس کی پہچان اور قدریں بدلتی رہی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب غربت و افلاس کو عذاب الٰہی اور بدقسمتی کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔اس کو گناہوں کی سزا کے طور پر قبول کیا جاتا تھا اور غربت و افلاس میں مبتلا افراد کو ہمدردی کا مستحق سمجھا جاتا تھا اس دور میں غربت و افلاس کو ایک خاص تہذیبی دائرے میں تحفظ ملا ہوا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد صنعتی انقلاب،ملکوں کی آزادی، آزاد معیشتوں کے سیلاب اور بازار کی طاقتوں کی دراندازی نے ان تمام قدروں کو دھیرے دھیرے بدل ڈالا۔ آج معاشرے کی غربت کو عذابِ الٰہی، گناہوں کی سزا و بدقسمتی نہ سمجھ کر حقیقت پسندانہ فکر کے ساتھ بڑھتی آبادی، وسائل زندگی کی تنگی و کمیابی، غیر منصفانہ نظام تقسیم سے پیدا عدم مساوات، تعلیم وتربیت کے مواقع میں تنگی کا پرتو سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً غربت و افلاس عذاب بھی ہے اور سزا بھی ہے لیکن یہ عذاب غیب سے انسانوں پر مسلط نہیں ہوا بلکہ ہمارے ہی معاشرے کی کارکردگی کا نتیجہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں غربت وافلاس کو ایک سنگین ملک گیر مسئلہ سمجھا گیا ہے۔اس کو محض غیرت، خودداری و تہذیب میں پوشیدہ رکھ کر پرورش کرتے رہنے کو پورے معاشرے کی خودمختار ومساوی ترقی کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا گیا۔

آج معاشرے کی غربت و افلاس کو جس شدت سے تشہیر کی جارہی ہے شاید ہی کسی دوسرے سماجی مسئلہ کی ایسی شہرت ملی جو سماجی و اقتصادی علوم کے ماہرین، مقتدر تحقیقی اداروں وتنظیموں اورحکومت کی وزارتوں میں مختلف مطالعوں، ریسرچ سروے اور سمیناروں کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ غربت وافلاس کا صحیح تصور کیا ہے؟اس کی پہچان کیا ہے؟ ماہیت کیا ہے؟ عوامل کیا ہیں؟ وجوہات کیا ہیں؟ اوراس کے سدباب کے راستے کیا ہیں؟ مزید علم ریاضی و اعداد و شمار کی مختلف ٹیکنیک کے ذریعے غربت کے طول وعرض، گہرائی و بلندی کی پیمائش بھی جاری ہے۔

کچھ سائنٹفک ذہنوں نے خط افلاس (Poverty Line) کو متعارف کیا۔ کچھ مخصوص عوامل جیسے سطح آمدنی و صرف، غذائی سطح (Calories Intake) کی مدد سے ایک سطح کا تعین کیا گیا اور بتایا گیا کہ کتنے افراد اس سطح سے بلند ہیں، جو بہتر زندگی کے حامل ہیں اور کتنے افراد اس سطح سے نیچے ہیں، جن کو غربت کے دائرے میں رکھا جاسکتا ہے۔عصر حاضر میں غربت کی یہ سرحد اتنی شہرت پا چکی ہے کہ حکومت غریبی دور کرنے کے تمام پروگراموں میں بطور نشانہ (Target) اس کو استعمال کرتی ہے تاکہ یہ واضح ہوسکے کہ ان اسکیموں کی عمل برآوری کی بدولت کس مقررہ مدت تک کتنے افراد کو اس سرحد سے بلند کیا جاسکتا ہے۔

پھر غربت کے تصور میں اور وسعت پیدا کی گئی۔ اب غربت کو آمدنی وصرف اور کیلوریز کے دائرے سے نکال کر انتخابات مواقع وسہولتوں اور استعداد کے وسیع دائرے میں لے آیا گیا۔خیال یہ کیا گیا کہ اگر افراد کے گرد و پیش مواقعے کے دائرے وسیع ہوتے رہیں تو حسب استعداد و انتخابات انسان ان سے مستفید ہوتا رہے گا اور یوں غربت کو دور کرتا رہے گا۔ اس طرح غربت و افلاس کے بڑھنے و گھٹنے کا تعلق انتخابات کے تنگ ووسیع ہونے اوراستعداد کے پست وبلند ہونے سے جوڑا گیا۔

ابتدا میں اعداد و شمار کے ذریعے قابل تخمینہ شناختوں مثلاً فی کس آمدنی وخرچ کے ذریعے غربت و افلاس کو پہچاننے کی کوشش کی گئی لیکن جب غربت کا صحیح چہرہ واضح نہ ہوا تو تشخیص میں وسعت و گہرائی پیدا کرکے نسبتاً مشکل و پیچیدہ عنصر غذائیت (Calories) کو بنیاد بنایا گیا۔ دراصل آمدنی وخرچ کا تعلق زر کی قوت خرید سے ہے۔زر کی قوت خرید اگر گر رہی ہے قیمتیں بڑھ رہی ہیں تو محدود آمدنی والے گری ہوئی قوت خرید کی بدولت پست معیار زندگی کی سرحد میں داخل ہوکر غربت کے دائرے میں آجائیں گے۔ دوسری صورت میں یعنی زر کی قوت خرید بڑھنے پر (قیمتوں کے گرنے پر) وہ غربت کی سرحد سے بلند ہوجائیں گے۔ چونکہ زر کی قوت خرید میں اتار چڑھاؤ جس کو اصطلاحاً افراطِ زر کے مدوجزر کہا جاتا ہے، مسلسل جاری رہتا ہے، اس لیے آمدنی وخرچ کے عوامل کے ذریعۂ غربت کے تصور کی وضاحت غیر معتبر بن جاتی ہے۔ اس لیے مفکرین کا ذہن کیلوریز غذائیت کی سطح کی طرف مڑا۔

میڈیکل سائنس نے بتلایا کہ انسان جو بھی غذا لیتا ہے، وہ غذائیت یعنی پروٹین وحیاتیاتی حرارتوں (کیلوریز) میں بدل جاتی ہے۔صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ان کی مقررہ مقدار کا لیتے رہنا ضروری ہے۔ یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ دیہی علاقے میں فی کس یومیہ 2400 کیلوریز اور شہری علاقوں میں فی کس یومیہ 2100 کیلوریز کا لینا ضروری ہے۔کیلوریز کی اسی لازم سطح کو Poverty Line بنایا گیا اور تخمینوں سے اندازہ لگایا گیا کہ دیہی وشہری علاقوں میں کتنے اس سرحد سے بلند اور کتنے اس سے پست ہیں۔

اس نظریہ میں بھی شبہات کے بہت سے پہلو نمایاں ہوگئے۔ ہندوستان میں نہ صرف شہری ودیہی بلکہ علاقائی اعتبار سے بھی غذائی عوامل مختلف ہیں۔ان کا کوئی یکساں معیار نہیں ہے۔ اس لیے کیلوریز کی سطح کا تعین سب علاقوں کے لیے یکساں طور پر طے نہیں کیا جاسکتا۔ پھر یہاں معاشرتی پہلو بھی موثر طور پر بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً گاؤں و دیہات کے لوگ غریب و امیر، عمر و جنس کی تفریق کے بغیر چلتے پھرتے کھیتوں و باغوں سے تازہ ہری سبزی، پھل، پتے، کونپلیں، مونگ پھلی، شکر قند، گڑ، راب اور گنے وغیرہ کھاتے رہنے کے عادی ہیں۔ان

کوان اشیا کی کوئی قیمت بھی نہیں چکانی پڑتی۔ غربت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ غریب تو ہمارے مقررہ پیمانوں سے کہیں زیادہ کیلوریم لیتے رہنے کے عادی ہیں تو کیا اس اعتبار سے ان کو غربت کی سطح سے بلند سمجھا جائے گا۔ کیلوریز وغذائیت کے اعتبار سے کیا یہ غربت کی صحیح تشخیص ہوگی۔

مفکرین نے فکر کو اور وسعت دی اور اب مواقع و انتخابات اور استعداد کی وسیع دنیا میں داخل ہوئے اور بتلایا

کہ معاشرے میں چاروں طرف پھیلے ہوئے مواقع اور ان سے مستفید ہونے کی صلاحیت، غربی و امیری کی شناخت کرائیں گے۔ مجبوریوں ومحرومیوں سے نجات کا یہی راستہ ہے جس قدر مواقع و انتخابات وسیع کرتے جائیں گے، عوام حسب استعداد ان سے فائدہ اٹھا کر معیار زندگی گزارتے جائیں گے اور گویا اسی قدر غربت بھی دور ہوتی جائے گی۔ لیکن اعداد وشمار کے ذریعے مواقع وانتخابات کی وسعت ودستیابی تو بتلائی جاسکتی ہے، یہ بتلانا اور تخمینہ لگانا مشکل ہے کہ کتنے افراد صحیح معنی میں ان سے مستفید ہونے کے اہل ہیں۔

مواقع فراہم کرنا اور ان میں وسعت پیدا کرتے رہنا حکومت کا کام ہے۔ یہ امید کی جاسکتی ہے کہ عوام حسب اہلیت و صلاحیت ان وسیع ہوتے مواقع سے انتخابات کریں گے اور مستفید ہوکر غربت کی سطح سے بلند ہوں گے۔ لیکن انسان اپنے گرد وپیش پھیلتے اور وسیع ہوتے مواقع کو کتنا پہچان پاتا ہے۔ ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو کیسے ابھارتا ہے، کس طرح ان کی طرف مائل ہوتا ہے؟ یہ سب اس پر منحصر ہے کہ اس کی تعلیم وتربیت کا معیار کیا ہے۔ کس قدر وہ اپنی تہذیبی و معاشرتی روایتوں و قدروں سے جڑا ہے۔ اس کے رجحانات، ترجیحات اور ترغیبات کو اس کی تہذیبی و معاشرتی قدریں کس طور پر طے کرتی ہیں؟ اس کی طبیعت مزاج اور نفسیات کیا ہے؟ ان تمام عوامل کو گرفت میں لے کر ہی صلاحیتوں اور مواقع سے مستفید ہونے کی سطح کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

اب کیا اعداد وشمار کے عظیم ذخائر وحساس تجزیاتی تکنیک ان تمام مختلف النوع صفاتی عوامل کا احاطہ کرنے کے اہل ہوسکتے ہیں۔ روایتوں کی پاسداری انسان کو غیر محسوس طور پر کتنا پابند بنائے رکھتی ہے۔ ہمارے تہذیبی اقدار، رجحانات وترجیحات کس کس طرح بندشوں میں جکڑے رکھتے ہیں، کیا کوئی اعداد وشمار ان کی حساس تکنیک ہندسوں میں ناپ تول کر بتلانے کی اہل ہوسکتی ہیں۔ ہم نے جتنا اعداد وشمار پر زور دیا، جتنا اس کو وسیع بنایا، جتنا تجزیاتی طریق کار کو حساس بنایا، غربت جیسے سنگین سماجی مسئلے کی پیچیدگیوں کو نہ سلجھا سکے۔

ہماری ناکامیوں نے فطری طور پر شماریاتی تجزیوں سے صفاتی تجزیوں کی طرف موڑا اور مسئلے کی گہرائی میں اترنے کے لیے یقین کرلیا گیا کہ محض اعداد وشمار پر تکیہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہم کو ان عوامل کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا جن کا تعلق ہندسوں وگنتیوں سے زیادہ صفات سے ہے اور جن کو مشاہداتی رخ سے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے اور بیانیہ انداز سے زیادہ بہت طور پر واضح کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ اعداد وشمار کی مشقیں اور ان کے تجزیے سماجی مسائل کی گہرائیوں میں اترنے میں ناکامیاب رہتے ہیں۔ اس لیے ہماری تشخیص و تشریح ہمیشہ مختلف اعتراضات وشبہات میں گھر کر غیر معتبر بنی رہتی ہے۔

غربت وافلاس کا وسیع دائرہ

یہ صحیح ہے کہ غربت وافلاس کی بنیاد اقتصادی وسماجی عوامل پر ٹکی ہے اور مفکرین کی تمام تر توجہ انھیں کمزور عوامل کو مضبوط بنانے پر مرکوز ہے۔ سماج کا ایک طبقہ اگر زندگی کی بنیادی اور اہم ضروریات جیسے غذا، کپڑا، مکان، صاف ستھری ہوا و پانی، تعلیم، علاج معالجہ سے بڑی حد تک محروم ہے یا بس گزر بسر کرنے کی حد تک قادر رہے تو ایسے طبقے کو غریب سمجھا جائے گا۔ زندگی کی ان بنیادی ضرورتوں سے محرومی جس قدر بڑھتی جائے گی غربت کا تصور اسی قدر سنگین بنتا جائے گا۔ اس طرح غربت کا تصور گویا افراد اور ضروریات زندگی کے وسائل کے درمیان عدم توازن یا عدم مساوات کا تصور ہے۔ اگر مطمئن و آسودہ زندگی کے تمام وسائل پر معاشرے کے ایک حصے کو ہی قدرت حاصل ہو تو یقیناً دوسرا حصہ ان سے محروم ہوکر غریب سے غریب تر بنتا جائے گا یا یوں سمجھیے کہ خوش حال زندگی کے وسائل پر قدرت رکھنے اور نہ رکھنے کا دوسرا نام امیری وغریبی ہے۔

اس طرح غربت کا تصور شخصی وانفرادی نہ ہوکر نسبتی ہے یعنی ہم کس فرد، جماعت یا ملک کو غریب اس کے مدمقابل دوسرے شخص، جماعت یا ملک کی نسبت سے کرتے ہیں۔ امریکہ کا غریب ترین انسان ہندوستان کے غریب ترین انسان سے بہتر زندگی کا حامل ہوسکتا ہے اور افریقہ کا غریب ترین انسان ہندوستان کے غریب سے بھی پست زندگی گزار سکتا ہے۔ ہندوستان کے اگر کسی غریب کو کسی متمول گھرانے کے افراد کے مقابل لا کھڑا کریں تو اس سے پست معیار زندگی کا کوئی دوسرا تصور ذہن میں نہیں ابھرے گا۔ لیکن اگر اسی شخص کو کسی معمولی نوکری پیشہ شخص کے مقابل لا کھڑا کریں تو ذہن میں فوراً اس کا معیار تھوڑا بلند محسوس ہوگا۔ اس طرح غربت کا تصور اور اس کی سطح کا تعین مدمقابل شخص، جماعت یا ملک کے معیار زندگی سے طے ہوتا ہے۔

زندگی کو خوش حال ومطمئن بنانے والے وسائل پر قدرت رکھنے کا ایک اہم ذریعہ آمدنی ہے جو روزگار، تجارت، کاروبار اور خدمات سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ آمدنی زندگی کو آسودہ وخوش حال بنانے والے تمام ذرائع وخدمات پر خرچ کردی جاتی ہے۔ اس لیے آمدنی وخرچ (صرف) بالعموم مساوی ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی خرچ نہیں کرتا ہے بلکہ کچھ حصہ بچا لیتا ہے تو وہ اسی قدر زندگی کی آسودگیوں سے محروم رہتا ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ وہ اسی قدر حال میں غریب بنا رہتا ہے۔ چونکہ یہ بچت مستقبل کے لیے ہوتی ہے اس لیے مستقبل کے مقابلے میں اس کا حال غربت کے دائرے میں آجاتا ہے۔ یہ غربت کی وہ شکل ہے جو انسان خود اپنے منصوبوں سے اپنے لیے پیدا

کرتا ہے۔ اب جس قدر مستقبل کے لیے حال میں بچت کریں گے، اسی قدر گویا حال کو غریب بناتے رہیں گے۔

زر کی قوت خرید جو اشیا و خدمات کی اجرتوں سے ناپی جاتی ہے، انسان کو امیر و غریب بناتی رہتی ہے۔ قیمتوں کے مسلسل بڑھنے پر محدود آمدنی والے اشیا و خدمات کی وہ مقدار حاصل نہیں کرسکتے جو قیمتوں کے گرنے کی صورت میں حاصل کرسکتے ہیں۔ اس طرح افراط زر محدود آمدنی والے طبقے یا مقررہ آمدنی والوں کو غریب بناتا رہتا ہے۔ اب اگر یہ طبقہ اپنے معیار زندگی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے تو زیادہ محنت کرے گا، زیادہ صلاحیتوں کو بڑھائے گا، زیادہ وقت لگائے گا تاکہ گرتی ہوئی قوت خرید کو پورا کرنے کے لیے زیادہ کمائے۔ یہاں بھی نا آسودگی کے احساس میں اضافہ ہی ہوگا۔

غربت کو وسیع و عمیق بنانے میں آبادی کی رفتار بھی اہم رول ادا کرتی ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ زندگی کے بنیادی وسائل کو اس تیزی سے نہیں بڑھایا جاسکتا جس تیزی سے آبادی بڑھتی ہے۔ زمین، معدنیات، جنگل کی سطح تو مقرر ہیں۔ آبادی کے مسلسل بڑھتے رہنے پر زرعی پیداوار متاثر ہوگی۔ آبادیاں گھنی سے گھنی ہوتی جائیں گی اور پھر تازہ و صاف ہوا، اسپتال، تعلیم و تربیت کے ادارے، رسل و رسائل، رہائشی ضروریات سبھی مسئلہ بنتی جائیں گی۔ چونکہ شہروں میں روزگار کے مواقع زیادہ وسیع ہوتے ہیں اس لیے دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف ہجرت شہروں کے وسائل کو سلب کرتے رہتے ہیں اور وہاں کی مطمئن زندگی کے دائرے کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ شہروں میں گندی بستیوں کی بڑھتی آبادیاں، جھگی جھونپڑی کلچر آج بین الاقوامی سطح پر توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہاں غربت و افلاس پرورش پاتی ہے اور ایک وبائی مرض کی طرح پھیلتی رہتی ہے۔

اس طرح غور کیجیے تو آمدنی کی سطح، روپیہ کی قوت خرید یعنی قیمتوں کی سطح، پیداوار کی سطح اور اس کا نظام تقسیم، آبادی کی رفتار اور شہروں کی طرف بڑھتا انسانی سیلاب سب بالآخر غربت و افلاس کو پیدا کرنے، بڑھانے اور سنگین بننے میں معاون ہیں۔ ان سب کا مجموعی نتیجہ ایک ہی ہے کہ سماج کا ایک طبقہ زندگی کو خوش حال و آسودہ بنانے والے رسائل سے دن بہ دن محروم ہوتا جاتا ہے اور نتیجے میں عسرت و غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ غربت کی پیمائش ان ہی عوامل کو اپنے دائرے میں لیے ہوئے ہے اور مفکرین کے تمام مطالعے انھیں کے تجزیوں پر مرکوز ہیں۔

لیکن غربت اور محض اقتصادی دائروں تک محدود نہیں رہتی۔ وہ اپنے اثرات، ذہنی سوچ و فکر، رجحانات، ترجیحات پر مثبت کرتی ہے اور سماجی و معاشرتی قدروں، یہاں تک انسانیت کے اعلیٰ اقدار کو متاثر کرتے ہوئے انسانوں کو حیوانوں کی صف میں لاکھڑا کردیتی ہے۔ علامہ اقبال نے غربت کے انھیں دور رس نتائج کو اپنے دائرۂ فکر میں رکھا ہے۔

غربت کی ظاہری شناختوں کا پہچاننا ضروری ہے۔ لیکن ہماری تشریحات و تجزیہ صرف یہیں تک محدود نہیں ہونے چاہیے۔ ہم کو اس کے ذہنی، تہذیبی، معاشرتی

غربت کے سلسلے کے تمام مطالعے، تشریحات و تجزیہ اس کے محض منفی رُخ پر مرکوز نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے خوش حال و مطمئن زندگی کا ایک پیمانہ نگاہ رکھا ہے اور اسی کسوٹی پر معیارِ زندگی کو ناپتے اور پرکھتے ہیں۔ لیکن اپنے خود ساختہ پیمانوں سے ہٹ کر اگر غربا کی زندگی کا مشاہداتی تجزیہ کریں تو احساس ہوگا کہ غربت و افلاس میں گھری زندگی کی بھی ایک منفرد شخصیت ہوتی ہے۔ تمام تر محرومیوں کے باوجود ایک خاص اطمینان و سکون کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی دشواریوں تکلیفوں اور کم مائیگیوں کا رونا روتے نظر نہیں آتے۔ ہم ان کو مروجہ زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو امیر و آسودہ زندگیوں کے مقابلہ یہ 'بیچارے' نظر آتے ہیں۔

اثرات کو بھی اپنے حلقۂ فکر میں رکھنا چاہیے۔ اس کے لیے تخمینوں سے زیادہ مشاہداتی حسیت کی ضرورت ہے۔ جب کوئی انسان اقتصادی اعتبار سے مفلس ہوتا ہے تو وہ اپنی سوچ و فکر کے اعتبار سے بھی مفلس ہوتا جاتا ہے۔ اس کا دائرۂ فکر کوتاہ اور جدوجہد محدد ہوتی جاتی ہے۔ اس کا زاویۂ نگاہ حال پر ٹکا رہتا ہے۔ مستقبل اس کے لیے کچھ بھی نہیں رہتا۔ وہ اخلاقی، تہذیبی و معاشرتی اعتبار سے بھی پست ترین سطح کی طرف گرتا چلا جاتا ہے۔ یہ غربت کی وہ سنگین صورت حال ہے جو اقتصادی دائرے سے باہر ہے۔ ان پستیوں کی تشریح اعداد و شمار سے نہیں کی جاسکتی۔

غربت کے سلسلے کے تمام مطالعے، تشریحات و تجزیہ اس کے محض منفی رُخ پر مرکوز نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے خوش حال و مطمئن زندگی کا ایک پیمانہ نگاہ رکھا ہے اور اسی کسوٹی پر معیارِ زندگی کو ناپتے اور پرکھتے ہیں۔ لیکن اپنے خود ساختہ پیمانوں سے ہٹ کر اگر غربا کی زندگی کا مشاہداتی تجزیہ کریں تو احساس ہوگا کہ غربت و افلاس میں گھری زندگی کی بھی ایک منفرد شخصیت ہوتی ہے۔ تمام تر محرومیوں کے باوجود ایک خاص اطمینان و سکون کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی دشواریوں تکلیفوں اور کم مائیگیوں کا رونا روتے نظر نہیں آتے۔ ہم ان کو مروجہ زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو امیر و آسودہ زندگیوں کے مقابلہ یہ 'بیچارے' نظر آتے ہیں۔ لیکن آپ کو اس بیچارگی میں بھی بے چینی و اضطراب نہیں بلکہ سکون کا احساس ہوگا۔

مختصر یہ کہ غربت و افلاس کو محض اقتصادی دائرے میں محصور نہیں رکھنا چاہیے۔ یقیناً اس کا اقتصادی پہلو بنیادی نوعیت کا ہے۔ باقی تمام اخلاقی، معاشرتی، تہذیبی و سماجی پہلو ردعمل ہیں۔ لیکن ان دور رس اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری تمام تر توجہ اس کے طول عرض و گہرائی کو ناپنے پر مرکوز رہتی ہے۔ وہ ہماری زندگی کے کن کن شعبوں کو کن کن صلاحیتوں کو متاثر کررہی ہے، اس طرف اقتصادی مفکرین توجہ نہیں دیتے۔ یہ کام سوشلا جسٹ، سوشل ورکرس اور این جی او کا ہے۔ غربت و افلاس کو سمجھنے، اس کی تشریح کرنے اور تجزیے کرنے میں دونوں شعبوں، اقتصادیات اور سوشلاجی کی اہمیت ہے۔ دونوں کی مربوط کاوشوں سے مسئلے کو صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے اور کارآمد حل تلاش کیا جاسکتا ہے لیکن مطالعوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غریبی کا مسئلہ محض اقتصادی ہے اور مفکرین اقتصادیات نے اس کو اپنے دائرۂ فکر میں رکھ کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ غریبی اقتصادی عوامل میں سدھار لاکر ہی دور کی جاسکتی ہے۔ یہ فکر، یہ زاویۂ نگاہ ادھورا ہے۔ محض روزگار بڑھا کر، روزگار کے مواقع وسیع کرکے، مالی امداد پہنچا کر، آمدنی بڑھا کر، اشیا ضروری کو مفت یا انتہائی کم قیمت پر فراہم کرکے، تعلیم و تربیت کو اس کی اصل وقعت و قیمت سے بیگانہ ہوکر پھیلانے، صحت و ماحولیاتی سدھاروں کی چنندہ اسکیموں کے ذریعے پھیلتی اور پنپتی شہری و دیہی غربت دور نہیں ہوگی۔ اس کے لیے ایک Holistic کی ضرورت ہے جس میں تمام علوم کے ماہرین کو شامل ہونا چاہیے۔

■

S.A.R. Bilgrami, 101-S, Sector-8, Jasola Vihar, New Delhi - 110025
Mob.: 09891425691

دانہ پانی

پروفیسر جمال نصرت

روٹی، کپڑا، مکان اور کام، یہ چار وہ اہم چیزیں ہیں جو کسی کنبے کی ترقی کے لیے ضروری ہیں اور یہی چار چیزیں کسی ملک کے لیے بھی اہم ہیں۔ اگر یہ سب ہیں تو عوام خوش ہیں اور ملک ترقی کرے گا۔ دوسری چیزیں بھی اہم ہیں جیسے تعلیم، صحت، کاروبار، نقل وحمل، نشوونما، تفریح وتماشا وغیرہ مگر ان کا نمبر ان چار کے بعد ہے۔ اس کے علاوہ سماج اور دنیا میں ہمیشہ سے ہے: حسد و جلن، دوسرے کو نیچا دکھانا، دوسرے کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالنا، دوسرے کی ترقی کو کم کرنا جس سے ان کی اہمیت بڑھ جائے۔ پہلے راجا اور بادشاہ ہوا کرتے تھے اب مگر وہ تو نہیں ہیں بلکہ بڑے بڑے گھرانے ہوتے ہیں جو ان اصولوں پر چلتے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزیں جہاں کہیں بھی سستی ہوں اسے خرید لو اور جہاں کہیں بھی زیادہ دام پر فروخت ہو سکے ان کو بیچ لو۔ کھانے پینے کی اشیا سے سماج اور لوگ سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً دہرہ دونی چاول اور دارجلنگ کی چائے وہاں نہیں ملتی جہاں یہ پیدا ہوتی ہیں، مگر وہاں ملتی ہیں جہاں لوگ منہ مانگے دام دے سکتے ہیں۔ یہ لندن اور نیویارک میں بڑے آرام سے مل جائیں گی۔ روٹی، کپڑا، مکان اور کام میں بھی اہم ترین چیز روٹی ہے کیونکہ اس کے بنا تو زندگی کا تصور ہی نہیں ہے۔ روٹی دانے سے آتی ہے اور دانہ پانی سے ہی پھوٹتا ہے۔ ہاں دوسری چیز، مٹی اور سورج بھی ضروری ہیں۔ آج سائنس نے بہت ترقی کی ہے۔ سب کچھ بنا لیا، نوٹ بک، کیمرہ، البم، ٹیلی فون، روپیہ، پرس، وغیرہ وغیرہ یعنی موبائل، اسی طرح خون کے سب اجزا جان لیے مگر وہ خون نہیں بنا سکے جو بیمار آدمی کو چڑھایا جا سکے۔ اسی طرح ایسی کوئی چیز نہیں بنا پائے جو پانی کے بغیر بیج کو انکرت (Germinate) کرا سکے اور پودھا بنا سکے۔

زیادہ تر ملکوں میں غلے کی کمی ہے۔ وہ اسے خرید کر، دوسری چیزوں کے بدلے یا پھر مجبوری میں مہنگے داموں میں فراہم کراتے ہیں۔ اس کے علاوہ غریب ملکوں یا کسی آفت کے آنے پر امیر ملک مدد کے طور پر بھی دیتے ہیں۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں اناج کی کمی ہے اور فکر کی بات ہے کہ دنیا کے اناج کا ذخیرہ دھیرے دھیرے گھٹ رہا

ہے۔مثال کے طور پر جاپان ایک ایسا ملک ہے جو سب بنا لیتا ہے مگر اپنے لیے مناسب مقدار میں گیہوں اور آلو نہیں پیدا کر پاتا۔ وہ اس کو اپنی آبادی کے لیے اونچے داموں میں خرید لیتا ہے۔ مگر افریقہ کے غریب ملک اسے کم سے کم داموں میں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا اکثر اسے تحفہ یا مدد کے طور پر ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اناج کی کمی کے مسئلے کا حل اب اقوام متحدہ کے کاموں میں بہت اہم ہے۔

ہم لوگ بھی جب آزاد نہیں تھے تو صرف 50 ملین ٹن اناج ہی پیدا کر پاتے تھے لیکن پھر جب 1947 میں آزاد ہوئے تو اپنی پلاننگ، کسانوں کی محنت، انجینئروں کی کوششوں سے نہروں اور ٹیوب ویلوں کی مدد سے کھیت کھیت پانی پہنچا کر پیداوار بڑھائی گئی۔ اب یہ پیداوار 260 ملین ٹن تک پہنچانے میں کامیاب ہو چکے ہیں یعنی اس درمیان جہاں ہماری آبادی چار گنا سے کم بڑھی ہے وہاں پیداوار پانچ گنا سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہم اناج باہر بھی بھیجنے کے لائق ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ سلسلہ اس طرح چلنے والا نہیں ہے۔ آبادی بہت زیادہ بڑھتی جا رہی ہے، خالی زمینوں کا استعمال بڑی حد تک ہو چکا ہے۔ ندیوں میں جو پانی ہے اسے ہم زیادہ تر سینچائی اور دوسرے کاموں میں لا چکے ہیں۔ بہت زیادہ ٹیوب ویل بنا کر زیر زمین سطح کو خطرہ والی حد تک اکثر پہنچا چکے ہیں۔

کم غلہ اور اناج ہماری فکر ہے۔ یہی تمام عالم کی پریشانی کا باعث بھی ہے۔ روز ازل سے لے کر 1830 تک دنیا کی کل آبادی 100 کروڑ تھی جو بڑھ کر 1930 تک 200 کروڑ ہوگئی۔ لیکن یہی آبادی 2000 میں 600 کروڑ ہو چکی تھی۔ اب یہ 700 کروڑ سے زیادہ ہے اور 2050 تک یہ 10 ارب تک ہو سکتی ہے اور ہم لوگ دنیا کے شاید سب سے زیادہ آبادی والے ملک کے باشندے ہوں گے۔ یہ ایک مشکل وقت ہوگا۔ اس کے خاص اسباب یہ ہو سکتے ہیں:

1۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے اناج کی ضرورت بھی بڑھ رہی ہے۔

2۔ اناج کی پیداوار بھی بڑھ رہی ہے لیکن آبادی کی مناسبت سے نہیں بلکہ کم۔

3۔ کھیتی کا رقبہ گھٹ رہا ہے کیونکہ شہر بڑھ رہے ہیں اور بڑے بھی ہو رہے ہیں۔ وہاں کی زمین کو اسکول، اسپتال، سڑکوں، مکانوں وغیرہ کے لیے لیا جا رہا ہے۔

4۔ جو پانی پہلے صرف کھیتی کے لیے تھا اس کی حصے داری گھریلو کاموں، صنعت و حرفت، سینی ٹیشن، تعمیری کام، بجلی بنانے وغیرہ میں روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

5۔ کاشتکار بھی آمدنی والی فصلیں اُگانا چاہتا ہے نہ کہ وہ جن سے غلے کی مقدار بڑھے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ کاشتکاروں کی معلومات اور جانکاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔

6۔ اناج کو محفوظ رکھنا بھی ایک کٹھن کام ہے۔

7۔ کولڈ اسٹوریج بھی کم ہیں اور دوسرے اس کا خرچ زیادہ ہے تیسرے اس میں بجلی کا محتاج ہونا پڑتا ہے جو کہ مشکل کام ہے۔

8۔ ملک کے ساہوکار کم دام پر اناج خرید لیتے ہیں اور اس کو ملک سے باہر اور یہاں بھی اپنی مرضی سے فروخت کرتے ہیں۔ اس کی کالا بازاری بھی غلے کی کمی کا باعث ہے۔

9۔ کاشتکار بھی پانی کی موجودگی کے حساب سے فصل نہیں بوتے۔ جیسے کم پانی والی جگہوں پر ارہر اور زیادہ پانی والی جگہوں پر گنا بونا چاہیے۔

10۔ پانی کا بجٹ بھی نہیں بنایا جاتا۔ پانی جمع کرنے اور تالاب کو قائم رکھنے کے لیے مناسب اقدام کی کمی کا ہونا۔

11۔ مناسب وقت پر مناسب مقدار میں مناسب قیمت پر اور مناسب قسم کا پانی ملنا جس کی وجہ سے اکثر پانی کی بربادی ہوتی ہے۔

12۔ اکثر مقدمہ بازی کی وجہ سے کھیت خالی رہتے ہیں اور اکثر پانی کی پرچی موقعے پر کھیتی کرنے والے کے نام کی کٹتی ہے تو لوگ بھی دوسرے کو کاشت کے لیے کھیت دینے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کھیت ہی نہ چلا جائے۔

13۔ کم پانی کی کھپت والے طریقے مہنگے ہونے کی وجہ سے اکثر کاشتکار ان کا استعمال نہیں کر پاتے جیسے پائپ لائن (Pipe Line) یا ڈرپ (Drip) سینچائی۔

خوش قسمتی سے ہمارے پاس کافی پانی ہے اور دنیا میں سینچائی کرنے والے ملکوں میں ہمارا اونچا مقام ہے مگر بندو بست اور انتظام کو اور بھی درست کرنے کی ضرورت ہے جس سے ہم پانی کی موجودہ مقدار سے زیادہ دانہ حاصل کر سکیں۔ پانی بچانا، بارش کے پانی کو سنبھالنا، تالابوں کو قائم رکھنا اور ان کا بھرنا، پانی کی بربادی کو روکنا، پانی کی مقدار کے حساب سے ہی فصلوں کا انتخاب، کاشتکاروں کو تعلیم ہی نہیں ورک شاپ بھی کرانا۔ کھیتی کے مقدموں کا جلد فیصلہ، تالابوں میں بھی کھیت، مچھلی پالن کو فروغ، یہ سب کیا جائے تو حالات بہتر ہوں گے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ آبادی کو کنٹرول (Control) میں رکھا جائے۔

یوں تو دنیا کی کل زمین کا 2 فیصد حصہ ہمارے پاس ہے اور پانی کی مقدار 4 فیصد ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں بہت سی ندیاں ہیں اور تین طرف سے پانی ہی پانی ہے اور چوتھی طرف ہمالیہ ہے جو برف کو پگھلا پگھلا کر پورے سال پانی دیتا رہتا ہے۔ اس طرح پانی کی کمی نہیں ہونی چاہیے مگر ہماری آبادی ہر حساب کو غلط کر دیتی ہے۔

مناسب بندوبست اور درست انتظام ہی اس مشکل کا حل ہے۔

■

Professor Jamal Nusrat Roshni, 509/148 Old Hyderabad, Lucknow - 226007 (UP)

اکیاون ویں برسی پر خصوصی تحریر

ہندی سنیما کا ایک فطری اداکار، جو پہلا سپر اسٹار بنا

موتی لال

انیس امروہوی

آج ہم ہندوستانی سنیما کے پہلے سُپر اسٹار کے بطور اداکار راجیش کھنہ کا نام لیتے ہیں، اُس کے بعد سُپر اسٹار امیتابھ بچن کو جانتے ہیں۔ جبکہ سچائی یہ ہے کہ راجیش کھنہ ہندوستانی سنیما کے پہلے سُپر اسٹار نہیں تھے، بلکہ بلیک اینڈ وہائٹ کے زمانے میں موتی لال نام کے اداکار ہندوستانی سنیما کے پہلے سپر اسٹار تھے۔ موتی لال کا جلوہ ہی الگ قسم کا تھا، لوگوں کے پاس کاریں ہوا کرتی ہیں مگر اُس وقت موتی لال ہوائی جہاز اُڑایا کرتے تھے۔ 17 جون 2016 کو اُن کی 51ویں برسی پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اُن کے بارے میں تفصیل سے اس مضمون میں معلومات فراہم کی گئی ہے۔

جن لوگوں نے 1956 میں بنی راج کپور کی فلم 'جاگتے رہو' دیکھی ہے، وہ اس فلم کے ایک گانے پر لڑکھڑاتے ہوئے اداکار موتی لال کو کبھی نہیں بھول پاتے۔

موتی لال راج ونش 4 دسمبر 1910 میں شملہ کے ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد ایک جانے مانے ماہر تعلیم تھے۔ جب موتی لال صرف ایک برس کے ہی تھے، اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ موتی لال کی پرورش اُن کے چچا نے کی جو اُتر پردیش کے کسی شہر میں کافی مشہور سول سرجن تھے۔

موتی لال کو پہلے شملہ کے ہی ایک انگریزی میڈیم اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اس کے بعد اُتر پردیش میں اور پھر وہ دہلی میں منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے اسکول سے لے کر کالج تک کی تعلیم حاصل کی۔

موتی لال کافی عرصہ دہلی میں رہے اور بعد میں نیوی میں داخلے کے لیے ممبئی چلے گئے۔ جہاں اِن کی ملاقات ایک اسٹوڈیو میں ساگر فلم کمپنی کے ہدایت کار کے۔ پی۔ گھوش سے ہوئی۔ انھوں نے موتی لال کا اسکرین ٹیسٹ لینے کے فوراً بعد اُن کو فلم 'شہر کا جادو' کے لیے سائن کر لیا۔ یہ فلم 1934 میں ریلیز ہوئی۔

دہلی میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر موتی لال نیوی میں ملازمت کی غرض سے بمبئی آئے تھے، مگر یہاں آ کر وہ بیمار ہو گئے اور نیوی کے امتحان میں نہیں بیٹھ سکے۔ کیونکہ قدرت اُن سے کوئی اور ہی کام لینا چاہتی تھی۔

ایک دن وہ اپنے دوست اور دہلی سے ہی گئے ہوئے اداکار ہریش کے ساتھ ساگر اسٹوڈیو میں فلم کی شوٹنگ دیکھنے گئے۔ وہاں ہدایت کار کے۔ پی۔ گھوش نے شہری طرز کے اِس نوجوان کو دیکھا۔ انھوں نے چوبیس برس کے موتی لال کو فلم میں اداکاری کرنے اور ہیرو کا رول ادا کرنے کا موقع دیا۔ 1934 میں ریلیز اس فلم کا نام تھا 'شہر کا جادو' اور ہیروئن تھیں سیتا دیوی۔

فلم 'شہر کا جادو' کے ہٹ ہوتے ہی ساگر فلم کمپنی نے دوبارہ موتی لال اور سیتا دیوی کی اِس جوڑی کو سی ایم لوہار کی ہدایت میں بنی فلم 'سلور کنگ' میں دہرایا۔ اس فلم کے دیگر فنکاروں میں یعقوب، تارا بائی اور پانڈے تھے۔ ان دونوں فلموں میں موتی لال اور سیتا دیوی کی جوڑی کو اس قدر پسند کیا گیا کہ ساگر فلم کمپنی نے اپنی اگلی چار فلموں، 'ڈاکٹر مدھولیکا، جیون لتا، لگن بندھن' اور 'تھری ہنڈرڈ ڈیز اینڈ آفٹر' میں بھی ان ہی دونوں کو پیش کیا۔

اس کے بعد ساگر فلم کمپنی کی کئی فلموں میں انھوں نے اداکارہ سیتا دیوی کے ساتھ کام کیا۔ جیسے 1935 میں فلم 'مدھولیکا'، اور 1937 میں 'گل وَدھو' وغیرہ۔ اس کے بعد موتی لال رنجیت اسٹوڈیو چلے گئے۔ موتی لال نے ہدایت کار محبوب خان کے ساتھ بھی کئی فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ 1937 میں 'جاگیردار'، 1938 میں 'ہم، تم اور وہ'، 1943 میں 'تقدیر' اور 1942 میں کیدار شرما کی فلم 'ارمان'، 1944 میں فلم 'کلیان' میں کام کر کے موتی لال نے کافی شہرت حاصل کی۔

سیتا دیوی کے ساتھ کئی فلمیں لگاتار کامیاب ہونے کی وجہ سے موتی لال اور سیتا دیوی کے معاشقے کے چرچے عام ہونے لگے۔ تب موتی لال نے اِن افواہوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے دہلی کی ایک لیڈی ڈاکٹر سے شادی کر لی اور اس طرح سیتا دیوی کے ساتھ اُن کی کامیاب جوڑی ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔ موتی لال کے سُپر اسٹار ہونے میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ جب انھوں نے لیڈی ڈاکٹر سے شادی کی تو اُن کی شادی میں اُس زمانے کی کئی مقتدر ہستیوں نے شرکت کی تھی، جن میں سب سے نمایاں نام سروجنی نائیڈو کا لیا جا سکتا ہے۔

موتی لال ہندستانی سنیما کے پہلے ایسے فطری اداکار تھے جنھوں نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے کئی بہترین کرداروں کو زندگی بخشی۔ اُن کی چمکدار آنکھیں اور ہونٹوں پر ایک مخصوص قسم کی مسکراہٹ اُن کی پہچان بن گئی تھی۔ موتی لال کی ایک فلم 'مستانہ' تھی جس میں انھوں نے چارلی چیپلن کی 'دی کِڈ' والا کردار ادا کیا تھا۔ کئی ناقدینِ فلم کا خیال ہے کہ دُکھی دل کے ساتھ مسکرانا مشہور فلمساز و ہدایتکار اور اداکار راج کپور نے موتی لال سے ہی سیکھا تھا.....

موتی لال ہندوستانی سنیما کے پہلے سُپر اسٹار تھے۔ انھوں نے ایک شاہانہ زندگی گزاری اور اپنی مقبولیت کو برقرار رکھتے ہوئے فلمی دنیا میں اسٹارڈم قائم کیا۔ انھوں نے اسٹوڈیو کی ملازمت والی روایت کی زنجیروں کو توڑ کر نہ صرف بہت سے فلمی کرداروں کو آزاد کرایا بلکہ ایک اداکار کو اس کی حیثیت سے آزادانہ زندگی گزارنے کا حق بھی دلوایا۔

موتی لال کا فیلٹ ہیٹ پہننا اُس زمانے میں اُن کی پہچان بن گیا تھا اور وہ کیمرے کے پیچھے نجی زندگی میں بھی فیلٹ ہیٹ پہن کر گھوما کرتے تھے۔ فلم 'دیوداس، اناڑی، لیڈر اور 'مسٹر سمپت' میں اُن کا فیلٹ ہیٹ پہننے کا انداز اتنا پسند کیا گیا کہ فلم 'دو دیوانے' میں اُن کے ساتھ

ہیروئن کا کردار ادا کرنے والی شوبھنا سمرتھ اُن پر ایسی فدا ہوئیں کہ زندگی بھر کی دوست بن گئیں۔

1965 میں پیش کی گئی بمل رائے کی فلم 'دیوداس' کے اُس شرابی کردار چُنّی لال کو کون بھول سکتا ہے؟ حالانکہ اس فلم کے مرکزی کردار میں دلیپ کمار موجود تھے، مگر موتی لال نے اپنے مکالموں کی ادائیگی اور اپنی فطری اداکاری سے اپنے لیے اس فلم میں وہی مقام بنالیا جو ہیرو کے طور پر دلیپ کمار نے حاصل کیا تھا۔

اس فلم کی کامیابی میں جہاں ساحر لدھیانوی کے نغموں، بمل رائے کی ہدایت کاری، ایس ڈی برمن کی موسیقی، شرت چندر کی کہانی اور دلیپ کمار کی بے مثال اداکاری کا دخل تھا، وہیں موتی لال کی موجودگی بھی فلم کی شہرت میں اضافے کا سبب بنی تھی۔ 'دیوداس' میں معاون اداکار کے طور پر موتی لال کو اس برس کا فلم فیئر ایوارڈ دیا گیا۔

1961 میں موتی لال کو فلم 'پرکھ' میں بہترین معاون اداکار کے لیے دوسری بار فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

موتی لال نے اپنے زمانے کی تقریباً سبھی بڑی، مشہور اور مقبول اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا۔ سیتا دیوی، گوہر بائی، مایا بنرجی، روزی، مادھوری، خورشید، وینا، منور سلطانہ، شمیم، وَن مالا، نرگس، نسیم بانو، ثریا، انجلی، نور جہاں، گیتا نظامی، ممتاز شانتی، سنہہ پربھا پردھان، مینا کماری، مدھوبالا، اور مینا شوری وغیرہ نے موتی لال کے ساتھ ہیروئن کے کردار ادا کیے تھے۔

1943 میں بمبئی ٹاکیز کی فلم 'تقدیر' میں موتی لال ہیرو تھے اور ہیروئن تھیں نرگس۔ اس فلم کی ہدایت نجم نقوی امروہوی نے کی تھی، نغمہ نگار مہر انصاری کے گیت کی دُھن موسیقار رفیق غزنوی نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کا یہ گانا ''ظالم جوانی، کافر ادائیں.....'' خود موتی لال کی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا۔

موتی لال نے 1949 میں مینا شوری کے ساتھ فلم 'ایک تھی لڑکی' میں ایک کامیڈی کردار بھی ادا کیا تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار مینا شوری کے شوہر روپ کے۔ شوری تھے۔ وِنود ای آر کی موسیقی میں نغمہ نگار عزیز کشمیری نے فلم کے گیت لکھے تھے۔ اس فلم کا یہ نغمہ..... ''لارا لپا لارا لپا لائی رکھدا.....'' بے حد مقبول ہوا تھا اور اسی فلم کے بعد مینا شوری کو ''لارا لپا گرل'' کا ٹائٹل ملا تھا.....

اداکارہ شوبھنا سمرتھ نے جب 1950 میں اپنی بیٹی نوتن کے لیے ایک فلم 'ہماری بیٹی' بنائی تو موتی لال نے اس فلم میں نوتن کے باپ کا کردار ادا کیا۔ موتی لال نے 1959 میں فلم 'اناڑی' میں بھی نوتن کے گارجین کا کردار ادا کیا تھا، مگر وہ نگیٹیو رول تھا، جس کو موتی لال نے بڑی خوبی اور چابکدستی سے ادا کیا تھا۔

موتی لال نے 1952 میں ایس ایس واسن کی فلم 'مسٹر سمپت' میں ایک یادگار کردار ادا کیا۔ آر۔ کے۔ لکشمن کے ناول پر مبنی اس فلم میں موتی لال نے ایک سنجیدہ مگر مزاحیہ کردار میں نئی طرز کی اداکاری سے شائقینِ فلم کی توجہ کھینچی۔

1959 میں جیمنی اسٹوڈیو کے مشہور ہدایت کار ایس ایس واسن کی فلم 'پیغام' میں موتی لال نے ایک سرمایہ دار بزنس مین کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔ اس فلم میں ہیرو دلیپ کمار کے ساتھ وجینتی مالا ہیروئن تھیں۔ جہاں یہ فلم دلیپ کمار وجینتی مالا کی ہٹ جوڑی کی وجہ سے یاد کی جاتی ہے، وہیں موتی لال کی بہترین اداکاری کے لیے بھی پہچانی جاتی ہے۔

1964 میں دلیپ کمار وجنتی مالا کی فلم 'لیڈر' میں موتی لال نے ایک ولن کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا ہے..... حالانکہ یہ نگیٹیو کردار ہے مگر موتی لال نے اپنی فطری اداکاری سے اس میں بھی الگ ہی پہچان بنائی۔

1965 میں یش چوپڑہ کی ہدایت میں بنی ملٹی اسٹارز فلم 'وقت' میں موتی لال نے سنیل دت کے مقابل ایک وکیل کا کردار کیا ہے، مگر چھوٹے سے اس کردار میں بھی انھوں نے بہترین اداکاری کرتے ہوئے اپنی شناخت قائم رکھی ہے۔

1965 میں موتی لال نے اپنی ہدایت میں ایک فلم 'چھوٹی چھوٹی باتیں' بنائی مگر اُسی برس اس فلم کی ریلیز سے قبل ہی موتی لال اِس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

موتی لال تقریباً دو دہائیوں تک ہندوستانی سنیما کے سنہرے پردے پر بڑے گلیمرس انداز میں چھائے رہے۔ جہاں بلراج ساہنی دیہاتی کرداروں میں جان ڈال دیتے تھے، وہیں موتی لال شہر کے بانکے اور باسلیقہ نوجوان کے کردار بخوبی نبھاتے تھے۔

موتی لال اکیلے ایسے اداکار تھے جن کے پاس اپنا ذاتی ہوائی جہاز تھا۔ وہ اپنا جہاز اکثر شوبھنا سمرتھ کے گھر کے اوپر اُڑایا کرتے تھے۔ حالانکہ موتی لال شادی شدہ تھے اور اُن کی بیوی دہلی میں ڈاکٹر تھیں، لیکن دونوں میں تعلقات زیادہ بہتر نہیں رہتے تھے۔ اُن کی آخری فلم 'چھوٹی چھوٹی باتیں' کو جب نیشنل ایوارڈ ملا تو خود موتی لال یہ ایوارڈ لینے کے لیے زندہ نہیں تھے۔ لہٰذا اُن کے لیے یہ ایوارڈ اُن کی ڈاکٹر بیوی نے ہی حاصل کیا تھا۔

اس کے علاوہ نئی نئی گاڑیاں رکھنے کا بھی موتی لال کو بہت شوق تھا۔ ایک زمانے میں اُن کے پاس اکٹھی چار گاڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ وہ اکثر دوستوں سے کہتے تھے کہ میرا بس چلے تو میں باتھ روم میں بھی کار سے ہی جاؤں۔ موتی لال کو تیراکی کا بھی بے حد شوق تھا۔

انھیں سفید کپڑے پہننے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ شاید اسی لیے اُن کے دل میں نیوی میں جانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، کیونکہ نیوی کی ڈریس سفید ہی ہوتی ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ سفید ڈریس والے نیوی کے نوجوانوں پر لڑکیاں زیادہ فدا ہوتی ہیں۔

نوتن اور تنوجہ کی ماں اور اداکارہ کاجول کی نانی شوبھنا سمرتھ نے اُن کے بُرے دنوں میں کافی مدد کی۔ 1950 کے زمانے میں ان دونوں کے معاشقے کو لے کر بڑے چرچے ہوتے تھے، اور اِن چرچوں کی وجہ سے ہی شوبھنا سمرتھ کو طلاق ہو گئی تھی۔ تب موتی لال نے ہی اُن کے بچوں کی پرورش کی ذمے داری نبھائی تھی۔

موتی لال نے اپنے ہم عصر اداکاروں، سہراب مودی اور پرتھوی راج کپور کے تھیٹر کے انداز کی اداکاری سے الگ ہٹ کر فطری اداکاری کے بہترین نمونے پیش کیے، جس کے لیے دلیپ کمار بھی پہچانے جاتے تھے۔

ہندی سنیما کے مقبول اداکار نصیر الدین شاہ نے ایک جگہ ہندوستانی سنیما کے تین بہترین اداکاروں کا ذکر کیا ہے، جن میں بلراج ساہنی اور یعقوب کے علاوہ تیسرا نام موتی لال کا ہی لیا ہے۔

موتی لال نے اپنے اداکارانہ فن کے اظہار کے لیے چہرے کے تاثرات کو بے حد اہمیت دی ہے۔ موتی لال کی تقدیر نے اُن کو ایک ہی دن میں سُپر اسٹار نہیں بنایا بلکہ 24 سال کی انتھک محنت، لگن اور جہد مسلسل سے وہ اس مقام کو حاصل کر سکے تھے۔

موتی لال کو گھوڑوں کی ریس کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ ریس میں ضائع کر دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے رئیسانہ ٹھاٹ باٹ اور طرزِ زندگی سے انھوں نے جو کمائی لٹائی، اس کی وجہ سے اُن کو اپنے آخری دنوں میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اور قلاشی کے دَور سے نکلنے کے لیے کریکٹر ایکٹر کے طور پر کئی فلموں میں کام کرنا پڑا۔

آخر کار خراب معاشی حالات اور لمبی بیماری کی وجہ سے 17 جون 1965 کو وہ دن آ گیا جب ممبئی میں ہندوستانی سنیما کے پہلے سپر اسٹار موتی لال کا انتقال ہو گیا۔

■

Anees Amrohvi
F - 5, First Floor, Jawahar Park (W),
Laxmi Nagar, Delhi-110092
Ph.:011-22442572, 9811612373
E-mail: qissey@rediffmail.com

ادبی کوئز

غلام نبی کمار

(1) 'تنقیدی حاشیے' کس ادیب کی تصنیف ہے؟
(الف) آل احمد سرور (ب) احتشام حسین
(ج) مجنوں گورکھپوری (د) رشید احمد صدیقی

(2) مکاتیب شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی کی کتنی جلدیں ہیں؟
(الف) ایک جلد (ب) دو جلدیں
(ج) تین جلدیں (د) چار جلدیں

(3) 'مضامین رشید' کا سنہ اشاعت کیا ہے؟
(الف) 1940 (ب) 1941
(ج) 1942 (د) 1943

(4) جوش ملیح آبادی نے کس مشہور رسالے کی ادارت سنبھالی تھی؟
(الف) ماہنامہ 'اردو دنیا' (ب) ماہنامہ 'برہان'
(ج) 'ماہنامہ آجکل' (د) 'ماہنامہ ایوان اردو'

(5) خاکوں کے مجموعہ کی نشاندہی کیجیے؟
(الف) خنداں (ب) نقش ہائے رنگ رنگ
(ج) فروزاں (د) آب گم

(6) عبدالحلیم شرر کی وفات کب ہوئی؟
(الف) 1924 (ب) 1925
(ج) 1926 (د) 1927

(7) 'حسین اور زمرد' کس ناول کے کردار ہیں؟
(الف) منصور موہنا (ب) فلورا فلورنڈا
(ج) فتح اندلس (د) فردوسِ بریں

(8) 'سی پارہ دل' کتنی منزلوں پر مشتمل ہیں؟
(الف) پانچ (ب) چھ
(ج) سات (د) آٹھ

(9) مومن کو 'شاعرِ مکر' کس نے کہا؟
(الف) نیاز فتح پوری (ب) ضیا احمد بدایونی
(ج) ڈاکٹر عبادت بریلوی (د) کلب علی خاں فائق

(10) طنزیہ و مزاحیہ مضمون 'موذی' مشتاق احمد یوسفی کے کس مجموعے میں شامل ہے؟
(الف) زرگذشت (ب) چراغ تلے
(ج) آب گم (د) خاکم بدہن

(11) 'دکنی ادب کی تاریخ' کس مصنف کی کتاب ہے؟
(الف) عبدالقادر سروری (ب) محی الدین قادری زور
(ج) شوکت سبزواری (د) حافظ محمود خاں شیرانی

(12) کس شاعر نے 'وحشت' تخلص بھی اختیار کیا تھا؟
(الف) میر سوز (ب) معین احسن جذبی
(ج) میراجی (د) سرور جہان آبادی

(13) ''اگر ضمیر نہ ہوتے تو دبیر کا وجود ہوتا نہ انیس کا'' یہ کس کا قول ہے؟
(الف) الطاف حسین حالی (ب) محمد حسین آزاد
(ج) مسعود حسن رضوی ادیب (د) مولوی چراغ علی

(14) کن دو شعرا کے درمیان ادبی معرکے نہیں ہوئے ہیں؟
(الف) مصحفی اور انشا (ب) غالب اور ذوق
(ج) وجہی اور غواصی (د) سودا اور ذوق

(15) 'حسن شوقی' کا تعلق کس دور سے تھا؟
(الف) بہمنی دور (ب) عادل شاہی دور
(ج) قطب شاہی دور (د) مغلیہ دور

(16) 'سحر البیان' میں بے نظیر پر کتنے برس بعد کی عمر میں مصیبت پڑتی ہے؟
(الف) بارہ (ب) تیرہ
(ج) چودہ (د) پندرہ

(17) ابراہیم قلی قطب شاہ کے دورِ اقتدار کی صحیح تاریخ کیا ہے؟
(الف) 1543-1550 (ب) 1550-1580
(ج) 1580-1611 (د) 1611-1625

(18) کلیاتِ سراج اورنگ آبادی کو کس ادیب نے مرتب کیا ہے؟
(الف) محمد حسن (ب) نورالحسن ہاشمی
(ج) عبدالقادر سروری (د) وہاب اشرفی

(19) شبلی نعمانی کو برٹش گورنمنٹ نے 'شمس العلما' کے خطاب سے کب سرفراز کیا؟
(الف) 1891 (ب) 1892
(ب) 1893 (د) 1894

(20) ''فراق اردو ادب کے جانسن تھے'' کس کا کہنا ہے؟
(الف) محمد حسن (ب) مجنوں گورکھپوری
(ج) یگانہ چنگیزی (د) ظ انصاری

(21) 'فسانہ عجائب' کتنے قصوں پر مشتمل ہے؟
(الف) چودہ (ب) پندرہ
(ج) سولہ (د) سترہ

(22) نصرتی نے کتنے عادل شاہی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا؟
(الف) ایک (ب) دو
(ج) تین (د) چار

(23) رسالہ 'شب خون' کہاں سے شائع ہوتا تھا؟
(الف) دہلی (ب) حیدرآباد
(ج) الٰہ آباد (د) بنگلور

(24) کون سی نظم قلی قطب شاہ کی نہیں ہے؟
(الف) جنت محل (ب) چندن محل
(ج) خداداد محل (د) سجن محل

(25) قرۃ العین حیدر کا ناول 'سفینۂ غم دل' کب شائع ہوا؟
(الف) 1950 (ب) 1951
(ج) 1952 (د) 1953

(26) نذیر، بیگو اور رانجھا منٹو کے کس افسانہ کے کردار ہیں؟
(الف) کالی شلوار (ب) کھول دو
(ج) ممی (د) مصری کی ڈلی

(27) آل احمد سرور کو کس کتاب پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا؟
(الف) نظر اور نظریے (ب) خواب باقی ہے
(ج) تنقید کیا ہے (د) تنقیدی اشارے

(28) ''دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک'' اس شعر کا مصرع اولیٰ تلاش کیجیے؟
(الف) عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
(ب) دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
(ج) پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
(د) یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل

(29) 'توارد' کے لغوی معنی کیا ہے؟
(الف) دو شخصیتوں کو ایک ہی مضمون میں سوجھنا
(ب) مرکب کے کسی جز کو الگ کرنا
(ج) کسی قلمی یا مطبوعہ کتاب کی ایک جلد
(د) ہاتھ سے لکھا ہوا نسخہ

(30) گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
مندرجہ بالا شعر میں کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے؟
(الف) صنعتِ تجنیس تام (ب) صنعتِ ایہام
(ج) صنعتِ اشفاق (د) صنعتِ حسنِ تعلیل

(31) 'ضحاک' میں کتنے مناظر ہے ہیں؟
(الف) چار (ب) پانچ
(ج) چھ (د) سات

(32) ''اگر عصمت آدمی ہوتی تو میرے جیسی ہوتی اور اگر میں عورت ہوتا تو عصمت جیسا ہوتا'' کس کے الفاظ ہیں؟
(الف) کرشن چندر (ب) قرۃ العین حیدر
(ج) راجندر سنگھ بیدی (د) سعادت حسن منٹو

(33) میر نے 'نکات الشعرا' میں کس شاعر کو 'مطلق جاہل' قرار دیا ہے؟
(الف) حاتم (ب) مضمون
(ج) یقین (د) آبرو

(34) لفظ 'نیلام' کس زبان سے ماخوذ ہے؟
(الف) عربی (ب) فارسی
(ج) ترکی (د) پرتگالی

(35) 'آبِ حیات' میں کتنے شاعروں کی تاریخ رقم کی گئی ہے؟
(الف) پچیس (ب) چھبیس
(ج) ستائیس (د) اٹھائیس

(36) 'بے غرض محسن' کس افسانہ نگار کا افسانہ ہے؟
(الف) کرشن چندر (ب) عصمت چغتائی
(ج) پریم چند (د) سعادت حسن منٹو

(37) اختر شیرانی کا سالِ وفات کیا ہے؟
(الف) 9 ستمبر 1948 (ب) 9 ستمبر 1949
(ج) 9 ستمبر 1950 (د) 9 ستمبر 1951

(38) 'دریچے کے قریب' کس شاعر کی نظم ہے؟
(الف) اختر الایمان (ب) ن م راشد
(ج) اختر شیرانی (د) جاں نثار اختر

(39) 'سکوتِ شب' کس صنف کا مجموعہ ہے؟
(الف) نظموں کا مجموعہ (ب) غزلوں کا مجموعہ
(ج) خاکوں کا مجموعہ (د) افسانوی مجموعہ

(40) ''جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے'' کس کا انشائیہ ہے؟
(الف) مجتبیٰ حسین (ب) محمد حسین آزاد
(ج) خواجہ حسن نظامی (د) کنہیا لال کپور

(41) درج ذیل میں کون سا ڈراما طالب بنارسی کا ہے؟
(الف) ہریش چند (ب) عصمت
(ج) عاشق کا خون (د) آتشی طوفان

(42) 'شہیدِ جنس' کا لقب کس سے منسوب ہے؟
(الف) عصمت (ب) منٹو
(ج) بیدی (د) کرشن چندر

(43) ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کہاں سے شائع ہوتا ہے؟
(الف) حیدرآباد (ب) نئی دہلی
(ج) لکھنؤ (د) کانپور

(44) کس شاعر کے کلام کی سب سے زیادہ شرحیں لکھی گئی ہیں؟
(الف) اقبال (ب) ولی
(ج) فانی (د) غالب

(45) 'یادوں کی دنیا' کس ادیب کی خودنوشت ہے؟
(الف) جوش ملیح آبادی (ب) عبدالماجد دریابادی
(ج) یوسف حسین خاں (د) اختر حسین رائے پوری

(46) مقالاتِ شبلی کی کتنی جلدیں ہیں؟
(الف) پانچ (ب) چھ
(ج) سات (د) آٹھ

(47) سید انشاء اللہ خان انشاء کی پیدائش کہاں ہوئی؟
(الف) لکھنؤ (ب) دہلی
(ج) حیدرآباد (د) آگرہ

(48) 'تذکرۂ مجموعہ نغز' کو کس نے مرتب کیا؟
(الف) حبیب الرحمٰن خاں شیروانی
(ب) حافظ محمود خاں شیرانی
(ج) عبدالستار دلوی (د) نصیر الدین ہاشمی

(49) 'سپنوں کا قیدی' کس افسانہ نگار کا افسانوی مجموعہ ہے؟
(الف) عزیز احمد (ب) احمد ندیم قاسمی
(ج) کرشن چندر (د) سعادت حسن منٹو

صحیح جوابات

1. ج	2. ب	3. ب	4. ج	5. الف
6. ج	7. د	8. الف	9. ب	10. ب
11. ب	12. د	13. ج	14. د	15. ب
16. الف	17. ب	18. ج	19. ب	20. الف
21. د	22. ج	23. ج	24. الف	25. ج
26. د	27. الف	28. ب	29. الف	30. ب
31. ج	32. د	33. ج	34. د	35. ج
36. ج	37. الف	38. ب	39. ب	40. ج
41. الف	42. ب	43. ب	44. د	45. ج
46. د	47. ب	48. ب	49. ج	

Ghulam Nabi kumar House No B 20, 3rd Floor, Gafoor Nagar, Jamia Nagar, New Delhi - 110025, Mob.: 7053562468

سراج اورنگ آبادی (مونوگراف)

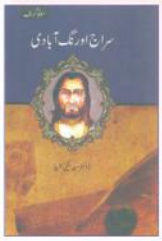

مصنف: ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
صفحات: 129، قیمت: 78 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی
مبصر: شاہ عمران حسن، معرفت رہبر بک سروس
پوسٹ باکس نمبر: 9736، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

سراج اورنگ آبادی اردو کے بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ان کی پیدائش 1715 میں ہوئی اور ان کا انتقال 1763 میں ہوا۔ انھوں نے چند سالوں تک شاعری کی اس کے بعد شاعری ترک کر کے درویشانہ زندگی اختیار کر لی۔ یوں تو انھوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ اور رباعی وغیرہ میں طبع آزمائی۔ مگر انھیں غزل اور مثنوی کی وجہ سے شہرت ملی۔

زیر نظر مونوگراف 'سراج اورنگ آبادی' اردو ادب کے ایک اہم ناقد ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے مرتب کیا ہے۔ یہ مختصر سی کتاب سراج اورنگ آبادی کی شخصیت اور شاعری پر سیر حاصل گفتگو کرتی ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں مصنف نے سراج کی سوانح حیات پر اطمینان بخش گفتگو کی ہے۔ اس میں نہ صرف اس دور کا سماجی و سیاسی پس منظر بیان کیا ہے بلکہ سراج کی پیدائش سے وفات تک کا تذکرہ ملتا ہے۔ جہاں سراج کے مریدوں و شاگردوں کا ذکر کیا ہے وہیں انھوں نے ان کے معاصرین کا تذکرہ بھی عمدگی کے ساتھ کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا مضمون سراج کے فن کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں مصنف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ سراج نے اپنا ادبی سفر کس طرح طے کیا۔ یہاں سراج کے مکتوبات، مثنویات اور قصیدہ، حمد و نعت وغیرہ کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی مشہور مثنوی 'بوستانِ خیال' کا تذکرہ چار صفحات میں کیا گیا ہے۔ 1160 اشعار پر مشتمل اس مثنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط لکھتے ہیں: ''یہ مثنوی اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے دکنی مثنویوں میں منفرد ہے اور شمال میں اس ڈھنگ اور انداز کی کوئی دوسری مثنوی نہیں۔ (صفحہ: 35)''

کتاب کا تیسرا مضمون نہ صرف تنقیدی ہے بلکہ تجزیاتی بھی ہے اس ضمن میں ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط لکھتے ہیں: ''میں نے اپنے ذوقِ سلیم سے سراج کے تمام کلام کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جس کا تنقیدی محاکمہ اس باب میں ہو چکا ہے۔ اس طرح یہ انتخاب گویا سراج کی شاعری کی تمام اوصاف کا نمائندہ بھی ہے اور میری شعری دلچسپیوں نیز میرے شعری تنقیدی رجحان کا عکاس بھی ہے۔ اس انتخاب میں کلیات کی تمام ردیفوں کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر ردیف کی کم از کم دو غزلوں کے منتخبہ اشعار شامل کیے گئے ہیں۔ (صفحہ: 91)''

کتاب کا آخری حصہ سراج کے منتخب کلام کے لیے مختص ہے جس کے اندر ہمیں عشق مجازی کے ساتھ عشق حقیقی کی جھلک بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ غزلوں کے علاوہ یہاں حمد و مناجات اور مثنوی بوستانِ خیال کا ایک مختصر سا حصہ بھی اس انتخاب میں رکھا گیا ہے۔

سراج اورنگ آبادی نہ صرف دکنی ادب بلکہ اردو ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ سراج کو ولی دکنی کا جانشین کہا جاتا ہے کیوں کہ اُنھوں نے ولی دکنی کی روایات کو آگے بڑھایا جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ چند سالوں پر محیط ان کی شاعری اُردو ادب کا اہم سرمایہ ثابت ہوئی ہے، جس سے اُردو ادب کا طالب صرف نظر نہیں کر سکتا۔ شاید یہی سبب ہے کہ معروف ادیب ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں: ''پوری اُردو شاعری کے پس منظر میں سراج کی شاعری کو رکھ کر دیکھا جائے تو وہ اُردو شاعری کے راستے پر ایک ایسی مرکزی جگہ کھڑے ہیں، جہاں میر، سودا، مصحفی، آتش، مومن، غالب اور اقبال کی روایت کے راستے صاف نظر آ رہے ہیں۔ سراج نے اُردو شاعری کے بنیادی راگ کو جگایا ہے۔ اس لیے ان کی آواز سارے بڑے شاعروں کی آواز، لے اور لہجے میں موجود ہے۔''

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اس کتاب کے ذریعے سراج اورنگ آبادی کی شاعری اور شخصیت کو خوبصورت پیرائے میں نئی نسل کے سامنے پیش کیا ہے۔ کتاب کی زبان عمدہ ہے، یہ اس کتاب کی خاص بات ہے۔ اردو زبان و ادب کے طلبہ کے لیے یہ ایک اہم کتاب ہے۔

میر غلام حسن دھلوی (مونوگراف)

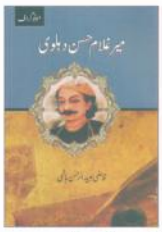

مصنف: قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی
صفحات: 128، قیمت: 77 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی
مبصر: فردوس بانو، A-187/3، دوسری منزل، شاہین باغ، نئی دہلی

قاضی صاحب نے 128 صفحات پر مشتمل میر حسن پر مونوگراف بڑی وضاحت سے تحریر کیا ہے اور میر حسن کے عہد و پیدائش کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ خوبی کو بیان کیا ہے۔ فہرست سے قبل ایک صفحے پر مشتمل ڈائرکٹر قومی اردو کونسل پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کا پیش لفظ ہے۔ بعد ازاں فہرست عناوین ایک صفحے میں درج ہے۔ پہلا عنوان 'شخصی و سوانحی پس منظر' شروع ہوتا ہے۔ اس عنوان کے تحت قاضی صاحب نے بارہ صفحات رقم کیے ہیں۔ مذکورہ بارہ صفحات چار ضمنی عنوانات پر مشتمل ہیں۔ نمبر ایک: ولادت، رحلت، سکونت، حسب نسب، تعلیم و تربیت، شخصیت مشاغل، نمبر دو: دہلی سے ہجرت، نمبر تین: میر حسن کے معاشقے، نمبر چار: عہد- سیاسی، سماجی و تہذیبی ماحول۔

قاضی صاحب نے ہر عنوان کے تحت تحقیق شدہ تحریر رقم کی ہے نیز میر حسن کا کلام بھی درج کیا ہے۔ دوسرا عنوان 'ادبی و تخلیقی سفر' ہے۔ یہ عنوان چودہ صفحات پر مشتمل ہے جس کے آٹھ ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ نمبر ایک: ادبی منظر نامہ، نمبر دو: ہمعصر

شعرا، نمبر تین: شاعری کا آغاز، نمبر چار: دلچسپی کی شعری اصناف، نمبر پانچ: غزلیں، نمبر چھ: قصائد، نمبر سات: مراثی، نمبر آٹھ: رباعی۔ درج بالا ذیلی عنوانات پر مختصر تحریر کے ساتھ میر حسن کا کلام بطور نمونہ نقل ہے۔

تیسرا عنوان، تنقیدی محاکمہ ہے۔ یہ بحث 64 صفحات میں مکمل ہوئی ہے۔ جو پورے مونوگراف کا ماحصل ہے۔ 'تنقیدی محاکمہ' کے ضمن میں قاضی صاحب نے میر حسن کی مثنویوں، غزلوں اور ان کی تصنیف 'تذکرہ شعرائے اردو' کا تجزیہ کیا ہے۔ مثنویوں پر 23 صفحات رقم کیے گئے ہیں۔ حسب ضرورت نمونہ کلام درج ہے۔ تین ذیلی عنوانات: کردار نگاری، جذبات نگاری اور منظر نگاری پر بحث کی تکمیل ہوئی ہے۔ ضمناً نمونہ کلام بھی نقل کیا گیا ہے۔

مثنوی کے بعد 22 صفحات پر مشتمل 'منتخب غزلوں کا تنقیدی و تجزیاتی محاکمہ' پیش کیا گیا ہے۔ قاضی صاحب نے اس عنوان کے تحت منتخب کلام میر حسن کا فنی تجزیہ اور ان کی غزلوں کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی ہے نیز پسندیدہ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ اس عنوان کی تکمیل کے بعد میر حسن کی تصنیف 'تذکرہ شعرائے اردو' کا مختصر مگر جامع تعارف دو صفحات میں پیش کیا گیا ہے جس میں میر حسن نے 304 شعرا کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔

مونوگراف کی فہرست کا آخری عنوان 'انتخاب کلام' ہے جس کے تحت قاضی صاحب نے چودہ پسندیدہ غزلیں میر حسن کے کلام سے منتخب کی ہیں۔ بعد ازاں مثنویات سے تین مثنویوں سے انتخاب نقل کیا گیا ہے۔ غزلوں کے انتخاب کی تکمیل دس صفحات میں ہوتی ہے جبکہ مثنویوں کا انتخاب 25 صفحات میں مکمل ہوتا ہے۔ 128 صفحات پر مشتمل ہمارے قدیم شاعر میر حسن دہلوی پر مونوگراف میر حسن کی ذات و صفات کا ایسا مرقع ہے جو کم وقت میں ڈھیر ساری واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ یہ قومی اردو کونسل دہلی کا کارنامہ ہے جس سے آنے والی نسلیں فیضیاب ہوں گی۔

راجندر منچندا بانی (مونوگراف)

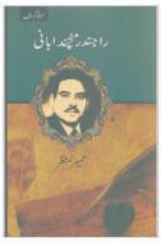

مصنف: عمیر منظر

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

صفحات: 122، قیمت: 76 روپے

مبصر: ڈاکٹر مظہر احمد، 3358 کوچہ جلال بخاری

بازار دلی گیٹ، نئی دہلی 2

جدید غزل کی روایت کا ایک نہایت مستحکم و مستند حوالہ راجندر منچندا بانی ہے۔ اِدھر کچھ عرصے سے ان کا کلام کمیاب ہی نہیں نایاب بھی ہو گیا تھا اور ہمارے اذہان و زبان سے یہ نام محو ہونے لگا تھا کہ بانی کے تین مجموعے (حالانکہ تیسرے مجموعے کا بڑا حصہ پہلے دونوں مجموعوں کے انتخاب پر ہی مشتمل تھا) عام قاری کی دسترس سے باہر ہو گئے تھے۔ شکر ہے کہ اِن دنوں بانی کی کلیات کے ساتھ ساتھ عمیر منظر کا گراں قدر مونوگراف بعنوان 'راجندر منچندا بانی' زیورِ طبع سے آراستہ ہو گیا ہے، جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں منصف نے بانی کی قدر و قیمت کا احساس ان الفاظ میں کرایا ہے کہ ''بحیثیت جدید غزل گو بانی کا جو مقام و مرتبہ ہے اس کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے لیکن بانی کی شاعری کے بارے میں ابھی تک کوئی ایسا تفصیلی مطالعہ ہمارے سامنے نہیں آیا جس سے ان کی قدر و قیمت اور مرتبے کا معروضی انداز میں تعین کیا جا سکے۔'' یہ حقیقت ہے کہ بانی جیسے اہم اور معتبر شاعر پر چند مضامین کے علاوہ کوئی معروضی مطالعہ منظرِ عام پر نہ آ سکا۔ مگر اس کی ابتدا عمیر منظر نے کر دی ہے اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد بانی پر کام کرنے والوں کے احساسِ تشنگی میں یقیناً کمی واقع ہوگی۔

مصنف نے بانی کی سوانح و شخصیت کے ساتھ ساتھ غزل گوئی، نظم گوئی اور نثر نگاری کے ابواب مرتب کیے ہیں نیز دو ابواب بعنوان 'ٹوٹتے رشتوں کا شاعر' اور 'بانی کی شعری انفرادیت' میں بانی کی غزل گوئی کا تفصیلی محاکمہ پیش کیا ہے۔

بانی کی غزل گوئی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے عمیر منظر نے شاعر کی شعری کائنات، الفاظ و تراکیب، پیکر تراشی اور علامتی قوتِ اظہار پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ علامتوں کی گہری معنویت شاعر کے غور و فکر کی غماز ہے اور اس کے شعور و لاشعور کی نمائندہ بھی، اس خیال کے زیرِ اثر مصنف نے بانی کی غزلیہ شاعری کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

اس مونوگراف کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں بانی کی نظم نگاری پر بھی ایک باب مختص کیا گیا ہے۔ عام طور پر بانی غزل گو شاعر کے طور پر مشہور ہیں مگر ان کے کلام میں خاصی تعداد نظموں کی بھی ہے۔ مذکورہ باب میں بانی کی نمائندہ نظموں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بانی کی نثر نگاری کو بھی موضوعِ مطالعہ بنایا گیا ہے، جس کا تعلق ادبی صحافت سے تھا۔ باب بعنوان 'ٹوٹتے رشتوں کا شاعر' میں بانی کے ایسے اشعار سے بحث کی گئی ہے جس میں انسانی تعلقات کی شکست و ریخت کو موضوع بنایا گیا ہے نیز جدیدیت کے زیرِ اثر در آنے والی تنہائی، اداسی اور غم آفرینی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یاد ایک احساسِ محرومی ہے کہ جو انسان کا مقدر ہے اور اس کی بنیاد ٹوٹتے رشتوں پر رکھی گئی ہے۔ بانی کے اسلوب سے متعلق مصنف کا یہ بیان کہ ''انھوں نے روایتی اقدار کی شکست و ریخت کے لامتناہی غم کو اپنے لہجے سے ہم آہنگ کر کے میر کی سنجیدگی اور غالب کی فکری صلابت کے خمیر سے کیفیت کو نئے پیکروں کے ذریعے مجسم کیا۔'' حق بجانب ہے اور غزل کی تاریخ کے دو معتبر و مستند اساتذہ سے ان کی ذہنی و فکری ہم آہنگی کا یہ اشارہ غور و فکر کے کئی در وا کرتا ہے۔

مونوگراف کے آخیر میں انتخابِ کلام کے علی الرغم نایاب کلام کو بھی شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔ نایاب کلام میں بانی کی 'خوب سے خوب تر' کی کاوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس دلجمعی اور کاوش کے ساتھ وہ اپنے ہی کلام پر نگاہ ڈالتے تھے اور اس میں تنسیخ و اضافہ کرتے تھے۔

انتخاب کلام میں عمیر منظر کی شعر فہمی اور ادب شناسی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

غرض بانی کے تعلق سے پہلی کتاب کی اشاعت پر ہم عمیر منظر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ مونوگراف قبولِ عام کی سند حاصل کرے گا۔

عصمت جاوید (مونوگراف)

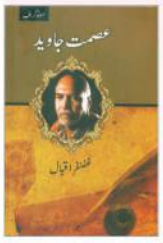

مصنف: غضنفر اقبال

صفحات: 102، قیمت: 68، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ساجد ذکی فہمی، پروجیکٹ فیلو

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ 110025

عصمت جاوید کا شمار اردو ادب کے ان نامور ادیبوں یا فن کاروں میں نہیں کیا جاتا جنھوں نے اردو ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ حالاں کہ اردو ادب کے تئیں ان کی خدمات کا جب ہم غائر مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت و استعجاب سے ہماری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں کہ ایسے فن کار سے اردو ادب کا ایک بڑا طبقہ آخر کیوں کر غافل ہو سکتا ہے۔ عصمت جاوید بیک وقت شاعر بھی تھے، نقاد بھی، مترجم بھی تھے اور قواعد داں بھی۔ ان کی تخلیق 'اردو پر فارسی کے لسانی اثرات' یا 'لسانیاتی جائزے' کو دیکھ کر انھیں ماہر لسانیات بھی تسلیم کر لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

زیرِ تبصرہ کتاب (مونوگراف) 'عصمت جاوید' غضنفر اقبال کی ہے۔ کتاب کو چار ابواب بالترتیب: عصمت جاوید: شخصیت وسوانح، ادبی تخلیقی، تاریخی تصنیفات وتالیفات کا مختصر جائزہ، تنقیدی محاکمہ، جامع انتخاب، میں منقسم عصمت جاوید کی حیات وخدمات کا مختصراً مگر جامع انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب کا پہلا باب عصمت جاوید کی شخصیت اور سوانح پر مشتمل ہے۔ اس باب کے ذیل میں مصنف نے عصمت جاوید کی پیدائش، تعلیم وتربیت، خاندان، ازدواجی زندگی، تصنیفات و تالیفات، مذہبی بیداری، بذلہ سنجی، حاضر جوابی وغیرہ کو بڑے موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب ان تخلیقات، تصنیفات اور تالیفات کے مختصر جائزے پر مبنی ہے جو عصمت جاوید کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس باب میں مصنف نے فرداً فرداً ان کی تقریباً تمام تخلیقات کا ایک سے دو پیراگراف میں جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔ یعنی ہر کتاب پر اس انداز سے گفتگو کی گئی ہے کہ ایک ہی نظر میں اس کی اہمیت وافادیت اور خوبی وخامی ابھر کر ہماری نظروں کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسے وضاحتی اشاریہ کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

تیسرا باب 'تنقیدی محاکمہ' کے عنوان سے قائم کرتے ہوئے مصنف نے عصمت جاوید کو بحیثیت ناقد، محقق، شاعر، مترجم، لغت وقواعد نگار جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے ساتھ ہی اپنی تنقیدی آرا سے بھی قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ مثلاً 'شاعر' کے ذیلی عنوان کے تحت مصنف، عصمت جاوید کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہیں ''عصمت جاوید کی غزل، نظم، قطعہ اور رباعی پر الفاظ غالب ہیں خیالات نے شاعر کا ساتھ چھوڑ دیا'' یعنی ان کی شاعری کا بیشتر حصہ ایسا ہے جسے لفظوں کی بازی گری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی شاعر کی مکمل شاعری پر ایک طرح کے خیالات کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا لہٰذا عصمت جاوید کی شاعری پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصمت جاوید کی شاعرانہ خامیوں کی نشاندہی کے باوجود بعض پہلوؤں کی تعریف کرتے ہوئے غضنفر اقبال رقم طراز ہیں:

> ''ان کے بعض ابیات مشہور ہوئے جس میں شاعر کا تعلّی کا احساس ہی نہیں ہے بلکہ اس تعلّی میں اس کا شعور، اس کا عہد اور اس کا وجود سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔''

کتاب کا چوتھا اور آخری باب عصمت جاوید کی تخلیقات کے انتخابات پر مبنی ہے۔ اس باب میں بھی دو ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ اوّل 'شاعری' اور دوئم 'نثر'۔ شاعری کے ذیل میں غزلیں، نظمیں، قطعہ، رباعی اور شعری تراجم کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ نثر میں اسلوب کیا ہے، لسانیات اور ہم اور نئی قواعد کیا ہے جیسے مضامین شامل ہیں۔

بہرحال مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جس نے اردو ادب کی خاموش خدمت انجام دی۔ کتاب کی طباعت کافی عمدہ ہے۔ قوی امید ہے کہ مصنف کی یہ کاوش اردو ادب کے لیے گراں بہا سرمایہ ثابت ہوگی۔

تاریخ تختِ طاؤس

مصنف: مولوی محمد عبداللطیف
صفحات: 216، قیمت: 86 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر حسن رضا (مدیر، اصنافِ ادب)، مظفر پور

'تاریخ تختِ طاؤس' خواہ ادب نما تاریخ ہو یا تاریخ نما ادب ہو، ہے بڑی معلوماتی تالیف ہے اور اس کے مؤلف مولوی محمد عبداللطیف کا یہ ایک عظیم تاریخی، وتالیفی کارنامہ ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ (آغاز سے لے کر ص 68 تک) پوری طرح ادبی ہے۔ 'تبصرہ و تعارف' صفحہ سولہ سے لے کر صفحہ چون تک بسیط ہے مگر اس کی نہ تو پیشانی پر اور نہ پشت پر مبصر کا نام رقم ہے۔ اغلب ہے کہ تاریخی مسودہ کی موصولی کے بعد مولوی محمد عبداللطیف کے کلام کو یکجا کیا گیا ہو اور موصوف کی حیات اور کارنامے مجتمع کر کے یہ حصہ تیار کیا گیا ہو۔ اس 'تبصرہ وتعارف' کا آخری اقتباس کچھ ایسے ہی اشارے کرتا ہے:

> ''یہ تمام امتحانات باستثنائے غزل اولین (بسلسلۂ تاثرات) وسط 1925 سے 1929 تک (دوران تعینات جھانسی کالج) کے کلام کا ہے۔ 1925 سے پہلے کا کلام جس میں نعتیہ حصہ زیادہ تھا، نہ قلمی ہاتھ آیا اور نہ وہ رسائل دستیاب ہوئے جن میں کبھی کبھی مولانا کا کلام شائع ہوتا رہا۔''

مقدمہ خود مؤلف ومؤرخ موصوف کا ہے۔ تقریباً چھ صفحات پر مشتمل اس مقدمہ کے اختتام پر مؤلف نے اپنی شناخت مع اسناد وتاریخ یوں رقم کی ہے:

> ''گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی (یوپی) محمد عبداللطیف خان کشتہ قادری، منشی فاضل
> 10 مارچ 1929 (آنرز اِن پرشین) بی ایل ای (ایڈوانسڈ ان اردو)''

مرتب یا پبلشر نے اس کی وضاحت نہیں کی ہے کہ دستی مسودہ کی براہِ راست اشاعت کی گئی ہے یا پھر اس کتاب کو اضافہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ مؤخرالذکر زیادہ قرینِ قیاس لگتا ہے۔ بہرحال، اس کوشش کی وجہ سے 'تاریخ تختِ طاؤس' ادب اور تاریخ کا سنگم بن گئی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ صفحہ اڑسٹھ تک مؤلف وادیب محمد عبداللطیف خاں کشتہ قادری کی عمرانی تاریخ اور ادبی تعارف ہے تو صفحہ 77 تا 216 مغلیہ حاندان وحکمراں اور ان کے ضمن میں دور سلطنت مغلیہ معاشرتی وثقافتی تاریخ ادبی انداز میں درج کی گئی ہے جس کے مرکز میں شان وسطوت کی علامت 'تختِ طاؤس شاہجہانی' ہے۔

مؤلف ومؤرخ مولوی محمد عبداللطیف خان کی عرق ریز تحقیق وتالیف کا اندازہ فہرست حوالہ جات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی جامع مگر بسیط تالیف کے لیے مولوی موصوف نے 85 کتابوں، رسالوں، اخباروں، لغتوں سے استفادہ واستنباط کیا ہے جن کا تعلق اردو، فارسی، انگریزی اور سنسکرت زبانوں سے ہے۔ گویا مولف نے شہادت و ثبوت کو یکجا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ہے۔ انھوں نے بابر تا اورنگ زیب عالم گیر کا تعارف ان کی حصولیابیوں کے پیش نظر ان الفاظ میں کرایا ہے جو ایک ماہر مورخ کے حاصل مطالعہ جیسا ہے:

> ''...بابر نے تو سلطنتِ ہند کی داغ بیل ڈالی، ہمایوں نے بنیاد کھودی اور ساز وسامان جمع کیا۔ اکبر نے اس بر عظیم الشان قصرِ حکومت تعمیر کیا، جہاں گیر نے اس کی زیب وزینت میں عمر گزاری، شاہ جہاں نے اطمینان سے بیٹھ کر چین کیے، لطف اٹھائے، شہرتِ عام اور بقائے دوام کے پھریرے اڑائے اور اورنگ زیب عالم گیر نے ہر کمی کو پورا کر دیا۔''

مولوی محمد عبداللطیف خاں نے تاریخ فہمی میں آسانی کے لیے ضمنی عناوین وضع کیے ہیں اور مختصر نوٹس کی مانند موضوعات کی مختصر مگر جامع تفصیل پیش کی ہے اور تاریخی شقوں اور اصطلاحوں کی وضاحت وصراحت فٹ نوٹ کے روپ میں کی ہے۔ اس کاوشِ احسن کی وجہ سے مغلیہ تاریخ عام قاری کے لیے بھی زود فہم ہوگئی ہے۔

مولوی محمد عبداللطیف نے صاحب تختِ طاؤس شاہ جہاں کی ولادت، تعلیم وتربیت، معیارِ مذاق، شوقِ فنونِ لطیفہ، محاذ آرائی اور فنِ حرب میں مہارت، انتظامی امور کو بجالانے کی صلاحیت وغیرہ پر تاریخی شہادتوں کے ساتھ تفصیلی بحث کی ہے۔ انھوں نے اپنے مرکزی موضوع 'تاریخ تختِ طاؤس' پر شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ تختِ طاؤس کی وضع اور تعمیر و تشکیل مہتمم تختِ طاؤس کی حقیقت واہلیت، تختِ طاؤس کی ہیئت مع جزئیات، اس میں جڑے

ہوئے لعل و گہر و جواہرات، وجہِ تسمیہ تختِ طاؤس گویا تمام جزئیات وتفصیلات مؤرخین کے حوالوں کے ساتھ یکجا کردیا ہے اور شہادت وثبوت کی روشنی میں ان کی آرا کو رد یا قبول کیا ہے۔

'تاریخ تختِ طاؤس' ادب اور تاریخ کا خوب صورت اتصال پیش کرتی ہے۔ تاریخ کو ادبی پیرائے میں پیش کر کے مؤلف موصوف نے اردو زبان وادب کے شیدائیوں کے لیے تاریخی معلومات کا بیش بہا خزانہ مہیا کردیا ہے اور تاریخ نگاری کو ایک نیا انداز بیان اور اسلوب وطرز ادا عطا کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب مسرت اور بصیرت دونوں بہم پہنچاتی ہے۔ اس کا مطالعہ سودمند بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔ یعنی یہ تسکین ذوق بھی کرتی ہے اور تکمیلِ معلومات کا فرض بھی ادا کرتی ہے۔

موعظۂ حسنہ [مکاتیب]

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد، مرتب و مدوِن: ثوبان سعید
صفحات: 434، قیمت: -/185 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: طلعت جمال، شاہین باغ، نئی دہلی

خطوط و مکاتیب ترسیل و ابلاغ کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان سے لوگوں کے درمیان رابطہ کے ساتھ ذاتی حالات وواقعات سے آگاہی ہوتی ہے۔ مکتوب نگار اس میں مکتوب الیہ سے مکالمہ ومخاطبہ کرتا ہے۔ یہ خطوط مکتوب نگار کے افعال واعمال، جذبات واحساسات اور تفکرات وتدبرات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ایک سطح پر دیکھا جائے تو مکتوب نگار کا ظاہر و باطن ان الفاظ وجمل میں مخفی ہوتا ہے۔ 'خطوط نگاری' ادب میں ایک فن اور آرٹ کا درجہ رکھتی ہے مشرقی ادبیات میں ہر دور میں اس کا چرچا رہا ہے، رقعاتِ عالمگیری، مکاتیب ابوالفضل وغیرہ اپنے موضوعاتی اور فنی واسلوبیاتی وجوہات کی بنا پر آج بھی قابل توجہ ہیں۔

اردو میں اس صنف کا وجود 'خطوط غالب' سے قائم ہوا۔ اس کے علاوہ رجب علی بیگ سرور، سرسید، شبلی اور حالی کے خطوط کے ساتھ نذیر احمد کے مکاتیب بھی اپنے معنوی سیاق میں ادب عالیہ کی یاد دلاتے ہیں۔ نذیر احمد کی ادبی اور علمی تصنیفات وتالیفات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی اولین شناخت اردو میں بنیاد گزار ناول نگار کی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے شاعری اور تراجم کے علاوہ خطوط کا بھی معتد بہ ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں کو بہت سارے خطوط لکھے ہوں گے لیکن وہ سب ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ ہمارے سامنے جو مجموعہ ہے، اس کے مکتوب الیہ مکتوب نگار کے صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد دہلوی ہیں۔ یہ خطوط ان کی طالب علمی کے زمانے سے متعلق ہیں۔ اس لیے ان میں بیشتر علمی وتعلیمی مباحث ملتے ہیں۔ چند ایک خطوط ذاتی مسائل وحالات سے متعلق ہیں۔ کچھ خطوط کے مکتوب الیہ مولوی بشیر الدین کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ہیں۔

نذیر احمد کے خطوط کو مرتب کرنے کی پہلی کوشش عبد الغفور شہباز نے کی۔ دوسری مرتبہ بھی یہ مجموعہ انھیں کی کوششوں سے 1308ھ = 91-1890ء میں مطبع انصاری سے شائع ہوا۔ اس کے بعد 1331ھ میں نذیر حسین صاحب تاجرِ کتب نے اس کا تیسرا اڈیشن شائع کیا۔ اس کے بعد نذیر احمد کے صاحب زادے اور ان خطوط کے مکتوب الیہ مولوی بشیر الدین احمد نے اپنی نگرانی میں 1919 میں شائع کیا۔ اس کا متن تیسری اشاعت پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ مولوی بشیر الدین کے بڑے صاحب زادے منذر احمد نے 1936 میں اس کا ایک اڈیشن شائع کیا۔ جو موعظۂ حسنہ کی اشاعتِ ثانی پر مشتمل ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے سردار گل کے مرتبہ متن کو افتخار احمد صدیقی کے مقدمہ کے ساتھ 1956 میں شائع کیا۔ یہ متن بھی اشاعتِ ثانی سے ماخوذ ہے۔ ان تمام اشاعتوں کو مدنظر رکھیں تو اس کی تدوین کا جواز یہ ہے کہ اشاعتِ اول بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ عبد الغفور شہباز نے دوسری اشاعت میں 'تہذیب' کے نام پر متن میں کتر بیونت اور اصلاح کا کام انجام دیا ہے۔ تحقیق اور تدوین متن کے لحاظ سے یہ نسخہ مشتبہ اور منشائے مصنف سے پرے ہونے کی وجہ سے قابل اعتنا نہیں۔ اس حقیقت کے باوجود اس کے بعد کی اشاعتیں اسی نسخے سے ماخوذ ہیں۔ ایسی صورت میں مرتب متن کا منشائے مصنف تک رسائی حاصل کرنا مشکل بلکہ چند ایک مقامات پر ناممکن ہوگیا ہے۔ اس لیے ایسے متن کی اشد ضرورت تھی جس میں منشائے مصنف کے پیش نظر جدید تدوینی اصولوں کے تناظر میں اسے مرتب کیا گیا ہو۔

ڈاکٹر ثوبان سعید لائق مبارک باد ہیں جو بہ ذات خود علم وتحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے ترتیب وتدوین متن کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نذیر احمد کے املائی خواص، اختلاف نسخ اور تعلیقات وفرہنگ سے متن کو مرصع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرتب نے تدوین متن میں الفاظ کی ادائیگی اور اسے ضبط کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ متن میں جہاں بھی اجمال یا اشتباہ تھا اسے تعلیق کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تعلیقات بعض جگہوں پر بلاوجہ طویل ہوگئی ہیں اور بعض جگہیں تعلیق سے خالی ہیں اور ان پر [معلوم نہ ہوسکی] کا نوٹ لگا گیا ہے۔ جب کہ مرتب اگر تھوڑی توجہ اور کرتے تو اسے مکمل کرسکتے تھے۔ عربی فقرات اور قرآنی آیات کی صحت اور اعراب وترجمے کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ مرتب نے کتاب کے شروع میں 59 صفحات پر مشتمل تفصیلی مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ اس میں مصنف کے سوانح حیات اور ان کی تصانیف سے متعلق تحقیقی گفتگو کی گئی ہے۔ نیز نذیر احمد کے ان مکاتیب کے علمی اور تربیتی پیش منظر کو واضح کیا گیا ہے۔ اس طور پر یہ مقدمہ نذیر احمد مطالعات سے متعلق ریسرچ اسکالرز کے لیے 'سوغات' کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اپنی تحقیقی روش اور دقت نظری کی بنا پر قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔

ہمارا طرز زندگی اور بیماریاں

مصنف: ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی
صفحات: 69، قیمت: 42 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ہمیہ محمدی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ان معنوں میں دوسرے اداروں سے مختلف ہے کہ یہاں سے جو کتابیں شائع ہوتی ہیں اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ تمام علوم وفنون سے متعلق کتابیں اس ادارے نے شائع کی ہیں، اس سلسلے میں کئی کانفرنس اور ورکشاپ کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب 'ہمارا طرز زندگی اور بیماریاں' اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ قومی کونسل نے اس سلسلے میں 'سائنس پینل' بنایا جس کا مقصد دراصل سائنسی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کرکے اردو کے قارئین کو اس سے واقف کرانا بھی تھا۔ اس اہم کام کے لیے کونسل نے الگ الگ ادیبوں کا انتخاب کیا جو سائنس اور اردو دونوں کے رموز واوقاف سے واقف ہوں۔ ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی کو 'ہمارا طرز زندگی اور بیماریاں' کا عنوان دیا گیا۔ جو کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

زیر نظر کتاب 'ہمارا طرز زندگی اور بیماریاں' میں مصنف نے اکیس مضامین شامل کیے ہیں، یہ مختصر ہیں مگر ان کی نوعیت مختلف ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ 'ابتدائی انسانی سماج' ہے۔ اس حصے میں مصنف نے سائنس اور ٹکنالوجی کے بڑھتے اثرات، ضرورت اور اہمیت کو مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ سائنس کی وجہ سے ہمارے سماج میں پھیلی توہمات اور اندھی تقلید کا خاتمہ ممکن ہے۔ مصنف نے کتاب کے اس حصے میں بیماریوں کے وجوہات کو بتانے کی کوشش کی ہے، دراصل ہماری لائف اسٹائل بالکل بدل گئی ہے، ہم اپنے کیریر کو لے کر اس قدر حساس ہوتے جارہے ہیں کہ ہمیں اپنی صحت

اور وقت پر کھانے کا بھی خیال نہیں رہا۔ انسانی بیماری کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مصنف 'ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی' نے چند خطرناک بیماریوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً 'موٹاپا'۔ یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کا سیدھا تعلق ہماری خوراک سے ہے۔ فاسٹ فوڈ اور ٹھنڈے مشروبات کے نام پر جس طرح کی چیزیں ہم کھا پی رہے ہیں اس سے ہماری صحت متاثر ہورہی ہے سچ کہا جائے تو ان تمام چیزوں کا منفی اثر ہوتا ہے۔ جہاں تک موٹاپے کا تعلق ہے تو کھان پان کے ساتھ ورزش نہ کرنا، دیر تک نیند کے علاوہ یہ موروثی بھی ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی نے ذیابیطس کا ذکر بھی کیا ہے۔ آج جس سے پوچھیے ذیابیطس سے متاثر ہے، خود مصنف کا خیال ہے کہ لگ بھگ 70 فی صد لوگ اس بیماری سے متاثر ہیں۔ ذیابیطس کوئی نئی بیماری نہیں اس کا ذکر مصر و یونان اور ہندو عرب تہذیب میں بھی ملتا ہے حالانکہ آج بھی لوگ اس سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ مصنف نے اس بیماری کی کچھ علامتیں بتائی ہیں مثلاً بھوک میں اضافہ، بار بار پیشاب آنا، پیاس کی شدت، کمزوری اور پسینے کی زیادتی وغیرہ ذیابیطس ہوسکتی ہیں۔ مصنف نے اس بیماری کے وجوہات بھی پیش کیے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب کا ایک مضمون 'آلودگی' ہے۔ ماحولیات کی افادیت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے مگر ہم تھوڑے سے فائدے کے لیے اپنے اردگرد کے قدرتی وسائل کو نقصان پہنچا رہے ہیں، پیڑ پودے کاٹے جارہے ہیں گندگی کو پانی میں پھینکا جارہا ہے اس سے پینے کا پانی بھی آلودہ ہورہا ہے جس سے ہماری صحت متاثر ہورہی ہے۔ 'ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی نے آلودگی اور اس کے مضرات کا ذکر کیا ہے ان کا خیال ہے کہ پانی کا استعمال چونکہ کھانے پینے سے لے کر برتن دھونے تک میں بلکہ کھیتوں میں آب پاشی اور جانوروں کو پلانے میں کام آتا ہے۔ پانی کی آلودگی سے انسانی زندگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آلودہ پانی بیماریوں کی ایک بڑی وجہ بھی بن سکتی ہیں۔ اس سے ہیضہ، یرقان، ملیریا جیسی خطرناک بیماری ہوسکتی ہے جو ہماری زندگی کے لیے بھی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

کتاب کا ایک مضمون 'جدید الیکٹرانک آلات سے ہونے والے نقصانات' ہے۔ آج انسانی زندگی میں بڑی تبدیلی آگئی۔ شاید ہی کوئی شخص ہو جو جدید الیکٹرانک آلے کا استعمال نہ کرتا ہو۔ چونکہ ان آلات میں سے بیشتر ایسے ہیں جن سے Electro magnetic rays نکلتا ہے جسے مصنف نے صحت کے لیے خطرناک اور مضر بتایا ہے، جو بالکل درست ہے۔

کتاب کے مصنف 'ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی' نے اپنی اس کتاب میں مختلف بیماریوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ وجوہات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مصنف نے فاسٹ فوڈ، ڈبہ بند غذائیں، مشروبات، منشیات، تمباکو نوشی، موبائل فون اور دیگر الیکٹرانک آلات، بیکری کی مصنوعات، آلودگی جیسے عنوانات قائم کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہم روز مرہ کے کھان پان پر توجہ دیں تو بہت سی بیماریوں سے خود کو محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

کتاب کا مقدمہ محمد خلیل نے لکھا ہے جو بہت مختصر ہے۔ یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ کتاب کی طباعت اچھی ہے قیمت مناسب ہے۔

حیوانات کی دلچسپ دنیا

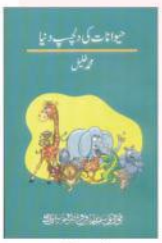

مصنف: محمد خلیل

صفحات: 83، قیمت: 24 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: رئیس صدیقی، 302/11، شاہجہان آباد اپارٹمنٹس، سیکٹر 11 دوارکا، نئی دہلی 110075

محمد خلیل صاحب ایک ایسے سائنس داں ہیں جنھوں نے اردو والوں کو سائنس اور ہر وہ چیز جس کا تعلق سائنس سے ہے، متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو مرہون منت ہے محمد خلیل صاحب کی کہ انھوں نے سائنس کے حوالے سے اردو کی ناقابلِ فراموش خدمت کی ہے اور محمد خلیل سائنس اور اردو ایک دوسرے کے مترادف ہے۔ نئی دہلی سے نکلنے والا اردو ماہنامہ 'سائنس کی دنیا' کے وہ مدیر رہ چکے ہیں۔ ان کی ادارت میں یہ پرچہ کافی مقبول ہوا تھا۔ اکثر و بیشتر محمد خلیل کے سائنس کے حوالے سے مضامین جرائد و رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب 'عجیب و غریب جانور' بہت مقبول ہوئی تھی اور اسے قومی سطح پر انعام واکرام سے بھی نوازہ گیا تھا۔

کتاب 'حیوانات کی دلچسپ دنیا' میں 13 جانوروں کے بارے میں آسان زبان و انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ جانور ہیں۔ قدیم دنیا کا سب سے بڑا جانور ڈائناسور مکڑی— ایک ہنرمند کیڑا، تیز دوڑنے والا ہرن، بلی— ایک صفائی پسند گھریلو جانور، چھلانگ لگانے والا مینڈک، ہمیشہ رہنے والا ہائڈرا، تیز دوڑنے والی چھپکلیاں، غیر زہریلا سانپ۔ اژدہا، چمکنے والا جگنو، نڈر گینڈا، حملہ کرنے والی ٹڈیاں، بہادر شیر اور چیتا، ہمتی دیمک۔

عنوان میں ہی، سب ہی جانوروں کے ساتھ ان کی خصوصیت جوڑنے کے باعث پڑھنے کے لیے طبیعت راغب ہوتی ہے۔

ہر جانور کی کہانی کے ساتھ تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں جس سے بچوں کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ کچھ باتیں تو بہت معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ جیسے گھاس کھانے والے ڈائناسور، مکڑی کے جالے میں شکار پھانسنے کا پھندا، مینڈک درخت پر چڑھ سکتے ہیں، پانی میں پائے جانے والے ہائڈرا کی شکل وصورت، ہائڈرا کا سفر کرنے کا طریقہ، داڑھی والی چھپکلی، تیراک چھپکلی وغیرہ۔

مجموعی طور پر یہ کتاب نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ مجھ جیسے بڑوں کے لیے بھی کافی معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ ہر اردو داں کو یہ کتاب ایک بار ضرور پڑھنی چاہیے۔

مقالاتِ پروفیسر محمد ابراهیم ڈار

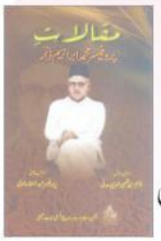

مرتبِ اول: ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

مرتبِ ثانی: پروفیسر عبدالستار دلوی

صفحات: 400 مجلد، قیمت: 400 روپے

ناشر: انجمن اسلام اردو ریسرچ سینٹر، ممبئی، 92 دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی

مبصر: ڈاکٹر ایس محمد یاسر، صدر شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم، کالج، میل وشارم

بیسویں صدی میں ممبئی کی علمی و ادبی شخصیات میں پروفیسر ابراہیم ڈار اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ کشمیری النسل تھے، پنجاب میں سکونت پذیر تھے۔ آپ نے اورینٹل کالج سے تعلیم حاصل کی۔ آپ پروفیسر محمد شفیع کے شاگرد تھے اور انھیں کی نگرانی میں میکلوڈ عربک ریسرچ اسٹوڈنٹ (فیلو) کی حیثیت سے کام کررہے تھے۔ آپ نے مشہور عربی شاعر 'جاحظ' پر تحقیقی کام کیا تھا۔ اس کے بعد آپ کا تقرر احمد آباد کے گجرات کالج میں ہوا۔ یہ نوآبادیاتی ہندوستان کا دور تھا۔ گجرات اور ممبئی ایک ہی ریاست میں واقع تھے۔ چند سال بعد آپ کا تبادلہ بمبئی کے اسماعیل یوسف کالج میں ہوگیا۔ آپ کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔

پروفیسر ابراہیم ڈار کی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف رہا ہے۔ آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن قائم کی تو اس کونسل کے بورڈ میں پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کو بھی شامل کیا۔

'مقالاتِ پروفیسر ابراہیم ڈار' تقریباً نصف صدی قبل شائع ہوئے تھے، جسے ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، سابق صدرِ شعبۂ اردو، اسماعیل یوسف کالج نے مرتب کیا تھا اور اپنے ایک سوانحی مضمون 'مرحوم ڈار' اور ڈاکٹر سید عبداللہ (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) کے مقدمے کے ساتھ

شائع کیا تھا۔ اس مقدمے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا تھا کہ پروفیسر ڈار کے حافظ پر لکھے گئے مضمون کو شامل کیا جانا چاہیے تھا۔ اب اس کتاب کے مرتبِ ثانی پروفیسر عبدالستار دلوی نے 1930 میں اورینٹل کالج لاہور کے میگزین سے حاصل کر کے کتاب میں شامل کر دیا ہے۔

پروفیسر ڈار ایک انتہائی قابل محقق تھے۔ اس کتاب میں شامل مقالات میں آپ نے دادِ تحقیق دی اور محققانہ ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ آپ کا ایک ایک مقالہ فکر ونظر کے کئی ابواب وا کرتا ہے۔ آپ نے اپنی تحریروں میں حزم و احتیاط اور توازن و اعتدال برقرار رکھا۔ آپ کی شخصیت کے مختلف گوشے کتاب میں شامل تعارفی مضامین کے مطالعے سے آشکار ہوتے ہیں۔ آپ بیباک اور بے لاگ اپنی رائے ظاہر کرتے تھے۔

آپ کے مقالات کی اشاعت سے ایک اہم علمی وادبی کارنامہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کتاب میں شامل مقالات کے عناوین ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ آپ نے کتنی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ کتاب میں شامل مقالات کے عناوین درج ذیل ہیں:

جہاں آراء بیگم کی ایک غیر معروف تصنیف صاحبیہ، دیوانِ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، شیخ فریدالدین عطار کے حالات وتصانیف کے متعلق ہندوایران کے علماء کی تحقیق، ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب۔ شمس العلماء عبدالغنی کا تازہ علمی کارنامہ، اقبال کی وطن دوستی، 'حیاتِ شبلی پر ایک نظر، اقبال اور عربی شعراء، اسپین کی اسلامی تاریخ کا ایک ورق، اشبیلہ کا نامور تاجدار المعتمد علی اللہ، باقر علی ترمذی مرحوم، رقعاتِ عالمگیر، گوجری اور اردو زبان کی نشوونما میں اہلِ گجرات کا حصہ اور حافظ کے سوانح حیات اور اس کی تصنیفات۔

اردو صحافی بہار کے

مصنف: ڈاکٹر سید احمد قادری

صفحات: 272 قیمت: 300 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر مخمور صدری، R-81، جوگابائی ایکسٹینشن، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

ڈاکٹر سید احمد قادری ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ افسانہ، تنقید، تحقیق اور صحافت کے میدان میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ دراصل وہ سائنس کے آدمی ہیں۔ لیکن سائنس داں ہونے کے ساتھ ڈاکٹر سید احمد قادری ایک اعلیٰ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ یہ ادبی شوق اپنے والد جناب بدر اورنگ آبادی سے ورثے میں پایا ہے۔ وہ آج بہار کے ادبی اور صحافتی منظرنامہ میں کافی متحرک اور فعال نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سید احمد قادری کی اردو میں اب تک 20 کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں۔ ادب کے ساتھ اردو صحافت کے میدان میں بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ خود ایک صحافی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا تحقیقی کارنامہ ''اردو صحافت بہار میں'' ہے۔ اس کتاب میں بہار میں اردو صحافت اور اس کے مختلف پہلوؤں اور امکانات ومسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ جس سے آنے والی نسلیں صدیوں استفادہ کریں گی، ساتھ ہی صحافت کے موضوع پر آئندہ کے محققین کے لیے حوالے کی کتاب بھی ہے۔ اس کتاب پر سید احمد قادری کو کے برلا فاؤنڈیشن، نئی دہلی کی جانب سے فیلوشپ ملی تھی، جس پر مغربی اور بہار اردو اکادمیوں نے اول انعام دیا تھا یہی نہیں بلکہ اسے تمام بہار اسٹیٹ یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

زیرتبصرہ کتاب ''اردو صحافی بہار کے'' سید احمد قادری کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ کتاب 272 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سو سے زیادہ بہار کے اردو صحافیوں کے احوال وکوائف کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہار کے صحافیوں کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کتاب میں اصل موضوع کے ساتھ تین اور مضامین شامل ہیں۔ اس کے بعد ان کی کتاب ''اردو صحافت بہار میں'' پر مشاہیر کی رائے اور آخر میں ڈاکٹر سید احمد قادری ایک تعارف ہے۔ سب سے پہلے ''مطالعہ کے پہلے'' میں سید احمد قادری نے صحیح لکھا ہے کہ بہار کے اردو صحافیوں پر نہ جانے کیوں ہمارے محققین نے توجہ نہیں دی ہے۔ جس کی وجہ سے آج بہار کے بیشتر اور بہت اہم صحافیوں کی تفصلات اور ان کے کارناموں سے ہم ناواقف ہیں۔ جبکہ ہر عہد میں بہار کے اردو صحافیوں نے بڑے اہم اور کلیدی رول ادا کیے ہیں۔ دوسرا مضمون 'صحافی کی تعریف اور اہمیت' ہے۔ اس میں انھوں نے اطمینان اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح بہار کے اردو صحافیوں نے بھی مشکل حالات میں بھی اپنی ذمے داریوں اور صحافتی فرائض کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، ظلم، ناانصافیاں اور حق تلفیوں کے خلاف ہمیشہ کھڑے رہے۔ اردو صحافت کی حرمت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں وسعت بھی پیدا کی ہے۔ بہار کے صحافیوں نے صحافت کو اپنا کرنہ صرف اپنے گہرے مطالعے ومشاہدے اور فکر وفلسفے سے صحافت کا مقام بلند کیا، بلکہ صحافت کو اپنے خیالات وافکار کا ذریعہ اظہار بنا کر اپنی شخصیت اور اپنی فکر سے دنیا کے سامنے اپنی ایک منفرد پہچان بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ حالانکہ انھیں بڑے دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑا ہے، قید وبند کی صعوبتوں کو جھیلنا پڑا ہے۔ تیسرا مضمون 'بہار میں اردو صحافت کا ارتقا' ہے جس میں بہار میں اردو صحافت کے آغاز وارتقا کے مختلف زاویوں کو پیش کیا ہے۔

زیرنظر کتاب بہار کے اردو صحافیوں کی تاریخ ہے۔ مصنف نے ناموں کی فہرست میں حروف تہجی کو برتا ہے، اگر اس فہرست کو ادوار میں تقسیم کیا جاتا تو قاری کا ذہنی تسلسل برقرار رہتا اور اردو صحافیوں کا عہد بہ عہد پورا منظرنامہ آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ حالانکہ اپنے مقدمہ میں اس فہرست کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے واضح کیا ہے لیکن کتاب کی ترتیب میں اس کا خیال نہیں رکھا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر سید احمد قادری قابلِ مبارک باد ہیں کہ کافی جدوجہد اور تلاش وجستجو کے بعد صحافت کے موضوع پر دوسری تاریخ مرتب کی ہے۔ اگرچہ بہت سے اہم نام چھوٹ گئے ہیں اور اختصار سے کام لیا ہے لیکن اردو صحافت پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے مواد فراہم کر دیا ہے۔

اس کتاب کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کی طباعت اور پیش کش دونوں عمدہ ہے۔ کور اور گیٹ اَپ بہت ہی خوبصورت ہے۔ لیکن جگہ جگہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ادب کے نئے اسکالر کے لیے یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔

ضیا فتح آبادی حیات اور کارنامے

مصنف: ڈاکٹر شبیر اقبال

صفحات: 368، قیمت: 450 روپے

ناشر: مہر فاؤنڈیشن، دھولیہ، مہاراشٹر

مبصر: پروفیسر فاروق احمد صدیقی، امرود بگان، جیل چوک، مظفرپور

زیرتبصرہ کتاب 'ضیا فتح آبادی حیات اور کارنامے' ڈاکٹر شبیر اقبال کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر بمبئی یونیورسٹی نے 1990 میں ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے لیکن اس کو کتابی صورت بائیس برسوں بعد 2013 میں دی گئی ہے۔ اس درمیان یہ مقالہ غالباً نظرثانی اور نظرثالث کے مراحل سے گزرتا رہا۔ اس میں اسکالر نے پوری توجہ اپنے اصل موضوع پر مرکوز رکھی ہے اور غیرضروری مباحث سے احتراز کرتے ہوئے اس سے متعلق مواد کی فراہمی میں بڑے اخلاص، انہماک اور دلچسپی کے شواہد مہیا کیے ہیں۔ اسی لیے یہ مقالہ اب کتابی صورت میں آکر اپنی گراں مائیگی کا احساس دلا رہا ہے جس کے لیے مصنف بجا طور پر ہدیہ تبریک کے مستحق ہیں۔

اس کتاب پر پیش لفظ جناب ضیاء الدین احمد شکیب کا تحریر کردہ ہے اور مقدمہ ڈاکٹر مہدی تابش کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر ہارون فراز نے حرف تحسین پیش کیا ہے۔ تو تقریظ ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی نے لکھی ہے۔ ان تمام ممتاز صاحبان علم و دانش نے بڑی محبت اور فراخ دلی کے ساتھ ڈاکٹر شبیر اقبال کی اس کتاب کو اعتبار نظر بخشا ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ضیاؔ فتح آبادی کے عہد اور ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شخصیت اور خاندانی پس منظر پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے حالات زندگی کو یکجا کرنے میں جزئیات تک کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ اس طرح ضیاؔ فتح آبادی کا ایک جامع سوانحی خاکہ مرتب ہوگیا ہے جس کی اہمیت، افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے باب میں ضیاؔ فتح آبادی کی شاعرانہ حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بھی مصنف نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

ضیاؔ فتح آبادی کی شاعری کی ابتدا حضرت سیماب اکبرآبادی سے شرف تلمذ اور پھر اُن (ضیا) کے چودہ تلامذہ کا تذکرہ بہت تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ضیاؔ فتح آبادی کے طریقۂ اصلاح کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے تمام شاگردوں کی دریافت اور حالات زندگی کے ساتھ ان کے نمونۂ کلام کا حصول کوئی آسان کام نہیں تھا مگر جب ذوقِ فراواں خضرِ راہ بن جائے تو ساری مشکلیں دور ہوجاتی ہیں اور منزل مقصود خوش آمدید کہنے لگتی ہے۔ مصنف کی غیر معمولی محنت قابل داد ہے۔ اسی باب میں ضیاؔ فتح آبادی کے دس شعری مجموعے کا بھی تعارف پیش کیا گیا ہے اور ان کے محاسن کلام پر بھی اجمالی گفتگو کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں ضیاؔ فتح آبادی کو بحیثیت نثر نگار روشناس کرایا گیا ہے۔ ضیاؔ فتح آبادی کی تمام نثری نگارشات جو مختلف جرائد و رسائل میں بکھری ہوئی تھیں ان کی جستجو اور بازیافت کا کام بھی کرہی لیا ہے۔ ضیا کا نثری سرمایہ محض چند افسانے، چند مکتوبات، ایک خطبۂ صدارت اور ایک کالج میگزین کے اداریہ پر مشتمل ہے۔ مگر ان میں اچھی نثر نگاری کے خوبصورت نمونے جابجا ملتے ہیں۔ اس طرح مصنفِ کتاب نے ضیا کی نثر نگاری کو بھی شامل کتاب کرکے قابل قدر کام کیا ہے۔ چوتھا باب اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے جس میں مشاہیر نقد و نظر کے حوالے سے ضیاؔ فتح آبادی کا شعری و ادبی مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضیاؔ فتح آبادی کے فکر و فن کو خراج تحسین پیش کرنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ مصنف کتاب نے جن چھیاسی اصحاب علم و ادب کے نام دیے ہیں ان میں علامہ سیماب اکبرآبادی، ابر احسنی گنوری، اعجاز صدیقی، خواجہ احمد فاروقی، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، تنویر احمد علوی، عنوان چشتی، رشید حسن خاں اور پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے اکابرین کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر شبیر اقبال کی کتاب 'ضیاؔ فتح آبادی حیات اور کارنامے' ان کی ایک اہم پیش کش ہے۔

ڈاکٹر شبیر اقبال کو صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ضیاؔ فتح آبادی پر عمدہ تحقیقی کام کرکے ان کو ایک نئی زندگی عطا کردی ہے۔ اردو کی موجودہ اور آنے والی نسلیں ضیاؔ فتح آبادی کو آسانی سے فراموش نہیں کرسکیں گی۔

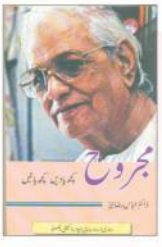

مجروح کچھ یادیں کچھ باتیں

مصنف: ڈاکٹر عباس رضانیر

صفحات: 226، قیمت: ندارد، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: اردو ہندی ساہتیہ اوارڈ کمیٹی لکھنؤ

مبصر: اسلم مصباحی، ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب ترقی پسند تحریک کے ممتاز شاعر اسرار الحسن خان مجروح سلطانپوری کی حیات و خدمات پر مشتمل ہے جس میں ان کے فن، شخصیت، طرز معاشرت، اخلاق و آداب، تعلیم اور کیریئر وغیرہ کا تفصیلی ذکر ملتا ہے، کتاب اردو ہندی ساہتیہ اوارڈ کمیٹی کے تحت منعقدہ سیمنار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے جسے شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر عباس رضانیر نے مرتب کیا ہے۔ کتاب میں کل 16 مضامین اور ایک مقدمہ ہے۔ پہلا مضمون 'مجروح ایک جائزہ' پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کا ہے جس میں موصوف نے مجروح کی غزل گوئی کے حوالے سے بڑی ٹھوس اور جامع گفتگو کی ہے آپ کے مطابق مجروح کی غزل حکایت روزگار اور حدیث حسن کا مرکب ہے اور مجروح کی غزل میں علامتوں کا استعمال بڑی خوش اسلوبی سے ملتا ہے بعض شعرا سیاست میں پڑ کر اپنی عاقبت خراب کر لیتے ہیں لیکن مجروح نے سیاسی شاعری بھی بڑے سلیقے سے کی ہے، اس مضمون میں مجروح کی لفظیات و استعارات اور ان کے امتیازات پر بڑی معنی خیز گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرا مضمون 'مجروح سلطانپوری: حیات اور غزل گوئی' ہے جس کے مصنف پروفیسر علی احمد فاطمی ہیں فاطمی صاحب کا نصف مضمون ان کی حیات سے متعلق ہے جو عموماً مجروح پر لکھی جانے والی دیگر کتب میں خاصی تفصیل سے ہے اس کے علاوہ مجروح کا لکھنؤ، علی گڑھ کا زمانہ، جگر کی معیت اور بمبئی کے سفر کی تفصیل پیش کی ہے، فاطمی صاحب نے مجروح کی ابتدائی غزل گوئی کے رنگ کے حوالے سے بحث کی ہے جس میں عشقیہ شعر زیادہ ملتے ہیں لیکن بعد کی شاعری میں خاص قسم کی پاکیزگی، احساس کی تازگی اور تہذیب و شائستگی کے عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ تیسرے مضمون میں فیاض رفعت نے افسانوی انداز میں مجروح سے وابستہ اپنی یادیں رقم کی ہیں جس میں مجروح اور ان کی بیگم کے اخلاق و عادات اور کچھ خاص باتوں کا ذکر ملتا ہے چوتھا مضمون راشد انور راشد کا ہے موصوف نے 'مجروح اور فلم' کے حوالے سے گفتگو کی ہے جس میں مجروح کے فلمی دنیا کا سفر اور ان کے شروعاتی دور سے متعلق خاص باتیں رقم کی گئیں ہیں، اس مضمون میں مجروح کی نغمہ نگاری اور بیشتر فنکاروں کے ساتھ ان کی وابستگی کے ساتھ مجروح کے مشہور زمانہ نغموں اور فلموں کا تذکرہ ہے جس نے زمانے بھر میں دھوم مچادی تھی اور آج بھی ان کے سریلے بول کانوں میں رس گھولتے ہیں جن کے سبب مجروح کو فلمی جگت کے سب سے بڑے انعام 'دادا صاحب پھالکے اوارڈ' سے نوازا گیا۔ پانچویں مضمون میں انیس امروہوی نے بھی ان کی زندگی کے حوالے سے لکھا ہے جو پہلے کے مضامین میں کم و بیش ذکر کا جا چکا ہے، چھٹا مضمون 'مجروح سلطانپوری بطور نغمہ نگار' شفیق احمد نے لکھا ہے لیکن مواد عنوان سے بالکل مختلف ہے مضمون میں نغمہ نگاری کے نام پر محض چند نغموں کے نام گنانے پر اکتفا کیا گیا ہے زیادہ تر ان کے حالات زندگی کا ذکر کیا ہے، ڈاکٹر وسیم بیگم کا مضمون 'مجروح سلطانپوری غزل کے آئینے میں' لائق مطالعہ ہے مصنفہ نے تمہیدی ہیر پھیر سے بچتے ہوئے مجروح کی غزل کے فنی امتیازات اور اس میں برتے جانے والے مسائل سے خوب بحث کی ہے، مجروح کی غزل اور نظام فکر کے حوالے سے تفصیلی بحث کا نمونہ ملتا ہے، ڈاکٹر عشرت ناہید نے ترقی پسند شعری روایت کے تناظر میں مجروح کی غزل گوئی کا محاکمہ کیا ہے، انجینئر محی بخش قادری نے غزل سے فلمی شاعری تک کے سفر پر روشنی ڈالی ہے موصوف نے مجروح کے ترنم کے پرسوز و پرسکون ہونے کی بات کہی ہے جس کا سہرا وہ حضرت جگر کے سر باندھتے ہیں ڈاکٹر منتظر مہدی نے بھی کم و بیش وہی بات کہی ہے جو قادری صاحب نے کہی ہے، ڈاکٹر ماہ طلعت صدیقی نے بھی مجروح کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر مسیح الدین خان کا مضمون انفرادی نوعیت کا ہے جس میں مجروح کی خطوط نگاری کے حوالے سے بحث کی گئی ہے، محمد حنیف خان نے مجروح کی احتجاجی شاعری اور اس کے خدوخال پیش کیے ہیں، ڈاکٹر عباس رضا نیر نے مجروح کی شعری جمالیات پر بہت تفصیل سے لکھا ہے موصوف نے مجروح کی لفظیات اور ان کی نرم آواز پر گفتگو کی ہے اور مجروح کی نادر تشبیہات و استعارات کو مثالوں کے ساتھ واضح کیا ہے۔

مسرور فیضی کا مقالہ مختصر ہونے کے باوجود معلوماتی اور رواں ہے، کتاب کے آخری حصے میں مجروح کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات

مصنف: ظہیر حسن ظہیر
صفحات: 508 قیمت: 350 روپے
ناشر: عدلیہ پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، یوپی
مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف
علاّمہ اقبال اسٹریٹ سنبھل، یوپی .244302

آج کے مصروف دور میں بھی اردو زبان وادب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے قلم کار پوری دلجمعی اور ذوق وشوق کے ساتھ قلم وقرطاس سے جڑے ہوئے ہیں اور اپنی بساط بھر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اردو کے ایسے ہی قلم کاروں میں ایک نام ایم۔نسیم اعظمی کا بھی ہے۔ آپ نے اردو ادب کی جو خدمات انجام دیں ان کا تعارف وتجزیہ ان کے ایک قدرداں ظہیر حسن ظہیر نے بڑی مہارت ولیاقت سے ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

یہ کتاب مختلف عناوین کے تحت 6 ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا انتساب علم دوست اور ادب نواز شخصیت محمد عرفان جونپوری کے نام پر کیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب کا بڑا ہی دیدہ زیب فوٹو ہے۔ جس کے بعد مختلف مواقع پر لی گئی تصاویر بھی کتاب کی اہمیت کا باعث ہیں۔ ابتدا میں تصدیق نامہ کے عنوان سے ڈاکٹر انیس ادیب کی تقریظ دی گئی ہے۔ اس کے بعد 'اعترافِ حقیقت' کے عنوان سے مرتب کتاب کے رشحاتِ قلم دیے گئے ہیں جس میں کتاب کی افادیت اور ڈاکٹر ایم۔نسیم اعظمی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر محبوب راہی کی تحریر سے کتاب کے پہلے باب 'شخصیت نامہ' کا آغاز ہوتا ہے۔ (اگرچہ کتاب میں بابِ اوّل کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے) اس باب میں ایم۔نسیم اعظمی کی شخصیت شناسی کے حوالے سے ایس ایم عباس، احسن امام احسن، ڈاکٹر شفیق اعظمی، ڈاکٹر شکیل احمد، عبرت مچھلی شہری، ڈاکٹر علی عباس امیر، ڈاکٹر شمشاد عنبر آفاقی، رفیق اشفاق، محمد عرفان جونپوری، ظہیر حسن ظہیر کے گراں قدر مضامین دیے گئے ہیں۔ جن سے اعظمی صاحب کی ذات وشخصیت کو سمجھنے میں بڑی معاونت حاصل ہوتی ہے اور کتاب کا قاری بڑی حد تک ان سے متعارف ہو جاتا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب 'تعلیمی کائنات' کے عنوان سے ہے جس میں ایم نسیم صاحب کے تعلیمی افکار ونظریات اور ان کی علمی خدمات کی مناسبت سے پروفیسر عتیق احمد صدیقی، سیّد حامد، ڈاکٹر حسن الدین احمد، پروفیسر خورشید احمد نعمانی، عبد الغنی شیخ، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر وسیم احمد اعظمی، طفیل احمد انصاری، ڈاکٹر اختر سعید انصاری وغیرہ کے قیمتی مضامین زینت افروز ہیں۔ اس کے بعد کتاب کے باب سوم کا آغاز ہوتا ہے۔ جو مشتمل ہے اعظمی صاحب کے تحقیق وتنقید کے کارناموں پر۔ اس باب میں اردو کے جن نامور قلم کاروں کی تحریریں شامل ہیں ان میں کچھ اہم نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر امین انعامدار، حقانی القاسمی، ڈاکٹر شہناز صبیح، عبدالحئ پیام انصاری، ڈاکٹر وکیل اشہر، ڈاکٹر فیضان خاں وغیرہ۔

کتاب کے چوتھے باب میں نسیم صاحب کی شعری خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر علیم صبا نویدی، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ڈاکٹر انس مسرور، وشوانا تھ طاؤس، شارق عدیل، ڈاکٹر سیفی سرونجی، م۔عتیق انصاری، ڈاکٹر شریف احمد قریشی، حماد انجم ایڈوکیٹ، محمد دانش غنی جیسے عظیم نام ہیں جنھوں نے اعظمی صاحب کی شعری قدر شناسی کا فرض نبھایا ہے۔ اور میدان سخن میں ان کا مقام ومرتبہ واضح کیا ہے۔

کتاب کا پانچواں باب 'خیابانِ خیال' کے عنوان سے ہے۔ جس میں ڈاکٹر نسیم صاحب کی ذات وخدمات کی مناسبت سے مشاہیر مبصرین وتجزیہ کار کے تبصرے وجائزے پیش کیے گئے ہیں۔ اس باب کا پہلا گوشہ تاثرات کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں موصوف کی کتاب 'تعلیمی اشارات' پر تبصرے دیے گئے ہیں۔ اس طرح اور حصوں میں 'تعلیمی نکات' اثر انصاری (جن پر نسیم صاحب نے تحقیق کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے) پر چند تحریریں، تعلیم اور تعلیمی افکار، میزانِ آگہی، قصد سخن، مولانا قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات، اثر انصاری حیات اور خدمات، تعلیمی جہات، تعلیمی تجزیے اور اثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں کے عنوانات کے تحت اردو کے ممتاز قلم کاروں کی تحریریں قلم بند ہیں۔ کتاب کے اس حصے میں ملک کے ممتاز ناقدین ومبصرین کے رشحاتِ قلم شامل ہیں۔ (یہ اردو تنقید کے وہ نام ہیں جنھیں اپنے میدان میں سند کا درجہ حاصل ہے) جن میں ان کے فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ جن سے ایم۔نسیم صاحب کے کارناموں کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے اور ان کی شخصیت شناسی کے ساتھ ہی ان کے فکر وفن کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس طرح معلومات بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور قارئین پر زیرِ نظر کتاب کی افادیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

کتاب کا باب ششم (منظوم خراج تحسین) کے لیے مختص ہے جس میں عبدالمتین جامی، اسلم سہیل، اظہر سلیم، طرب صدیقی، احمد علی برقی، محفوظ الرحمٰن عادل، نیاز جیراجپوری، ڈاکٹر شمشاد عنبر آفاقی جیسے ممتاز ومشاق شعرائے کرام کے سخن پارے زینت قرطاس بنے ہوئے ہیں۔

کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ہی اس کا پشت والا ورق بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس پر ملک کے مایۂ ناز محقق و ناقد پروفیسر مظفر حنفی صاحب کے تاثرات قلم بند کیے گئے ہیں۔ کتاب میں شامل تحریروں کے دیگر قلم کاروں کے ساتھ ہی کتاب کے مرتب ظہیر حسن ظہیر بھی مبارکباد کے قابل ہیں کہ انھوں نے اردو کے ایسے ایسے سرخیل قلم کاروں کے رشحاتِ قلم ایک کتاب میں یکجا کر کے کوزے میں سمندر کو سمیٹ لینے کی مثال قائم کی ہے۔ یہ کتاب جہاں ایک طرف قارئین کو ایم۔نسیم اعظمی صاحب کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے متعارف کراتی ہے وہیں اردو کے بڑے ہی عظیم وقد آور اہل قلم کی تحریروں سے استفادے کا موقع بھی فراہم کرتی ہے۔

امید ہے مذکورہ کتاب اردو ادب میں اضافے کا باعث ہوگی اور اہلِ ذوق اس کو خرید کر اردو دوستی کا ثبوت دیں گے۔

غزلستانِ برار

مرتب: ضمیر ساجد
صفحات: 435 قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: الفاظ کمپیوٹرز نزد مومن پورہ مسجد اکولہ
مبصر: سعید اختر اعظمی

برار وسط ہند کا وہ خطہ ہے جس کی تہذیبی تاریخ کے آثار وشواہد ایک ہزار قبل مسیح تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے کھنڈرات اپنے زوال پہ نوحہ کناں ہیں جن میں سے بعض کو سرکاری دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہ قریہ مسلم بادشاہان کے عہد میں علم وادب کا مرکز رہا۔ ایران وافغانستان اور مصر وعرب کے علما وفضلا اور صوفیا نے یہاں علوم دینیہ کے چراغ جلائے۔ یہاں قدم رنجہ فرمانے والے ادبی ثقافت بھی لے کر آئے جس کے ابتدائی نقوش پندرہویں صدی کے اختتام پر دہار فانی کے یہاں نظر آتے ہیں۔ یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ تصوف وبھکتی اور ایہام گوئی سے حقیقت پسندی کے سفر میں فرنگی حکومت، علی گڑھ تحریک، شمالی ہند کی تحریکات اور ترقی پسندی کے اثرات سے شعر وادب مبرا نہ رہ سکا۔

ضمیر ساجد کا مرتب کردہ 'غزلستان برار' برار کے 125 سالہ شعری حوالوں کے استحکام کا اعلامیہ ہے۔ طویل عرصے پہ محیط شعرا کے تخلیقی گل بوٹوں کو گلدستہ کی صورت دینا

آسان نہ تھا۔ ضمیر ساجد نے شکیل اعجاز اور فصیح اللہ نقیب کی معاونت سے اس دشوار گزار مرحلے کو حتی الامکان سر کرلیا ہے۔ 200 سے زائد شاعروں کی کاوشیں مع مختصر تعارف زینتِ قرطاس ہیں جن سے فکری تنوع نمایاں ہوتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

ہو قفس کی تیلیوں پر بھی نگاہِ لطف برق
کیا نشیمن ہی کے تنکے تھے جلانے کے لیے

(پروفیسر منظور حسین شور)

جوشِ وحشت میں گریباں پہ نظر ہے شاید
یہی دیوانے کا سامانِ سفر ہے شاید

(احمد ارمانی)

سعی پیہم کی سسکیوں پہ نہ جا
شوق میں پیچ و تاب رہنے دے

(ابراہیم خلیل)

قہقہے درد کی تمہید بھی ہوسکتے ہیں
بجلیاں بھی کبھی ٹکراتی ہیں کاشانوں سے

(قاضی سید خورشید الدین خورشید)

تمھارے شہر میں تصویر بولتی ہوں گی
ہمارے گاؤں میں پتھر کلام کرتے ہیں

(مصطفیٰ جمیل)

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے جامع مقدمہ اور مرتب کے عرضِ حال سے مزین 'غزلستان برار' کا یہ منظر نامہ اگرچہ نامکمل ہے پھر بھی ایک طویل عہد کا خوبصورت رنگ و آہنگ قارئین کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

بہار میں تخلیقی نثر: آزادی کے بعد

مصنف: ڈاکٹر قیام نیر

صفحات: 800 (دو جلدیں)، قیمت: 850 روپے (دو جلدیں)

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: پروفیسر اسرائیل رضا، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

ڈاکٹر قیام نیر یونیورسٹی میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ اور کئی معتبر کتابوں کے مصنف ہیں۔ افسانہ، ناول، انشائیہ اور تحقیق و تنقید سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ ان کی ادبی کائنات میں 'تنہائی کا کرب' اور 'تحفہ' (افسانوی مجموعے)، 'بچھڑی دولہن' (ناول)، 'میری جو شامت آئی' (انشائیوں کا مجموعہ) اور 'بہار میں اردو افسانہ نگاری' (تحقیق و تنقید) شامل ہیں جنھیں ادبی حلقوں میں بہ نظرِ تحسین دیکھا گیا ہے۔

زیرِ تبصرہ تصنیف 'بہار میں تخلیقی نثر' (آزادی کے بعد) تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی حامل ہے جس میں موصوف نے بہار میں آزادی کے بعد تخلیقی نثر کے فروغ پر روشنی ڈالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

'بہار میں تخلیقی نثر' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں 432 اور دوسری جلد میں 368 صفحات ہیں۔ پہلی جلد میں جہاں ناول اور افسانے کا احاطہ کیا گیا ہے وہیں دوسری جلد انشائیہ اور ڈراما نگاری پر محیط ہے۔ انتساب اور ذاتی تعارف کے بعد کتاب کی فہرست پر نظر پڑتی ہے۔ اس فہرست کی خاص بات یہ ہے کہ موصوف نے قارئین کی سہولت کے لیے ہر جلد میں دونوں جلدوں کی مشتملات کو پیش کردیا ہے۔

پہلی جلد کے ناول باب میں یوں تو خاص طور سے آزادی کے بعد بہار میں اردو ناول نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے لیکن ماضی سے ناول کا رشتہ قائم کرتے ہوئے 'بہار میں اردو ناول-سمت و رفتار' کے زیرِ عنوان مصنف نے بہار میں لکھے گئے ناولوں کا ایک اجمالی جائزہ بھی پیش کردیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اختر اورینوی، شین مظفر پوری، شفق، عبدالصمد، حسین الحق، غضنفر، پیغام آفاقی، الیاس احمد گدی، شموئل احمد، شبیر امام، کوثر مظہری، علیم، شوکت خلیل اور خود اپنے ناول کا قدرے تفصیل سے مطالعہ پیش کیا ہے۔ 113 صفحات پر مشتمل ناول کے اس باب میں بہار کے مزید ناول نگاروں کے صرف نام کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے یہ باب تشنہ رہ گیا ہے۔ مصنف نے بڑی دیانت داری کے ساتھ اس تشنگی کا اعتراف کرتے ہوئے اس ضمن میں آگے کام کرنے کے لیے اپنی راہ بھی ہموار کرلی ہے۔

افسانہ سے متعلق اسی جلد کے باب میں بہار میں اردو افسانہ نگاری کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے جو ص 115 تا ص 432 پر محیط ہے۔ اس کے تحت موصوف نے بہار کے کم و بیش تمام افسانہ نگاروں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کہیں تفصیل، کہیں اختصار اور کہیں محض تذکرہ سے ہی کام لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں بھی مصنف نے بڑی دیانت داری کے ساتھ اعتراف کرلیا ہے کہ یہ باب دراصل ان کی مقبول عام تصنیف 'بہار میں اردو افسانہ نگاری' (از ابتدا تا حال) پر مبنی ہے۔

'تخلیقی نثر' کی دوسری جلد بھی انشائیہ اور ڈراما پر مشتمل ہے۔ ص 23 تا ص 100 پر محیط انشائیہ کے باب میں موصوف نے 'بہار میں اردو انشائیہ: رنگ و آہنگ' کے زیرِ عنوان بہار میں اردو انشائیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے سید محمد حسنین عظیم آبادی کو اردو انشائیے کا نقاش اول قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی بہار کے 23 انشائیہ نگاروں کا خصوصی مطالعہ پیش کیا ہے جن میں حسنین عظیم آبادی کے علاوہ انجم مانپوری، احمد جمال پاشا، اکبر علی قاصد، ماہ منیر خاں، ہاشم عظیم آبادی، طارق جمیلی، ناوک حمزہ پوری، تمنا مظفر پوری، اعجاز علی ارشد، ظفر چکدینوی، تاج انور، شبر امام، مناظر عاشق ہرگانوی، نعمان ہاشمی، ایم کمال الدین، مجتبیٰ احمد اور خود مصنف قیام نیر شامل ہیں۔ علاوہ ازیں بہار کے مزید گیارہ انشائیہ نگاروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح ڈراما سے متعلق باب ص 101 تا ص 172 پر محیط ہے۔ اس ضمن میں 'بہار میں اردو ڈراما کا ارتقائی سفر'، 'بہار میں اردو ڈراما آزادی سے قبل' اور 'بہار میں اردو ڈراما آزادی کے بعد' کے عناوین کے تحت بہار میں اردو ڈراما نگاری کی سمت و رفتار کا بھرپور اور پر مغز جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شین مظفر پوری، ذکی انور، سید محمد حسنین، شفیع مشہدی، تمنا مظفر پوری، نعمان ہاشمی سمیت کل 19 ڈراما نگاروں کے قدرے تفصیلی مطالعہ کے ساتھ مزید 14 ڈراما نگاروں کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔

تخلیقی نثر کی ان چاروں اصناف کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر قیام نیر نے 'احتساب' کے عنوان سے ان دونوں جلدوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی یہ پیش کش موضوع اور مواد کی سطح پر بھی ہے اور زبان و اسلوب کی سطح پر بھی مگر ہر جگہ ایک نوع کی انفرادیت ہے جو انھیں دوسروں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔

کتاب کے ص 185 سے ص 327 تک 103 تخلیقی نثر نگاروں کے سوانحی خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ کتابیات کے ضمن میں بنیادی اور ثانوی ماخذات کی فہرست کے علاوہ ان اخبارات و رسائل کے نام اور سنہ اشاعت بھی درج کردیے گئے ہیں جن میں ادیب و فنکار پر مضامین، تبصرے، انٹرویوز اور خطوط وغیرہ شائع ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی متعلا یونیورسٹی در بھنگہ میں پی ایچ ڈی مقالے کے عنوانات و مقالہ نگاروں کے نام، ادیب و فنکار کے خطوط سوالنامے اور انٹرویو کی فہرست بھی پیش کردی گئی ہے جن سے اس کتاب کی تکمیل میں مدد لی گئی ہے۔

ڈاکٹر قیام نیر کی یہ نئی تصنیف تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالروں کے لیے خصوصی طور پر یہ ایک بے حد مفید، کارآمد اور مشعل راہ کتاب ہے۔ کتاب کے تشنہ حصے کی تکمیل کے لیے صنفی اعتبار سے اگر کوشش کی جاتی تو اس سے کتاب کی معنویت اور افادیت میں مزید اضافہ ہوسکتا تھا تاہم امید کی جانی چاہیے کہ اس کتاب کو اربابِ علم و دانش میں قبولیت کی سند حاصل ہوگی۔

تکلف بر طرف

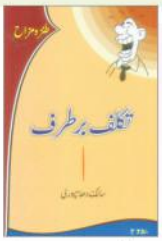

مصنف: سالک دھام پوری
صفحات: 112، قیمت: 73 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: جے پی ایس پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: ماہ نور، E-246/5 فرسٹ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

زیر تبصرہ تصنیف سالک دھام پوری کی طنز و مزاح سیریز کا دوسرا مجموعہ ہے، بظاہر تو یہ طنز و مزاح کا مجموعہ ہے جیسا کہ سرورق پر جلی حروف میں لکھا بھی گیا ہے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ صرف طنز و مزاح یا تفریحی مضامین کا کوئی مجموعہ ہے۔ سالک صاحب نے ان چھوٹے چھوٹے شاہ پاروں کے ذریعے حالات حاضرہ کی سچی عکاسی کرتے ہوئے جہاں قاری کو دعوت غور و فکر دی ہے وہیں سوئی ہوئی اور خواب غفلت میں پڑی نسل کو جھنجھوڑنے کا کام بھی بخوبی انجام دیا ہے۔

مصنف نے 'اپنی بات' میں ایک دعویٰ پیش کیا ہے کہ جب سے انھوں نے لکھنا شروع کیا وہ لکھتے ہی چلے آرہے ہیں۔ میں نے جب سلسلہ وار مصنف کی ان 22 کہانیوں کو پڑھا تو مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی کہ کوئی اردو ادب کا طالب یا سالک بغیر سعی مسلسل کے اپنی بات پیش کر ہی نہیں سکتا۔ یہ مضامین کا مجموعہ مصنف کے دعوے کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہے۔

مصنف نے ایک دوسرا دعویٰ بھی پیش کیا ہے کہ افسانہ نگاری اور سیاسی و سماجی مضامین لکھتے لکھتے اور زمانے کے نشیب و فراز سے دوچار ہوتے ہوئے ان کا قلم طنز و مزاح کی راہ پر چل پڑا۔ مجھے مصنف کے اس دعوے سے جزوی طور پر ایک خفیف سا اختلاف ہے اور ابتدا میں میں نے اس اختلاف کو نقل بھی کیا ہے۔

تکلف برطرف کو مکمل پڑھنے کے بعد مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ بسا اوقات ہم اپنے درمیان اور بآسانی دستیاب درنایاب کو معمولی سمجھنے کی بھول کر جاتے ہیں۔

خیر — کہانیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ مفروضی اور مبنی برحقیقت۔ مجھے نہیں معلوم کہ مصنف نے مفروضات کا سہارا لیا ہے یا نہیں لیکن اس مجموعے کی کہانیوں کو پڑھ کر یہ احساس بالکل نہیں ہوتا کہ یہ محض ایران توران کی باتیں ہیں یا لیلیٰ مجنوں و شیریں فرہاد کی حکایتیں ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ واقعات ہمارے ساتھ، ہمارے اردگرد یا کم از کم ہمارے عہد میں ہوتے رہتے ہیں اور بالکل مبنی برحقیقت ہیں۔

اس مجموعے کے مضامین کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے کیونکہ اس سے قبل 'چائے کی دوکان' نامی مجموعے میں بھی محترم نے اسی ترتیب کا خیال کیا تھا۔ جب مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہوں تو ترتیب کی پیچیدگی ایک مسئلہ بن کر سامنے آتی ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسی بنا پر مصنف نے حروف تہجی کو ترتیب مضامین کا سہارا بنایا ہوگا۔

میں چاہ رہا تھا کہ قارئین کے لیے ان بائیس (22) مضامین کی ایک الگ ترتیب پیش کروں مگر میرے سامنے بھی وہی پیچیدگی حائل ہے۔ پھر بھی 'یہ کون سی نسل ہے؟' اور 'بھوکا آدمی مرگیا' کو میں سب سے مقدم رکھنا چاہوں گا۔ 'یہ کون سی نسل ہے' میں موصوف نے نئی نسل، اس کے انداز، اطوار اور والدین سے ان کے رشتے کو جس ایمان داری سے بیان کیا ہے وہ ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ 'اور بھوکا آدمی مرگیا' میں مسلم تنظیموں اور دیگر جماعتوں کی بے راہ رویوں اور غلط پالیسیوں کو موصوف نے ہدف بنایا ہے۔

دوسرے نمبر پر میں خالص مزاحیہ مضامین 'لیموں کی چائے'، 'چودھری نماز سیکھ رہا ہے'، 'جب ہم نے سر منڈایا' اور 'بیوی کا خوف' کو رکھنا چاہوں گا۔ ان چاروں مضامین میں مزاح کا پہلو نمایاں طور پر نظر آئے گا۔ 'لیموں کی چائے' تکلف میں بولے گئے ایک جھوٹ کے نتیجے پر محیط ہے۔ 'اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر' مصرعے کی صداقت کا احساس بھی اس سے ہوتا ہے کہ کس طرح تکلف حاوی بن کر تکلیف بن جاتا ہے اور متکلف نوکری ترک کرنے کا ارادہ تک کر لیتا ہے۔

'چودھری نماز سیکھ رہا ہے' بھی ایک زبردست طنز کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور 'جب ہم نے سر منڈایا' سماج کے ایک مخصوص منفی کردار کو اجاگر کرتی ہے جہاں لوگ دوسروں پر بے جا اعتراضات کرتے نظر آتے ہیں۔ البتہ 'بیوی کا خوف' ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ 'بیوی کا خوف' کے مطالعے کے دوران مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ مصنف نے بہترین تشبیہات کا خوبصورت استعمال بھی کیا ہے اور سب سے بہتر یہ ہے کہ بیوی ہر چیز میں عیب نکالنا اپنا فرض عین سمجھتی ہے جس طرح برسر اقتدار پارٹی کے ہر کام میں حزب اختلاف کو خرابی ہی نظر آتی ہے۔

تیسرے نمبر پر میں نے باقی تمام مضامین کو جگہ دی ہے۔

'ایک نیتا جی سے ملاقات'، 'بھیا سروے کرانا ہے'، 'خاموش سرکار سوچ رہی ہے'، 'مرحوم کو خراجِ عقیدت' اور 'نیتا جی ہم آپ کو ووٹ کیوں دیں' ان پانچوں میں موجودہ سیاسی نظام اور سیاست دانوں کے طریقہ کار پر مصنف نے بحسن خوبی اپنے قلم کو جنبش دینے کی کامیاب کی ہے۔

'آگے ہوشیاری سے کام کروں گا'، 'پولیس انکوائری'، 'تمیں ہزار روپے'، 'کیا جی حضور کر سکتے ہیں آپ' اور 'مجھے بھی غنڈہ بنا دو سرکار' میں پولیس اور انتظامیہ کے رویے کو نشانہ بنایا ہے اور جرم، مجرم اور پولس کے رشتے پر مصنف نے بے باکی سے اپنے فن کو اجاگر کیا ہے۔ باقی مضامین 'تشریح غالب کے اشعار کی (ایک اور دو)'، 'حالات قابو میں ہیں'، 'رشوت بنام حق الخدمت'، 'ہماری قوم یتیم نہیں ہے' اور 'ہر مرض کی ایک ہی دوا' بھی اپنی اپنی نوعیت کے شاہ کار مضامین ہیں۔

المختصر یہ کہ تخلیق ہو یا تحقیق اس کا کتابی صورت میں تشکیل پانا کئی صبر آزما اور مشکل ترین مراحل سے گزرنا ہے اور کتاب کا رشتہ قارئین سے جڑ جائے تو اس تخلیق کے خالق کو اپنی پوری محنت وصول ہو جانے کا گمان ہوتا ہے۔ کتابوں پر کیے جانے والے تبصرے بھی اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میں بطور مبصر پوری ایمان داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مجموعے کے طنزیہ مضامین آپ کے دلوں سے رشتہ جوڑنے کے لیے کافی ہیں۔

تعلیمی جواہر پارے

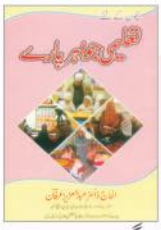

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان
صفحات: 104، قیمت: 60 روپے، سنہ اشاعت: 2015
مبصر: وکیل نجیب، مومن پورہ، ناگپور (مہاراشٹر)

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کی زندگی کا طویل وقفہ تعلیم دینے میں گزرا ہے۔ درس و تدریس کے پیشے سے منسلک رہے، پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک تدریسی فرائض انجام دیے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیمی اور ادبی موضوعات پر خامہ فرسائی بھی کی اور کئی کتابیں آپ کی صحیح سوچ کے نتیجے میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ''عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں'' پرائمری اور سیکنڈری لیول پر آپ درس و تدریس کے دوران بچوں کی تعلیم، اصلاح اور صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے بہت سی مفید باتیں و قفے وقفے سے لکھتے رہے ہیں۔ یہ کتاب اسی سوچ، کاوش اور کوشش کے نتیجے میں عالم وجود میں آئی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ مصنف بچوں کی تربیت اور اصلاح کے لیے مسلسل دینی اور عملی اقدام اٹھاتا رہا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بلا وجہ عبارت کو طویل نہیں بنایا گیا ہے۔ ضروری باتیں جو کم سے کم الفاظ

میں بیان کی جاسکتی ہیں بیان کردی گئی ہیں۔ مفرد جملے کثرت سے استعمال ہوتے ہیں جو بچوں کے مطالعے میں تیزی اور آسانی پیدا کرتے ہیں۔ آسان اور روزانہ استعمال میں آنے والے لفظوں کے استعمال سے کتاب بچوں کے لیے مفید ہوگئی ہے۔

کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ پہلا حصہ شمع فروزاں، دوسرا حصہ تعلیمی گلدستہ ہے۔ شمع فروزاں میں بچوں کی ذہنی سوچ، عادات واطوار کے نقائص کے متعلق مضامین تحریر کیے گئے ہیں اور ان سے کیا فائدہ یا نقصان ہوتا ہے یہ باتیں بیان کی گئی ہیں۔ شمع فروزاں کے عنوانات میں جھوٹ، دوست، تعصب، ادب، حسد، کامیابی کا راز وغیرہ پر مصنف نے بچوں کو معلومات بھی دی ہے اور بہت کام کی باتیں بھی بتائی ہیں۔ یہ بچوں کی اصلاح اور رہنمائی کا سبب بنتی ہیں۔ مثلاً ادب کے عنوان پر یوں رقم طراز ہیں:

''واقعی ادب سے انسان، انسان ہوتا ہے ورنہ انسان اور جانور، تعلیم یافتہ اور جاہل میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ اپنی گفتگو، رہن سہن اور عادات واطوار کو بااخلاق اور مہذب کیجیے، جب ہی آپ کو باادب اور بااخلاق کہا جائے گا، لوگ عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ آپ کا شمار نیک انسانوں میں ہوگا، باادب انسان بانصیب ہوتا ہے، بے ادب بے نصیب ہوتا ہے۔''

دوسرے حصے کے تعلیمی گلدستے میں بچوں کی تعلیم وتربیت سے بحث کی گئی ہے۔ اس حصے میں ہر اُس موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے جو بچوں کی تعلیم وتربیت اور رہنمائی کا سبب بنتی ہیں۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف تعلیم وتربیت کے معاملے میں کس قدر حساس واقع ہوا ہے۔ ایسا تدریس کے دوران ہر لمحہ وہ اس سوچ میں غرق رہتے ہیں کہ بچوں کے سدھار کے لیے کیا عملی قدم اٹھایا جانا چاہیے۔ بیشتر مدرسین و معلمات وقت گزار کر اپنے گھر روانہ ہوجاتے ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ نصاب مکمل کرادیا جائے، پورا پڑھادیا جائے، عملی کام کرادیا جائے، یہ دیکھنا ان کا کام نہیں ہے کہ بچے نے سیکھا کیا ہے، کتنا سیکھا ہے، کیا اس کی کمی ہے۔ ہماری تدریس میں کہاں کمی رہ گئی ہے۔ یہ سب وہ نہیں دیکھتے۔ پانچ گھنٹے کی ڈیوٹی، کورس پورا کرنا اور مہینہ ختم ہوتے ہی تنخواہ پانا، بس یہی کام انھیں آتا ہے۔ اسی طرح سے دن مہینے سال گزار دیتے ہیں۔ اتفاق سے یا اپنی ذہانت اور محنت سے کوئی بچہ اول آگیا تو اس کا پورا کریڈٹ اساتذہ اور معلمات خود لینے میں لگے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان صاحب کی سوچ بلند ہے، قوم کے بچوں کے تئیں ان کے خیالات بہت اچھے ہیں اور دل سے اصلاح وتربیت ان کی کوشش ہے۔ یہ باتیں اس کتاب سے واضح ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ کتاب بچوں سے زیادہ اساتذہ اور معلمات کے لیے مفید ہے۔ اس کے مطالعے سے نہ صرف ان کی اپنی کمیاں دور ہوں گی بلکہ وہ سوچ جو مصنف کے دل ودماغ میں منور ہے وہی روشنی ان کے دل ودماغ میں بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

یہ تمام موضوعات ایسے ہیں کہ تمام معلمین سے ان کا واسطہ پڑتا ہے لیکن کتنے ایسے ہیں کہ ان موضوعات پر ایسی دوراندیشی سے کام لیتے ہیں، انھیں صفحہ قرطاس پر بکھیر پاتے ہیں۔ یہ کتاب تعلیم کا سرچشمہ ہے۔ روشنی پھوٹ رہی ہے، دلوں کو روشن کررہی ہے، اب یہ ہمارا اور آپ کا کام ہے کہ اس مینارۂ نور سے ہم کتنی روشنی اپنے وجود میں جذب کرسکتے ہیں۔

اس کتاب کے ذریعے اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ اور معلمات اس کتاب سے کافی کچھ سیکھتے ہیں۔ میں الحاج ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان صاحب کو اس موضوع پر ایسی عمدہ کتاب تخلیق کرنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔

آموزش اردو

مصنفہ: پروفیسر رضیہ تبسم

صفحات: 239، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: بکم امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ 4

مبصر: محبوب عالم قاسمی، المعہد العالی الاسلامی،

مکان نمبر 18-13-132/GN/5/166، تعلیم آباد، پہاڑی شریف، حیدرآباد 500005 (تلنگانہ)

اردو کی تعلیم وتدریس اور لسانی پہلو کے حوالے سے ماضی میں کچھ کتابیں ضرور لکھی گئی ہیں لیکن اب ان میں بیشتر کتابیں نایاب ہوچکی ہیں۔ اردو قواعد اور انشا پر پہلے زمانے میں خاصی توجہ دی جاتی تھی مگر اب قدرے بے اعتنائی برتی جارہی ہے جس کی وجہ سے طلبا کو اردو زبان سیکھنے میں دقتیں بھی پیش آرہی ہیں۔ زبان سکھانے کے لیے آج بھی کچھ ایسی کتابوں کی شدید ضرورت ہے جن سے طلبا استفادہ کرکے زبان کے رموز کو جان سکیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو پروفیسر رضیہ تبسم کی کتاب 'آموزشِ اردو' طلبا کے لیے کافی کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔ یہ کتاب گو کہ بی ایڈ کے طلبا وطالبات کے لیے لکھی گئی ہے مگر یہ ان تمام طلبا کے لیے ہے جو اردو زبان سیکھنا چاہتے ہیں یا جن کا ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے۔

پروفیسر رضیہ تبسم نے اس کتاب میں زبان کی تعریف، ارتقا کے اصول وضوابط، اس کی اہمیت، خوش نویسی، مادری زبان اور اردو ذریعہ تعلیم کے علاوہ نثر ونظم کی ترویج کے اصول وضابطے بھی بیان کیے ہیں۔ انھوں نے انشا کی تدریس، قواعد کی تدریس، نصاب سازی اور درسی کتب کے حوالے سے بھی عمدہ گفتگو کی ہے۔ تدریسی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کتاب میں بھرپور مواد موجود ہے خاص طور پر یہ صرف طلبا کے لیے نہیں بلکہ ان اساتذہ کے لیے بھی ایک طرح سے نشانِ راہ ہے جو اردو زبان وادب کی تعلیم وتدریس سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے بہت ہی سلیس اور آسان انداز میں اردو سیکھنے اور سکھانے کے اصول اور نظریات بیان کردیے ہیں۔

اس کتاب کی یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں مگر اس کی تین نمایاں خصوصیات ہیں جن کا ذکر ضروری ہے:

(1) یہ کتاب مادری زبان کی اہمیت وخصوصیت کو اجاگر کرتی ہے اور یہ باور کراتی ہے کہ انسان اپنی مادری زبان سیکھے بغیر صحیح طور پر نہ بول سکتا ہے، نہ لکھ سکتا ہے۔

(2) یہ کتاب اردو زبان کی تدریس کے منہج اور طریقۂ کار پر روشنی ڈالتی ہے اور نظم ونثر دونوں پہلوؤں کے طریقۂ تدریس کا احاطہ کرتی ہے۔

(3) یہ کتاب نصاب سازی اور درسی کتب کے اہم خدوخال کو نمایاں کرتی ہے۔

اس کتاب میں رسم الخط پر بھی بہت عمدہ گفتگو ہے۔ انھوں نے اس تعلق سے لکھا ہے کہ ''رسم الخط کا لگاؤ صرف کسی زبان سے نہیں بلکہ اس کے ساتھ کسی قوم کی تہذیب وتمدن سے ہوتا ہے۔ رسم الخط کو اگر بدل دیا گیا تو وہ قوم جس کا اس رسم الخط سے لگاؤ ہے اپنے ماضی کی روایات، ادب، ثقافت اور علوم وفنون سے بیگانہ ہوجائے گی اور ایسے نقصان سے دوچار ہوگی جس کی تلافی ناممکن ہے۔'' انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''اردو زندہ ہے تو اپنے اس رسم الخط کے سبب۔ جس دن اس کا یہ ڈھانچہ جو رسم الخط کا ہے ختم ہوگیا تو اردو کا وجود بھی ختم ہوجائے گا۔''

پروفیسر رضیہ تبسم تدریس سے وابستہ رہی ہیں۔ انھیں بچوں کی نفسیات اور ان کے مزاج سے آگہی ہے۔ اس لیے انھوں نے طلبا کی ذہنی سطحوں کا خیال رکھتے ہوئے یہ کتاب تحریر کی ہے جو بہت مقبول ہوئی۔ پروفیسر ممتاز احمد خان نے اس کتاب کے تعلق سے بڑی اہم بات لکھی ہے کہ ''آموزشِ اردو، زبان سیکھنے سکھانے، خصوصاً اردو زبان کی تعلیم وتدریس کے موضوع سے متعلق اپنی نوعیت کی غالباً واحد کتاب ہے۔''

امید ہے کہ طلبا اس کتاب سے بھرپور استفادہ کریں گے! ■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت کو ترجیح دی جائے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

اردو ادب پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ایسی نادر و نایاب اور نصابی کتابوں کو اپنی اشاعتی اسکیم میں ترجیحی طور پر شامل کرے گی جو لائبریری اور کتب فروشوں کے یہاں دستیاب نہیں ہیں۔

یہ باتیں کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ اردو ادب پینل کی میٹنگ میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہیں۔ انھوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ جو میٹنگ لمبے وقفے کے بعد منعقد کی جاتی تھی اب چھ ماہ کے اندر دوبارہ منعقد کی گئی ہے یہ کونسل کے لیے خوش آئند بات ہے اور اس سے کونسل کی فعالیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی، انھوں نے کہا کہ وہ ادب جو سماج اور طلبہ کی ضروریات کی تکمیل نہیں کر پاتا ہے ایسی کتابوں کی اشاعت بے سود ہے۔ ہمیں ایسی کتابوں کی اشاعت پر زور دینے کی ضرورت ہے جن کی ادبی، عصری معنویت ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملازمت، تجارت یا پیشہ سے جوڑ کر دیکھنے کے بجائے اردو کو اپنی ثقافتی وراثت کے طور پر فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر پینل کے رکن پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ میری نظر میں ایسی نادر و نایاب کتابیں ہیں جن کی دوبارہ اشاعت کی اشد ضرورت ہے۔ عطر سخن، انتخاب زریں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اگر آپ مسودہ دستیاب کرادیں تو کونسل اس جانب مثبت قدم بڑھائے گی۔ انھوں نے تین ایسی نادر و نایاب کتابوں کا نسخہ پینل کے سامنے پیش کیا جسے اتفاق رائے سے تمام ممبران نے دوبارہ اشاعت کی منظوری دے دی۔ دنیائے افسانہ۔ 1927، عبدالقادر سروری، کردار اور افسانہ۔ 1929 عبدالقادر سروری، اصول افسانہ نگاری۔ اویس احمد ادیب۔

میٹنگ میں پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر نریش، جناب مشتاق احمد نوری، پروفیسر سلیمہ بی کولور، محترمہ مہ جبیں کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ محمد انصر اور ٹکنیکل اسسٹنٹ محترمہ آگمینہ نے بھی شرکت کی۔

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں اردو ادب پینل کی میٹنگ کا منظر

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 اپریل 2016

کونسل طب کا جامع نصاب تیار کرے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اہم طبی موضوعات اور طب سے متعلق نصابی کتابوں کو ترجیحی طور

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ کا منظر

پر شائع کرنے کی ضرورت محسوس کر رہی ہے۔ بیس (20) سے زائد مضامین پر طبی نصاب تیار کرنے کی طرف پیش رفت ہوئی ہے، جس میں مختلف باب کے لیے الگ الگ ماہرین کی مدد لی جا رہی ہے۔ آدھے سے زیادہ حصوں کو پورا کر لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں تین کتابیں بھی بہت جلد منظر عام پر آجائیں گی۔ اس کے علاوہ ماہرین طب کے پاس ادبیات سے متعلق جو بھی کتابیں موجود ہیں حوالہ جاتی کتب کی صورت میں کونسل انھیں شائع کرے گی تاکہ طلبہ زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ سارے پروجیکٹ 2011 کے ہیں جس میں کافی تاخیر ہو چکی ہے اب کونسل فعالیت کا ثبوت دیتے ہوئے بہت جلد اپنے اہداف کو پانے میں کامیاب ہوگی۔ اس پینل کی صدارت ڈاکٹر منور حسین نے کی۔ اس موقع پر پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے میٹنگ میں کئی اہم نکات کو زیر بحث لاتے ہوئے کہا کہ طب سے متعلق جتنی بھی کتابیں ہیں وہ اردو میں ہیں اور کونسل اس جانب پوری توجہ کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر مکمل نصاب تیار کر لیا گیا تو کونسل کا طب یونانی کی دنیا میں ایک بڑا کارنامہ ہوگا۔ خصوصی مدعو پروفیسر نعیم اے خان نے کہا کہ ایسے پروجیکٹ میں نئے لکھنے والوں کو شامل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس میں مزید تیزی لائی جا سکے۔ اس بات پر دیگر ارکان نے بھی اظہار اتفاق کیا۔

میٹنگ میں پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، پروفیسر زین العابدین، پروفیسر نعیم اے خان، ڈاکٹر منور حسین، ڈاکٹر ایس کے اے وحید، جناب محمد علی مرزا، ڈاکٹر شبیر احمد، ڈاکٹر سیما اکبر اور کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، جناب فیروز عالم، محترمہ ذیشان فاطمہ اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 مئی 2016

خطاطی کی نمائش

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند نے فن خطاطی کو قومی ورثہ قرار دیا ہے اور رسم الخط کی بقا و فروغ اور استحکام کے لیے ملک بھر میں خطاطی کے مراکز قائم کیے ہیں۔ حیدرآباد میں ادارۂ ادبیات اردو کے تحت 1979 سے خطاطی کا مرکز حسن خوبی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ جہاں ایک طرف شائقین فن کی تسکین ہوئی وہیں روزگار کے نئے راستے بھی دریافت ہوئے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے فن خطاطی کو گرافک ڈیزائن سے جوڑتے ہوئے روزگار کے نئے ذرائع ہموار کیے ہیں۔ اس طرح قومی اردو کونسل اور تربیتی مرکز خطاطی و گرافک ڈیزائن ادارۂ ادبیات اردو کا مشترکہ مقصد صرف ایک ہے کہ ہر انسان بہتر لکھے اور اس قومی ورثے کی حفاظت کرے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند کے تعاون سے چلائے جانے والے دو سالہ ڈپلوما کورس خطاطی و گرافک ڈیزائن ادارۂ ادبیات اردو مشن 16-2014 کے طلبا و طالبات کی جانب سے تیار کردہ فن پاروں کی نمائش بہ مقام 'ایوانِ اردو' ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹا حیدرآباد میں افتتاح بہ دست محترمہ انورادھا ریڈی عمل میں آیا۔ اس افتتاحی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے محترم زاہد علی خاں صدر ادارہ و ایڈیٹر ان چیف روزنامہ سیاست حیدرآباد اور ڈاکٹر محمد انوار الدین صاحب

پرنسپل انوار العلوم کالج حیدرآباد، سید محی الدین قادری مبشر پاشاہ (نبیرہ ڈاکٹر زور) کے علاوہ شہر کی کئی معزز شخصیتوں و اسکول/ کالج/ یونیورسٹیز کے اساتذہ طلبا و طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ اس نمائش خطاطی میں مختلف وضع کے طغرے، قرآنی آیات، نعتیں، نظمیں، رباعی، قطعہ و اشعار وغیرہ کو مختلف خطوط مثلاً خط نسخ، خط ثلث، خط دیوانی اور خط نستعلیق کو مختلف رنگوں سے مزین کر کے تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ گرافک ڈیزائن میں پنسل شیڈنگ اور انگریزی کیلی گرافی Cursive Writing کے فن پاروں کو مشاہدے کے لیے رکھا گیا ہے۔

پریس ریلیز: محمد عبدالغفار، سینئر انچارج ماسٹر کیلی گرافر، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، 28 اپریل 2016

ادبی شخصیات کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشستیں

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

نئی دھلی: اردو کے ممتاز دانشور، نقاد اور شاعر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے

ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی وفات سے اردو دنیا ایک بے لوث مجاہد اردو سے محروم ہوگئی۔ وہ پوری زندگی اردو تحریک سے جڑے رہے۔ آل انڈیا اردو رابطہ کمیٹی کے ذریعے اردو زبان کی بقا اور تحفظ کے لیے انھوں نے جو کوششیں کی تھیں انھیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ اور فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ شاعری اور نثر کے باب میں ملک زادہ منظور احمد کی گراں قدر خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کا ادبی سرمایہ بیش بہا ذخیرہ ہے۔ انھوں نے ابوالکلام آزاد فکر وفن، ابوالکلام آزاد الہلال کے آئینے میں، غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ جیسی کتابوں سے آزاد شناسی میں جہاں اضافہ کیا وہیں شعری مجموعوں کے علاوہ رقص شرر جیسی خودنوشت لکھ کر پوری اردو دنیا کو ادب کے متنوع منظرنامے سے روشناس کرایا۔ دانشور، نقاد اور شاعر کی حیثیت سے ملک زادہ منظور کو عالمی شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی۔ وہ کسی بھی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ مشاعرے کی نظامت میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ان سے اپنے نجی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہایت نفیس اور نستعلیق شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں بڑی وضع داری اور انکساری تھی اور اسی وجہ سے وہ عوام وخواص میں بے حد محبوب اور مقبول تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 22 اپریل 2016

جوگندر پال

نئی دھلی: اردو کے ممتاز فکشن نگار جوگندر پال کی رحلت پر چنئی سے ٹیلیفون پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی وفات سے اردو فکشن کے ایک درخشاں باب کا خاتمہ ہو گیا۔ جوگندر پال اردو فکشن میں ایک

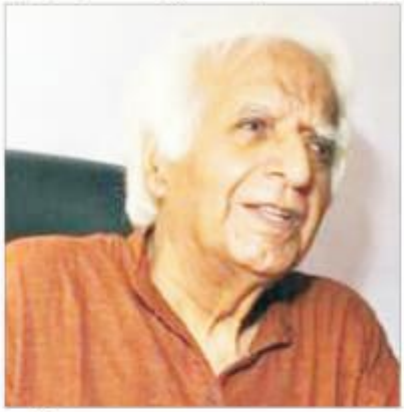

مضبوط ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو فکشن کو ایک نیا اسلوب اور نیا طرز احساس دیا۔ عام انسانوں کے دکھ درد سے ان کا گہرا سروکار تھا۔ مظلوم اور بے کسوں کے مسائل پر انھوں نے کھل کر لکھا، ان کا وژن آفاقی تھا انھوں نے فکشن میں بہت سے تجربے کیے اور ان تجربوں کو قبولیت بھی حاصل ہوئی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے جوگندر پال سے اپنے گہرے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شخصیت میں بڑی مقناطیسی کشش تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انھوں نے زندگی کی آخری سانس تک بچپن کی معصومیت کو اپنے باطن میں زندہ رکھا، جس کا عکس ان کی تخلیقات میں بھی نظر آتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جوگندر پال گو کہ انگریزی ادب کے پروفیسر تھے مگر انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو کے لیے وقف کردی تھی، اردو ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ وہ مکمل طور پر اردو کلچر میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ان کے جیسی مثالی اور مشعل شخصیتیں اردو میں خال خال ہیں۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی تخلیقی شخصیت کا میرے اوپر اتنا گہرا اثر تھا کہ میں نے ان پر 'جوگندر پال ذکر، فکر، فن' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی تھی اور یہ ان کا حق تھا کہ پال یقیناً ایک عظیم فنکار تھے جنھوں نے اردو دنیا کو نادیہ، پار پرے اور خواب رو جیسے ناول دیے اور افسانے اور افسانچوں کے ذریعے اردو کی افسانوی ثروت میں گراں قدر اضافہ کیا۔ فکشن نگاری کے علاوہ انھیں تنقید سے بھی خاص دلچسپی تھی، ان کی کئی تنقیدی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 اپریل 2016

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

نئی دھلی: ممتاز دانشور، نقاد اور ماہر تعلیم پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے

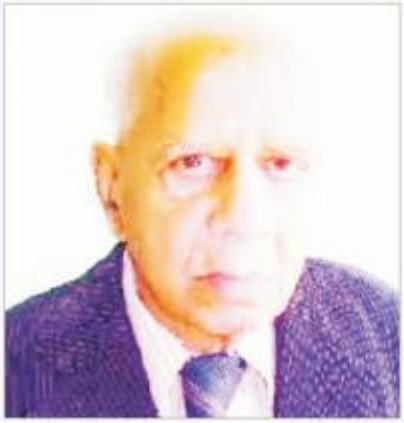

کہا کہ ان کی رحلت سے اردو دنیا ایک عبقری اور نابغہ شخصیت سے محروم ہوگئی۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری گو کہ انگریزی ادبیات کے پروفیسر تھے مگر انھوں نے اپنی زندگی اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے وقف کردی تھی۔ انھوں نے اردو کے بہت سے ادبی سرمائے کو انگریزی کے علمی اور ادبی حلقے میں بھی متعارف کرایا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو اور انگریزی کے باب میں ان کی وسیع تر خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ

غالب اور اقبال پر ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے غالب اور اقبال پر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں مضامین لکھے اور کتابیں بھی تحریر کیں اور افکار غالب اور اقبال کی نئی جہتوں کی جستجو کی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ وہ اردو تنقید میں بھی اعتبار و استناد کا درجہ رکھتے تھے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ کتاب اقبال کی تیرہ نظمیں، غزل تنقید اور اردو کے پندرہ ناول ان کی معروضی تنقید اور مطالعاتی ارتکاز و وسعت کا عمدہ نمونہ ہیں۔ انھوں نے 'نقد و نظر' جیسے معیاری مجلّے کے ذریعے بھی اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ آکسفورڈ کے فیض یافتہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری صرف اردو تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ انگریزی ادب میں بھی ان کی ایک الگ پہچان تھی۔ ولیم بلیک اور شیکسپیئر پر ان کے مضامین اور تحریروں کو انگریزی حلقے میں اعتبار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ علی گڑھ جرنل آف انگلش اسٹڈیز کے مدیر بھی رہے۔ انھوں نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں جو خدمات انجام دی ہیں انھیں دونوں زبانوں کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ساہتیہ اکادمی، بہادر شاہ ظفر اور غالب ایوارڈ یافتہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اردو زبان و ادب کی علمی اور ادبی ثروت میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی سے ان کی طویل وابستگی کے حوالے سے کہا کہ وہ طلبا میں بے حد عزیز، مقبول اور علی گڑھ کی شان تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کے وقار میں اضافہ کیا۔ کسی صلے یا ستائش کی تمنا کیے بغیر وہ اردو اور انگریزی زبان کی خاموشی سے خدمت کرتے رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 مئی 2016

پروفیسر شکیل الرحمٰن

نئی دھلی: پروفیسر شکیل الرحمٰن ایک بین علومی نقاد تھے جنھوں نے اردو کو جمالیات کا وسیع ترین کینوس عطا کیا۔ ادب کی جمالیاتی تعبیر و تفہیم کے باب میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کا مطالعاتی منہج اور تنقیدی مزاج اردو کے معاصر نقادوں سے مختلف تھا۔ انھوں نے اپنے لیے جمالیات کی ایک نئی اور پرخطر راہ تلاش کی تھی اور پوری زندگی اسی راہ پر چلتے رہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن کے انتقال پر اپنے شدید رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے یہ باتیں کہیں۔ انھوں نے پروفیسر شکیل الرحمٰن کی وسیع تر علمی اور

ادبی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جمالیات کے تعلق سے جو تنقیدی کارنامے انجام دیے ہیں وہ بے مثال اور لازوال ہیں۔ انھوں نے پہلی بار ہندوستان کے نظامِ جمال کو ایک وسیع تر تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ ہندوستان کا نظامِ جمال ان کا ایک غیر معمولی شاہکار ہے۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کو اس کی اساطیری حسیت اور روایت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے جمالیات سیریز کے تحت مثنوی، نظم اور غزل کی جمالیات کو اردو قارئین سے روشناس کرایا۔ رومی، قلی قطب شاہ، میر، نظیر، فیض، فراق کی جمالیات پر بھی کتابیں تحریر کیں۔ 'مرزا غالب ہند اور مغل جمالیات' ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ شکیل الرحمٰن فنونِ لطیفہ کے بھی ایک اہم ناقد تھے۔ مصوری، رقص، موسیقی کے جمالیاتی ارتعاشات پر ان کی گہری نظر تھی اور انھوں نے ان موضوعات پر گراں قدر تحریریں بھی ادبی دنیا کو دی ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی رحلت سے ادبی دنیا میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے جسے پر کرنا ناممکن ہے۔ وہ جمالیاتی تنقید کا ایک اہم ستون تھے۔ جمالیاتی تنقید کو انھوں نے نئی سمتیں عطا کی ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ شکیل الرحمٰن کی شخصیت میں بڑی مقناطیسیت تھی۔ انھیں قدرت نے جو ذوقِ جمال عطا کیا تھا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ یہ اردو زبان و ادب کی خوش بختی ہے کہ شکیل الرحمٰن جیسا جمالیاتی نقاد اس زبان کو میسر ہوا۔ وہ اردو کی واحد شخصیت تھے جنھیں نہ صرف تین یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر ہونے کا شرف حاصل ہوا بلکہ حکومت ہند کی وزارت صحت کے کابینہ وزیر بھی رہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ شکیل الرحمٰن یقیناً ایک گوہر یکتا تھے۔ زمانے نے ان کی وہ قدر نہیں کی تھی جس کے وہ مستحق تھے مگر آنے والا وقت ان کی قدر ضرور کرے گا کہ وہ ایک بلند و بالا تنقیدی اور تخلیقی شخصیت کے حامل تھے۔ ایسی شخصیتیں روز جنم نہیں لیتیں بلکہ صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 مئی 2016

گزارش

قلمکار خواتین و حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا مختصر تعارف، بایوڈاٹا (Biodata)، مضمون کے غیر مطبوعہ ہونے کا تصدیق نامہ، پن کوڈ کے ساتھ مکمل پتہ، فون/موبائل نمبر اور پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

'خبرنامہ' اور 'عالمی اردو نامہ' کے تحت ملک کے مختلف اردو اخبارات میں اردو کے تعلق سے شائع ہونے والی خبروں کا ڈائجسٹ ہر ماہ اس لیے پیش کیا جاتا ہے تاکہ پورے ملک میں اردو سرگرمیوں کی مجموعی صورت حال سامنے آسکے۔ خبروں میں دیے گئے تمام حقائق اور تبصروں کے لیے متعلقہ اخبارات ذمے دار ہیں۔ (ادارہ)

کونسل کے تعاون سے

دور جدید میں اردو زبان کی اہمیت وافادیت

تمل ناڈو: چنئی میں تمل ناڈو اردو رابطہ کمیٹی کا دو روزہ سیمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقد ہوا جس کا عنوان 'دور جدید میں اردو زبان کی اہمیت

اور افادیت' تھا۔ رابطہ کمیٹی کے صدر جناب ملک العزیز کاتب نے صدارت کی۔ پدم بھوشن جناب موسیٰ رضا آئی اے ایس (ریٹائرڈ) نے جلسے کا افتتاح کیا۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ دیگر مہمانان اعزازی میں سید محمد ابراہیم، ایم نذر محمد، محمد امان اللہ شاہ اور روزنامہ سیاست حیدرآباد کے نیوز ایڈیٹر جناب عامر علی خاں شریک رہے۔ حیدرآباد کے ڈاکٹر مختار احمد فردین کی کتاب 'پرورش لوح وقلم' کا اجرا بھی پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ حیدرآباد یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر محمد زاہد الحق نے جلسہ کی نظامت فرمائی۔ چنئی کے مشہور تعلیمی ادارہ سدرن انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ کے چیرمین پدم بھوشن موسیٰ رضا آئی اے ایس (ریٹائرڈ) نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ تملناڈو میں اردو کے فروغ کا کام کرنا بہت ہی دشوار گذار اور وقت طلب کام ہے۔ ایسے میں اردو کے لیے کوئی بھی کوشش قابل ستائش ہے۔ مسلم ایجوکیشن ایسوسی ایشن آف ساوتھ ورن انڈیا کے نائب سکریٹری جناب محمد امان اللہ شاہ نے کہا کہ ان کے ادارہ کی جانب سے اردو کے لیے ہر قسم کی تائید جاری رہے گی۔

شہر کے مشہور سماجی کارکن سید محمد ابراہیم، سکریٹری تمل ناڈو ڈیولپمنٹ ٹرسٹ نے کہا کہ ہمارے بزرگ فارسی اور اردو میں لکھتے پڑھتے تھے مگر موجودہ نسل ان دونوں زبانوں سے کنارہ کش ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہر گلی کوچہ میں اس سلسلے میں بیداری پیدا کریں۔

حیدرآباد کے مشہور روزنامہ 'سیاست' کے نیوز ایڈیٹر عامر علی خاں نے کہا کہ اردو کو عملی طور پر برتنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنے اخبار اور ادبیات اردو کے ذریعے ہزاروں لوگوں کو اردو لکھنا پڑھنا سکھا چکے ہیں اور ان کا یہ مشن جاری وساری رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ وہ ایک بین الاقوامی سیمینار کے لیے تمل ناڈو اردو رابطہ کمیٹی کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ اردو والے صرف بولنے کی حد تک اردو زبان بولتے ہیں مگر لکھنے پڑھنے کے معاملے میں کافی کمزور ہیں۔ آج اردو کی زبوں حالی کے لیے اردو والے ہی ذمہ دار ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اردو رسم الخط کو عام کریں اور اردو زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ دوسرے دن کے سمینار میں 'دور جدید میں اردو زبان کی اہمیت وافادیت' کے عنوان پر پرمغز مقالے پڑھے گئے۔ مقالے پڑھنے والوں میں ڈاکٹر زاہد الحق، حیدرآباد، جناب سراج زیبائی شیموگہ، ڈاکٹر مختار احمد فردین حیدرآباد، ڈاکٹر امان اللہ ایم۔ بی، مدراس یونی ورسٹی اور ڈاکٹر ایم سعید الدین اسلامیہ کالج وانمباڑی وغیرہ شامل ہیں۔

اس نشست کی صدارت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر جناب پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی اور کونسل کی مرکزی گورننگ کونسل کی رکن محترمہ منوری بیگم صاحبہ نے بھی شرکت کی اور اردو کے کام کے لیے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 4 مئی 2016

'مرزا ہادی رسوا: حیات اور خدمات'

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے آرزو ٹریننگ سنٹر گوونڈنگر کے زیر اہتمام ایک روزہ قومی سمینار 'مرزا ہادی رسوا حیات اور خدمات' کا انعقاد ایم ایچ ڈگری کالج میں کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت سابق میئر ڈاکٹر ایس ٹی حسن نے کی۔ انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ مرزا ہادی رسوا ایک ایسے ناول نگار تھے جن کی خدمات کو کسی بھی حال میں فراموش نہیں کیا جاسکتا، ان کے ناول اردو ادب کا بیش قیمت نگینہ ہیں۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ مرزا ہادی رسوا ایک اچھے ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سائنس داں بھی تھے۔ انھوں نے اردو کے کی بورڈ کی ایجاد کی۔ انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کاموں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس سے نہ صرف اردو کی ترقی ہوئی ہے بلکہ طلبا و طالبات میں اردو کے تئیں رجحان بڑھا ہے۔ ثروت عثمانی ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو رامپور نے مرزا ہادی رسوا کی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی خدمات اور ان کی تصانیف اردو ادب کا بیش قیمتی خزانہ ہیں۔ ڈاکٹر ہرنوش دکشت نے کہا کہ اردو ادب کی بہترین خدمات کے لیے مرزا ہادی رسوا کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ارباب انجم، ڈاکٹر معراج الحسن سہوانی، ڈاکٹر شاکر اصلاحی، کشش وارثی، قمر قدیر ارم، سید محمد ہاشم، شرفی انجم، ڈاکٹر محمد آصف حسن، سین شین عالم، عظیم قریشی، فراست چودھری نے پرمغز مقالے پیش کیے۔ آرزو ٹریننگ سنٹر کے صدر رمیندر کمار گپتا و سکریٹری ریکھا گپتا نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔ مہمانان کو سند توصیفی و یادگاری نشان اور اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 اپریل 2016

'عرب ہند تعلقات: ماضی اور حال'

وارانسی: پروفیسر وزیر حسن، صدر شعبۂ عربی کی قیادت میں پروفیسر بدرالحسن عابدی میموریل لکچر کا انعقاد کیا گیا جو شعبۂ عربی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے منعقد ہوا۔ 'عرب و ہند تعلقات: ماضی اور حال' کے عنوان کے تحت یہ خطبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے سابق پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی (یو جی سی ایمریٹس فیلو) نے پیش کیا۔ اپنے ایک گھنٹے کے کلیدی خطبے میں پروفیسر ندوی نے قرآن شریف، احادیث، وید، پران وغیرہ کے حوالوں اور عربی کی دیگر کتب کے حوالوں کے ساتھ ہندوستان اور عرب کے قدیمی رشتوں اور ان کے

باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے دونوں ملکوں کے آپسی رشتوں کو ضروری بتایا اور اس سلسلے میں وزیر اعظم، مودی جی کے ذریعے کی گئی کوششوں کی تعریف کی۔ لکچر کے اختتام کے بعد مہمان خصوصی پروفیسر رجنی رنجن جھا، سابق ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز، بنارس ہندو یونیورسٹی نے پروفیسر ندوی کے لکچر کی تعریف کرتے ہوئے ان کے خطبے کو ہندو عرب کے آپسی تعلقات کے ضمن میں اہم تسلیم کیا اور پروفیسر ندوی کی تعریف کی۔ پروفیسر یوسی دوبے نے بھی پروفیسر ندوی کے لکچر کی تعریف کرتے ہوئے اسے دونوں ملکوں کے بہتر تعلقات کے لیے ضروری بتایا۔ پروگرام کے آغاز میں شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر وزیر حسن نے شعبہ کے ساتھ پروفیسر سید بدرالحسن عابدی کا تعارف کراتے ہوئے شعبے کی کارکردگی پر روشنی ڈالی اور موضوع کا تعارف پیش کیا۔ پروگرام کے اخیر میں پروفیسر اشفاق احمد نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 19 اپریل 2016

عصر حاضر میں راجندر سنگھ بیدی کی معنویت

وارانسی: شعبۂ اردو، وسنت کالج، برائے خواتین راج گھاٹ، وارانسی کے زیر اہتمام دوروزہ قومی سمینار بہ عنوان 'عصر حاضر میں راجندر سنگھ بیدی کی معنویت' کالج اسمبلی ہال میں 16,17 مارچ 2016 کو منعقد ہوا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے منعقد ہونے والے اس سمینار میں محترم شخصیات نے اپنی پرمغز تقریروں اور اپنے بیش بہا مقالوں کے توسط سے راجندر سنگھ بیدی کی شخصیت اور ان کی ادبی و تخلیقی خدمات کی مختلف جہات پر روشنی ڈالی۔ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر شاہد حسین، سابق چیئرمین ہندوستانی زبانوں کا مرکز، بے این یو نے فرمائی، جبکہ پروفیسر قاضی جمال حسین، سابق پروفیسر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بطور مہمان خصوصی اور جناب الحاج اشتیاق احمد، جنرل سکریٹری، سرسید سوسائٹی، بنارس بطور مہمان اعزازی شرکت کی۔ پروفیسر قاضی افضال حسین، سابق صدر شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے عصر حاضر میں راجندر سنگھ بیدی کی معنویت اور ان کی تخلیقی عظمت پر گفتگو کی۔ انھوں نے 'اپنے دکھ مجھے دے دو'، 'لاجونتی' اور 'یوکلپٹس' جیسے لازوال افسانوں کے حوالے سے راجندر سنگھ بیدی کے اسلوب کی انفرادیت اور ان کی فکری وفنی ترجیحات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ صدارتی کلمات کے دوران پروفیسر شاہد حسین نے راجندر سنگھ بیدی کی ڈراما نگاری کے حوالے سے بامعنی گفتگو کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے اردو زبان وادب اور اردو ذرائع ابلاغ کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی وکالت کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر محمد اختر نے کی جبکہ ڈاکٹر نفیس بانو نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر نفیس بانو، صدر شعبۂ اردو وسنت کالج، بنارس، پروفیسر قاضی جمال حسین نے مقالے پڑھے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین اور پروفیسر نسیم احمد نے کی۔ صدارت پروفیسر شاہینہ رضوی سابق صدر شعبۂ اردو کاشی ودیاپیٹھ اور پروفیسر رفعت جمال ویمنس کالج، بی ایچ یو نے کی جبکہ نظامت کے فرائض شاہنواز فیاض نے ادا کیے۔ اس سیشن میں کل پانچ مقالات پیش کیے گئے۔ پروفیسر رفعت جمال نے اپنے صدارتی خطبے کے دوران متن کی قرأت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ نئی نسل سہل پسندی

کا شکار ہے۔ انھیں متن کو بنیادی اساس بنانا چاہیے تاکہ فکر وشعور کی نئی جہتیں اور تحقیق وتنقید کے نئے دریچے وا ہوسکیں۔ اجلاس کے آخر میں ڈاکٹر محبوب حسن نے مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار کے دوسرے دن اس اجلاس کی صدارت پروفیسر علی احمد فاطمی، صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے کی، جبکہ نظامت ڈاکٹر سلمان فیصل نے کی۔ اس اجلاس میں کل سات مقالے پڑھے گئے۔ اجلاس کا پہلا مقالہ ڈاکٹر منجری شکلا نے بہ عنوان Escaping the stereotype: Rejender Sing Bedi' پیش کیا۔ پروگرام کے اختتام پر صدر جلسہ نے اس اجلاس میں پڑھے گئے مقالات پر اپنے تنقیدی وتحقیقی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کی، نیز راجندر سنگھ بیدی کی فکری انفرادیت اور ان کے افسانوں میں پائے جانے والے ترقی پسند عناصر پر نہایت مفصل اور عالمانہ تقریر کی۔ آخر میں ڈاکٹر محمد اختر نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی جمال حسین نے کی، جبکہ نظامت ڈاکٹر مشرف علی، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی نے کی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے 'بیدی کے افسانوں میں عورت' اور دوسرا مقالہ پروفیسر شاہد حسین نے 'راجندر سنگھ بیدی کی ڈراما نگاری' کے عنوان سے پڑھا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی، جبکہ پروفیسر علی احمد فاطمی، صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، بطور مہمان خصوصی اور پروفیسر یعقوب یاور، صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ سمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد اختر نے اس آخری اجلاس کی نظامت کی۔ حسب روایت شعبۂ موسیقی کی طالبات نے کل گیت پیش کیا اور کالج کی پرنسپل ڈاکٹر اکا سنگھ نے اس سمینار میں شرکت کرنے والے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر محبوب حسن نے اس دوروزہ سمینار کی روداد پیش کی۔

ڈاک سے: ڈاکٹر محمد اختر، شعبۂ اردو، وسنت کالج برائے خواتین، بنارس، 6 اپریل 2016

اردو کی موجودہ صورت حال اور روزگار کے مواقع

تلسی پور: پروانچل اتھان سمیتی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو کی موجودہ صورت حال اور روزگار کے مواقع' تلسی پور میں منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر محمد اکمل نے اور نظامت ڈاکٹر افروز طالب نے کی۔ پروانچل اتھان سمیتی کے صدر اور پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر عبداللہ خان رؤف نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور سمیتی کے اغراض ومقاصد بیان کیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی موجودہ صورت حال پر حکومتیں سنجیدگی سے غور وفکر کریں اور اس کی ترقی کی راہ ہموار کریں اور ساتھ ہی ساتھ روزگار کے مواقع پیدا کریں اور سرکاری دفاتر میں اردو کی جو اسامیاں خالی ہیں اس کو جلد از جلد پر کیا جائے۔ سمینار میں مقررین نے اردو کی موجودہ صورت حال اور روزگار کے مواقع پر تفصیلی روشنی ڈالی اس موقعے پر ڈاکٹر جاوید اختر، ڈاکٹر عبدالحفیظ، ڈاکٹر شرف الدین، ڈاکٹر منظر علی، ڈاکٹر طارق کبیر، ڈاکٹر تبسم فرخی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں سمیتی کے سکریٹری نے کونسل اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 23 اپریل 2016

اردو مادری زبان اور ہماری ذمے داریاں

نئی دھلی: معروف نجی تنظیم رام منوہر ایجوکیشنل اینڈ سموداۓ بال وکاس سوسائٹی کے زیراہتمام قومی کونسل براۓ فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) و غالب انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے ایوان غالب میں 'اردو مادری زبان اور ہماری ذمہ داریاں' کے موضوع پر یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر سوسائٹی کے ذمے داران نے سوسائٹی کی سرگرمیوں اور اردو زبان کے تئیں خدمات کا ذکر کرتے ہوۓ کہا کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے اور اردو زبان کے فروغ کے لیے سنجیدہ کوششیں کی جانی چاہئیں۔ سمینار میں حافظ جاوید، خالد مصطفیٰ علوی، پروفیسر اختر الواسع، وقار مانوی، سنیل کمار سمیت کئی اہم شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 اپریل 2016

گجرات میں اردو ادب کی صورت حال

ودیاپیٹھ: 'گجرات میں اردو کی صورتِ حال' کے موضوع پر ایک اہم قومی سمینار گجرات ودیاپیٹھ احمد آباد

واقع آدی واشی شودھ و پرشکشن سنستھان (سمینار ہال) میں بتاریخ 3 اپریل بروز اتوار منعقد ہوا۔ اس سمینار کا انعقاد قومی کونسل براۓ فروغ اردو زبان (بھارت سرکار) نئی دہلی، اور شائن انڈیا سوشل اینڈ کلچرل اکادمی، احمد آباد کے باہمی اشتراک سے عمل میں آیا۔ پروگرام کی ابتدا میں جناب مشتاق شیخ (سکریٹری: شائن انڈیا سوشل اینڈ کلچرل اکادمی) نے دانشورانِ ادب کا تعارف پیش کرتے ہوۓ انھیں گلدستے پیش کیے۔

سمینار کی پہلی نشست کا آغاز زیرِ صدارت جناب ابہام رشید ہوا۔ پروفیسر انور ظہیر انصاری (ایم ایس یونیورسٹی، بڑودہ) نے اپنے کلیدی خطبے سے سمینار کی ابتدا کی۔ انھوں نے گجرات کے شعرا اور ادبا کی خدمات کو سراہتے ہوۓ گجرات کی ادبی صورت حال پر قدرے اطمینان کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نثار احمد انصاری نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت سے متعلق گجرات ودیاپیٹھ نیز دیگر ادبی اداروں کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی، اس کے علاوہ معزز مہمان جناب عرفان اللہ خاں نے اپنا تحقیقی مقالہ 'گجرات میں اردو ادب کے قلم کار' پیش کیا۔ جناب شفاعت قادری، جناب محمد رفیق شیخ (صدر شعبۂ اردو فارسی گجرات یونیورسٹی، احمد آباد)، مشتاق انصاری، جناب امان اللہ جبرانی اور جناب ندیم انصاری نے پرمغز مقالے پیش کیے۔ جناب زین العابدین انصاری نے گجرات میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور تعلیمی امور پر گفتگو کی۔ مقالات پر صدر جناب ابہام رشید نے اپنے تاثرات پیش کیے۔

دوسری نشست کی صدارت پروفیسر انور ظہیر انصاری نے کی۔ اس اجلاس میں محترمہ فہمیدہ شیخ، ڈاکٹر اظہر ڈھیری والا (ایم ایس یونیورسٹی، بڑودہ)، ڈاکٹر نسرین شیخ، اور ابہام رشید نے مقالے پڑھے۔ اس موقعے پر پروفیسر محی الدین بومبے والا نے گجرات کے اردو ادب سے متعلق اپنے خیالات پیش کیے۔ پروفیسر انور ظہیر انصاری نے تمام مقالات پر اپنے تاثرات پیش کیے۔ آخر میں شبیر ہاشمی (کوآرڈی نیٹر) نے سمینار میں حصہ لینے والے دانشورانِ ادب اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور قومی کونسل براۓ فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوۓ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی حد درجہ ستائش کی۔ پروگرام کی نظامت جناب حکیم مزمل حسین شبنم انصاری نے کی۔

ڈاک سے: مشتاق شیخ، شائن انڈیا سوشل اینڈ کلچرل اکادمی، احمد آباد، 20 اپریل 2016

پروفیسر محمد حسن کی ادبی خدمات

امروھه: قومی کونسل براۓ فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے آزاد ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی امروہہ کے زیراہتمام یک روزہ قومی سمینار بعنوان پروفیسر محمد حسن کی ادبی خدمات ہاشمی گرلس ڈگری کالج امروہہ میں منعقد ہوا۔ سمینار کی صدارت ڈاکٹر شہزاد احمد (صدر شعبۂ اردو آزاد گرلس ڈگری کالج، سنبھل) نے کی اور نظامت کے فرائض امروہہ کے نوجوان شاعر سید شعبان قادری نے بخوبی انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے چیئرمین امروہہ ڈاکٹر افسر پرویز نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے نائب صدر انجمن ترقی اترپردیش حکیم سراج الدین ہاشمی، سید محمد ہاشم اور فرقان سنبھلی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ سمینار میں مقالہ پیش کرتے ہوۓ ترنم پروین، ڈاکٹر اختر شیخ الاسلام، ڈاکٹر محمد عباس۔ مولانا محمد حنیف، سید محمد ہاشم نے پروفیسر محمد حسن کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 15 اپریل 2016

'امیر خسرو کا ذہنی سفران کی کتابوں کی روشنی میں'

نئی دھلی: نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کے زیراہتمام بہ تعاون غالب اکادمی اور قومی کونسل براۓ فروغ اردو زبان دو

روزہ امیر خسرو سمینار بعنوان 'امیر خسرو کا ذہنی سفران کی کتابوں کی روشنی میں' کا انعقاد کیا گیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوۓ شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ حضرت امیر خسرو دہلوی معروف بہ ملٹی کے علمی، اجتماعی، ثقافتی، سیاسی و تصوف سے متعلقہ کارناموں کا ذکر ان کے اپنے دورۂ حیات سے لے کر آج تک مختلف ذرائع و ابلاغ سے دنیا بھر میں اشاعت پذیر و مقبول رہا ہے۔ پروگرام کا افتتاح کرتے ہوۓ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ خسرو کے کلام کو شائع کرنا بہت بڑا کام تھا وہ لوگ قابل تعریف ہیں جنھوں نے یہ کام انجام دیا۔

خسرو کے تمام پہلوؤں پر کام بڑے پیمانے پر ہو رہے ہیں، لیکن اگر کہیں کمی ہے تو وہ اکیڈمک پہلو ہے جس پر بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جنرل سکریٹری پروفیسر شریف حسین قاسمی نے امیر خسرو کے کلام پیش کر کے باضابطہ سمینار کا افتتاح کیا۔ جنرل سکریٹری شاہد ماہلی نے سوسائٹی کا تعارف پیش کرتے ہوۓ کہا کہ 1974 میں یہ سوسائٹی قائم کی گئی تھی۔ ایران وغیرہ کے تعاون سے بڑا جشن منعقد کیا جا چکا ہے۔ بطور مہمان خصوصی ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی دہگاہی نے شرکت کی۔ جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر ادریس احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ پروگرام کے اختتام پر بزم موسیقی میں استاد اقبال احمد خاں نے امیر خسرو کے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اپریل 2016

14واں صوفی پروگرام

نئی دھلی: اردو زبان اور تہذیب کے فروغ میں محفل سماع کی اہمیت پر منحصر ایک تاریخ ساز شام صوفی دربار کا انعقاد دہلی کے لودھی روڈ پر واقع آئی آئی سی سی میں کیا گیا جس میں عالمی شہرت کی حامل شخصیات نے حصہ لیا اور ملکہ ترنم محترمہ انیتا سنگھوی کی روحانی آواز میں کلام خسرو و رومی کو محسوس کیا۔ قومی کونسل براۓ فروغ اردو زبان کے اشتراک

سے حسن آرائرسٹ کی جانب سے منعقد اس 14 ویں صوفی دربار نامی پروگرام کا افتتاح سابق وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے ذریعے شمع روشن کرنے سے ہوا جس کے بعد منتظمین کی جانب سے کابینی وزیر برائے اطلاعات روی شنکر پرساد کا خیر مقدم کمال حیدر نقوی نے کیا۔ پروگرام کے افتتاح میں شعرا کرام نے کلام پیش کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو عباس رضا نیر جلال پوری نے کہا کہ عصر حاضر میں صوفیائے کرام کی تعلیمات کی ضرورت بہت محسوس ہورہی ہے، صوفی خانقاہی ایسا مرکز ہے جہاں ادب اور تہذیب کے ساتھ متعدد مذاہب کے لوگ ایک ساتھ پیار اور محبت کے پیغام کو عام کرنے کی پہل کرتے ہیں۔ پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے کہا کہ مختلف زبانوں سے وابستہ بین المذاہب شخصیات کی ایک ساتھ یہاں موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ آج کا سماج محبت کے پیغام کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

انڈین میڈیکل کاؤنسل کے چیئرمین ڈاکٹر ایس ایس اگروال، ممتاز ماہر قانون رام جیٹھ ملانی، ڈاکٹر ابھیشیک منوسنگھوی، ٹھاکر امر سنگھ و دیگر مہمانان نے اس طرح کی تقریبات کو عہد حاضر کی ضرورت بتایا۔ سلیم امروہی نے خصوصی نظم پیش کی۔

خواجہ معین الدین چشتی کے عرس کی مناسبت سے منعقد اس جشن میں صوفیانہ موسیقی کے دور میں محترمہ انیتا سنگھوی نے 16 کلام پیش کیے، بعد میں میڈیا اور عاشقان اردو کی درخواست پر انھوں نے کلام اقبال اور غالب بھی پیش کیا۔ وزیر کابینہ روی شنکر پرساد و سابق وزیر پی چدمبرم نے انیتا سنگھوی کے ذریعے پیش کیے گئے کلام کی پذیرائی کی۔ علامہ رومی کی شاعری سے متاثر صوفی شاعرہ بیگم رائے صاحبہ مہارانی جویری حیدرآباد نے اپنی کتاب 'نائن ٹین گولڈی ورسیز' ڈاکٹر منموہن سنگھ کو پیش کی۔ حسن آرائرسٹ کی جانب سے رائے صاحبہ کو رومی ایوارڈ، محترمہ کا منا پرساد کو محافظ اردو ایوارڈ، انیتا سنگھوی کو امیر خسرو ایوارڈ اور نوجوان سماجی کارکن علی مہدی زیدی کو خواجہ غریب نواز ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 اپریل 2016

ادبِ اطفال: ایک جائزہ

جلگاؤں: مورخہ 24 اپریل 2016 یاول ضلع جلگاؤں

میں بمقام مولانا آزاد ہال یاول اردو سوشل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر اکیڈمی یاول کے زیر اہتمام نیز قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے مالی تعاون سے 'ادب اطفال: ایک جائزہ' کے عنوان سے ریاستی سطح کا ایک سمینار منعقد ہوا۔ جس کی صدارت معروف شاعر و افسانہ نگار جناب احمد کلیم صاحب فیض پوری نے انجام دی۔ جبکہ سمینار کا افتتاح الحاج عبدالروف شیخ صاحب (سابق پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین اردو جونیئر کالج یاول) نے شمع روشن کر کے کیا۔ اکادمی کے صدر جناب رحیم رضا نے اکادمی کے کارکردگی پیش کی۔ سیمینار کے پہلے سیشن میں ایم رفیق، علی انجم رضوی، فاروق سید، حیدر بیابانی اور خیال انصاری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے دوسرے سیشن میں قطب الدین شاہد اور ڈاکٹر بانو سرتاج نے مقالے پڑھے۔ خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے جناب احمد کلیم فیض پوری نے تمام مقالات کا جائزہ پیش کیا اور ادب اطفال کی صورتِ حال پر اپنی گراں قدر آرا کا اظہار کیا۔ جناب بلال نائب صدر ادارہ ھذا نے رسم شکریہ ادا کی جبکہ نظامت کے فرائض جناب ایس ایم انور نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

پریس ریلیز: رحیم رضا، جلگاؤں، مہاراشٹر، 1 مئی 2016

غزل کی بدلتی ہیئت اور معنویت

ہبلی: انجمن اسلام نہرو کالج، ہبلی کے زیر اہتمام ایک روزہ قومی کانفرنس بہ عنوان 'غزل کی بدلتی ہیئت اور معنویت' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کی جانب سے منعقد کی گئی۔ پرنسپل میجر ڈاکٹر ایم ایف انصاری نے مختلف ریاستوں سے تشریف لائے مندوبین اور مہمانوں کا استقبال کیا۔ آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر ایس نسیم بانو نے کانفرنس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ کہا کہ غزل عشق و عاشقی سے ہمیشہ منسوب کی جاتی رہی۔ اس کے علاوہ اس میں سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کانفرنس کا مقصد نئی نسل کو غزل کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانا ہے۔ بحیثیت مہمانِ خصوصی ڈاکٹر ہری لال پوار، ڈائرکٹر پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ، کرناٹک یونی ورسٹی دھارواڑ اور ادبی دنیا کی مشہور شخصیت پروفیسر سجاد حسین، مدراس یونی ورسٹی، چنئی کی آمد باعث افتخار رہی۔

ڈاکٹر ہری لال پوار نے اپنے خطاب میں کنڈ زبان میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں غزل کی تاریخ بیان کی اور اردو کے بہترین اشعار پڑھے۔ پروفیسر سجاد حسین نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ غزل اردو شاعری کی واحد صنف لطیف ہے جس کی ہیئت اور موضوع کو لے کر ارباب ادب نے اس پر شدید اعتراضات کیے۔ لیکن ان مخالفتوں کے باوجود غزل کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اس میں خیال کی وسعتیں اور اظہار کی نئی صورتیں پیدا ہونے لگیں۔ آج بھی ہر فرد اس کا شیدائی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر ایس نسیم بانو کی کتاب 'اردو مکتوب نگاری ایک جائزہ' کا اجرا ڈاکٹر ہری لال پار اور ڈاکٹر سجاد حسین کے دست مبارک سے ہوا۔ اس کے بعد مقالے کے سیشن میں کئی پر مغز مقالے پڑھے گئے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ایس نسیم بانو، نہرو کالج، ہبلی، 2 مئی 2016

پروفیسر نجیب اشرف ندوی میموریل لیکچر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے علامہ اقبال کے یوم وفات

پر 21 اپریل 2016 کو پروفیسر نجیب اشرف ندوی میموریل لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اس لیکچر کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی کی سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر اشرف رفیع کو دعوت سخن دی گئی۔ خطبہ کا عنوان 'اقبال کا تاریخی اور تہذیبی شعور' تھا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے کہا کہ پروفیسر ندوی کا شمار اردو، فارسی، عربی، اور تاریخ کے ممتاز محققین میں ہوتا ہے۔ وہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بانی ڈائرکٹر تھے۔ ان کو علامہ اقبال سے لگاؤ تھا۔ ان کا مقالہ حیات اقبال رسالہ عالمگیر میں شائع ہوا۔ علامہ اقبال ممبئی چھ بار آئے تھے۔ ان کا قیام خلافت ہاؤس میں رہتا تھا۔ اپنے خطبہ میں پروفیسر دلوی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا شکریہ ادا کیا جس کے مالی تعاون سے یہ پروگرام منعقد ہوا۔ پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ نے علامہ اقبال کے تاریخی اور تہذیبی شعور پر پر مغز مقالہ پڑھا۔ اس پروگرام کی صدارت انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے کی۔ انجمن اسلام کے کلچرل بورڈ کے فعال چیئرمین فواد پانکا نے مہمان خصوصی اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا جبکہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر سعیدہ پٹیل نے پروگرام کی نظامت کی۔

پریس ریلیز: انجم مانپوری، 29 اپریل 2016

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی

27 ویں بین الاقوامی ادبی کانفرنس

لکھنؤ: ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کی 27 ویں بین الاقوامی ادبی کانفرنس کے دوسرے دن اے پی جے عبدالکلام کے فن اور شخصیت پر ایک روزہ سمینار کا انعقاد کیا جس میں

ملک و بیرون ملک سے آئے ہوئے ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ یک روزہ سمینار کی صدارت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے کی اور نظامت ڈاکٹر عباس رضانیر نے فرمائی۔ سمینار میں قطر سے احمد صبیح بخاری، دبئی کے زبیر فاروق، مسقط کے حبیب الٰہی کے علاوہ وائس چانسلر خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی پروفیسر خان مسعود خان، ڈاکٹر شارب ردولوی، سہیل کاکوروی، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر شافع قدوائی، ڈاکٹر سیما صغیر، سرویش استھانا، ڈاکٹر گنگا پرشاد ول، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی، ضیاء اللہ صدیقی ندوی، ڈاکٹر شاہدہ صدیقی، ڈاکٹر مسیح الدین اور رفیع احمد وغیرہ نے اظہار خیال کیا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر ارتضی کریم نے کہا کہ محبان اردو نے یہ ثابت کردیا کہ اردو کا دامن نہایت وسیع ہے اور اے پی جے عبدالکلام پر منعقدہ یہ سمینار اس بات کا ضامن بھی ہے کہ اس سمینار کے لیے صرف شخصیت کا انتخاب کیا گیا اردو والے کا نہیں، کلام صاحب کی گرچہ مادری زبان اردو نہیں تھی مگر ان کو اردو سے بہت محبت تھی اور اے پی جے عبدالکلام کی عظمت غربت کی کوکھ سے نکل کر آئی تھی، خراب حالات میں اچھی کارکردگی ان کی زندگی کی مثال ہے۔ ڈاکٹر عبدالکلام نے ادب کی انجینئرنگ سے انسان بنانے کا کام کیا ہے۔ اس لیے آپ سائنس داں ہی نہیں انساں داں بھی تھے۔ اطہر نبی کو میں پروگرام کے شاندار انعقاد کے لیے تہہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں اور ان کے لیے دعا گو بھی ہوں۔ قطر کے صبیح بخاری نے کہا کہ اردو کے پروگراموں میں زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کو مدعو کیا جائے جو اردو کے شوقین تو ہیں پر ان کو اردو زبان نہیں آتی ہے، مگر ان کے جذبات اردو کے تئیں نیک ہیں، ایسا کرکے ہم صحیح معنوں میں اردو کی خدمت کریں گے۔ مسقط سے آئے حبیب الٰہی نے ہندوستان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ سلطان قابوس نے بھی ہندوستان میں ہی تعلیم حاصل کی تھی اور ان کے استاد سابق صدر جمہوریہ شنکر دیال شرما تھے۔ دبئی کے ڈاکٹر زبیر فاروق نے کہا کہ حالانکہ میری مادری زبان اردو نہیں ہے پر میں اردو میں بہت کام کررہا ہوں۔ مجھے انڈیا آکر معلوم ہوا کہ یہاں پر بہت سے اردو والے اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم سے کافی دور رکھے ہوئے ہیں جو کہ اچھی بات نہیں ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ عبدالکلام ہندوستانیوں کو ہر موقعے پر کچھ نہ کچھ دینا چاہتے تھے۔ وہ انسانیت کے ہی سائنس داں اور انسانیت کے ہی شاعر تھے، ان کی زندگی ہم تمام ہندوستانیوں کے لیے ہر معاملے میں مشعل راہ ثابت ہوسکتی ہے، کیونکہ ایک میزائل مین ہوتے ہوئے بھی وہ انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور ماں جیسی نظم لکھ کر انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ ان کے دل میں صرف اور صرف انسانیت اور انسانی جذبات ہی متحرک ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر خان مسعود وائس چانسلر اردو عربی فارسی یونیورسٹی نے کہا کہ اردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ اردو میں اہم کتابوں کا ترجمہ بھی ہونا چاہیے تاکہ ایسی چیزیں جو دوسری زبانوں میں ہوں وہ عوام تک خصوصاً اردو داں لوگوں تک آسکیں۔ اس موقعے پر پروفیسر صغیر افراہیم و ڈاکٹر سیما صغیر نے نیک خواہشات پیش کیں۔ مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر شاہدہ صدیقی اور ضیاء اللہ صدیقی نے اپنے مقالوں میں کہا کہ سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر عبدالکلام ایک شخص نہیں شخصیات کا مجموعہ تھے، ایک سائنس داں ہوتے ہوئے بھی ان کی فطرت معصومانہ تھی، فکر فلسفیانہ مزاج صوفیانہ تھا اور انداز شاعرانہ، سوچ دانشورانہ اور اصول درویشانہ، باتیں مفکرانہ تھیں اور زندگی راہبانہ تھی۔ ان پر ہندوستان جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ عبدالکلام کہتے تھے کہ خواب وہ ہیں جو آپ کو سونے نہ دیں۔ ناظم سمینار ڈاکٹر عباس رضانیر نے کہا کہ عبدالکلام اعلیٰ قدروں کے پنڈت اور سائنسی دنیا کے سنت تھے اور انھوں نے اپنی زندگی کو دنیا کے سامنے آئیڈیل بنا کر پیش کردیا۔ سمینار کے آخر میں ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے جنرل سکریٹری اطہر نبی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 اپریل 2016

عہد حاضر میں شاعری کی معنویت کا مسئلہ اور غالب

نئی دھلی: ہماری زبان کی اپنی مخصوص شناخت ہے۔ اس کے مطابق ادائیگی کو یقینی بنانا چاہیے۔ یہاں آکر مجھے خوشی ہوئی کہ مقالات اچھے پڑھے گئے۔ مجھے خوشی ہے کہ متن پر غور کرنے والے افراد موجود ہیں۔ نئی نسل کے لوگ شاعر کے دماغ میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ اس سے ان کی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بھی سوچنے کا ایک طریقہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف ناقد و ناول نگار اور محقق پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقد 2 روزہ سمینار بعنوان 'عہد حاضر میں شاعری کی معنویت کا مسئلہ اور غالب' کے موقعے پر دوسرے دن کے دوسرے سیشن کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے پرنٹنگ پریس کی ایجاد اور اس کے ارتقا پر بھی پرمغز باتیں کیں۔ انھوں نے کہا کہ اکبر کے زمانے میں پریس ہندوستان آیا تھا مگر انھوں نے اس پر توجہ نہیں دی شاید ان کے پیش نظر فن خطاطی کی اہمیت تھی۔ وہ خطاطی کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ اجلاس کے دوسرے صدر سید شاہد مہدی نے سیشن میں پڑھے گئے مقالات کو سراہا اور کہا کہ اس سمینار میں عبدالرحمٰن بجنوری پر بھی کوئی مقالہ ہونا چاہیے

چونکہ غالبیات کے حوالے سے تمام تر اختلافات کے باوجود انھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور ایسے وقت میں جب نسخہ حمیدیہ پر گفتگو ہورہی ہے۔ ہم بجنوری کو کیوں کر فراموش کرسکتے ہیں۔ اس اجلاس میں سید ثاقب فریدی نے نسخہ حمیدیہ میں غالب کے مقطعے، ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے غالب کی غزل میں غبار کا استعارہ، پروفیسر مہر افشاں فاروقی نے غالب کا دیوان مطبوعہ کتابوں کا رواج، پروفیسر انیس اشفاق نے اردو شاعری غالب کے بغیر کے عناوین پر اور پروفیسر مولا بخش نے اپنے مقالات پیش کیے۔

دوسرے دن کے سمینار میں 3 سیشن ہوئے جس کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی جبکہ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی۔ اس موقعے پر یونیورسٹیز کے طلبا نے پرمغز مقالے پیش کیے۔ پہلے اجلاس کی نظامت سید عین علی حق نے کی۔ آخری اجلاس کی نظامت محمد مخضر رضا نے کی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ غالب غیر معمولی ذہن اور ذہنیت کا انسان تھا اور غیر معمولی باتیں غیر معمولی ذہنوں سے ہی نکلتی ہیں۔ غالب نے اپنے عہد کی تبدیلیوں کو محسوس کیا اور آئندہ دنیا کو بھی اپنی نگاہوں سے دیکھ لیا تھا۔ سمینار کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 اپریل 2016

فارسی اور اردو لسانی اور ادبی روایات

نئی دھلی: شعبۂ فارسی ذاکر حسین دہلی کالج کے

زیر اہتمام دوروزہ قومی سمینار 'فارسی اور اردو: لسانی اور ادبی روایات' کا انعقاد سلمان غنی ہاشمی آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز مارننگ کے پرنسپل آر پربھا کر راؤ کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ اردو اور فارسی کے لسانی رشتوں پر گفتگو کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ منتخب موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی جائے۔ مہمان خصوصی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کاش ہم اردو والے خواجہ احمد فاروقی کے کاموں کو آگے بڑھاتے کیونکہ انھوں نے اردو نصاب میں فارسی کو لازمی قرار دینے کی بات کی تھی لیکن اردو والوں نے مخالفت کی۔ یہ موضوع اہم اور بروقت ہے۔ ہمیں غور وفکر کرنا ہوگا کہ کس طریقے سے اردو نصاب میں فارسی اور عربی شامل کیا جائے۔ عربی فارسی کے بغیر نئی نسل تک بہتر اردو نہیں پہنچائی جاسکتی ہے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر علی دہگائی نے بھی اردو فارسی اور ایران و ہند کے تعلقات کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ گورنگ باڈی کے چیئرمین اور صدر اجلاس پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ اکثر زبانوں کے اوپر مذاہب کا ٹیگ لگا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ترقی یافتہ زبانیں رو بہ زوال ہوجاتی ہیں۔ اس میں ایک فارسی بھی ہے۔ فارسی اس ملک میں آٹھ سو برسوں سے جبکہ اردو کو تقریباً دوسو برس ہوچکے ہیں۔ صرف اردو کا طالب علم ہی فارسی کیوں پڑھے فارسی کے طالب علم کو بھی اردو پڑھائی جائے۔ ضرورت ہے کہ اردو فارسی اساتذہ بیٹھ کر آنرس میں دونوں زبانوں کو شامل کریں۔ پروگرام کنوینر ڈاکٹر جمیل الرحمٰن نے مہمانوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ سمینار کا مقصد اردو اور فارسی کی ادبی حیثیت کو یاد کرنا ہے۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر ممتاز مجیب نے اظہار تشکر ادا کیا۔ ظہرانے کے بعد منعقدہ اجلاس کی صدارت پروفیسر اقبال اور پروفیسر اے کیو جعفری نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر فوزیہ نے کی۔ پروفیسر ریحانہ خاتون، پروفیسر عمر کمال الدین، ڈاکٹر یوسف جعفری، ڈاکٹر اختر حسین وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔ اس کے بعد ایک اور سیشن کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر خالد علوی اور پروفیسر علیم اشرف وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 اپریل 2016

جگر کی یاد میں شعری نشست

نئی دھلی: دہلی کے ایوان غالب میں سماجی اور ثقافتی تنظیم جلوہ کے زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے معروف شاعر جگر مراد آبادی کی یاد میں ایک شعری

نشست کا اہتمام کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں دہلی کے مرحوم معتبر اور مستند شعرا مرحوم نصرت گوالیاری، مرحوم انور باری، مرحوم صالحین فہمی کو بھی یاد کیا گیا۔ نشست کی صدارت بزرگ شاعر پی پی نرند نے کی جبکہ نظامت پروگرام کی روح رواں شہلا نواب نے کی۔ اس موقعے پر استاد شاعر نصرت گوالیاری کی غزل ان کی صاحب زادی نیلوفر اور ان کی آخری غزل ان کی پوتی خوبی باری نے بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیں۔ انور باری کی غزل نوجوان شاعر جاوید نیازی نے پیش کی جبکہ صالحین فہمی کی غزل ان کے بڑے بھائی احسان احمد اور جاوید اباسی نے پیش کی۔ نشست کا آغاز نعت سرور کونین سے ہوا۔ اس موقعے پر مسعود ہاشمی، فرحان بیگ، صغیر اختر، رئیس تل والے، احمر باری، خاور باری کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ پروگرام کے کنوینر نوید ملک تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اپریل 2016

یہ کہاں آ گئے ہم

نئی دھلی: انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر میں واقع اسٹین آڈیٹوریم میں عالمی شہرت یافتہ شاعر ندا فاضلی کی یاد میں پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام میں ندا فاضلی کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان پر پنکج بھوٹالیہ کے ذریعے بنائی گئی فلم 'یہ کہاں آ گئے ہم' کی نمائش بھی کی گئی۔ فلم کے ڈائرکٹر پنکج بھوٹالیہ نے کہا کہ ندا فاضلی کا انتقال ڈیڑھ ماہ قبل ہوا تھا تبھی سے میں ان کی زندگی کے حوالے سے فلم کا ارادہ رکھتا تھا اور اب وہ فلم مکمل ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے کہا کہ ندا فاضلی اعزازات سے بالاتر شاعر تھے ان کے انتقال کے بعد ان کی شاعری اور شخصیت کے تعلق سے فلم کی ضرورت تھی جس کی نمائش کی جارہی ہے۔ ندا فاضلی شاعری کے ساتھ ساتھ فلموں کے حوالے سے بھی کافی معروف رہے۔ رخشندہ جلیل نے کہا کہ ندا فاضلی

کی شاعری ہر طبقے میں پسند کی جاتی ہے خواہ وہ وزیر اعظم مودی ہوں یا عدالت عظمیٰ کے جج حضرات۔ ان کی غزلیں، نظمیں اور دوہے وغیرہ انسانی زندگی کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے کہا کہ معاصر اردو شاعری میں ندا فاضلی بہت مختلف نوعیت کے شاعر تھے۔ ان کے دوہے بھی دیگر سے مختلف نظر آتے ہیں۔ نصرت امین نے ندا فاضلی کی شخصیت پر مقالہ پیش کیا جس میں ان کی شاعری کے مختلف گوشوں پر گفتگو کی گئی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 اپریل 2016

بزم صدف انٹرنیشنل کا تاسیسی پروگرام

پٹنہ: بزم صدف انٹرنیشنل کے تاسیسی پروگرام میں ملک و بیرون ملک کے دانشوروں اور ادبی شخصیات نے شرکت کی ادبی جریدہ 'صدف' کے زیر اہتمام اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ اس تقریب کے افتتاحی اجلاس

سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ ملازمت، تجارت یا پیشہ سے جوڑ کر دیکھنے کے بجائے اردو کو اپنی ثقافتی وراثت کے طور پر فروغ دینے کی کوشش کریں۔ جبکہ سابق مرکزی وزیر طارق انور نے کہا کہ بہار اردو ادب کا گہوارہ ہے مگر موجودہ زمانے میں معیاری رسالہ نکالنا سفید ہاتھی پالنے جیسا ہے۔ مگر اس کے باوجود صفدر امام قادری نے 'صدف' جیسا معیاری رسالہ شائع کر کے جو خدمات انجام دینے کا چیلنج قبول کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 'صدف' کے دوسرے شمارے کے اجرا پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 'صدف' کی باگ ڈور جس نئی نسل کے ہاتھوں میں ہے، ادبی نقطۂ نگاہ سے جس طرح اس کی ٹیم مضبوط ہے اور نئی تکنیک سے ہم آہنگ ہے اس بات سے مجھے یقین ہے کہ 'صدف' واقعتاً ایک بین الاقوامی جریدہ کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کرے گا۔ انھوں نے جریدہ کے کاغذ اور طباعت و اشاعت کے تعلق سے کئی مشورے بھی دیے۔ انھوں نے کہا کہ صدف کے امکانات بہت روشن ہیں۔ اب اس کی ویب سائٹ بھی تیار ہو رہی ہے۔ پروفیسر ناز قادری کے حوالے سے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ناز قادری ہمارے لیے قابل تقلید ہیں۔ اردو کے روشن مستقبل کے تعلق سے انھوں نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ ہمیں مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے ہمیں مل جل کر کام کرنا ہوگا۔ قطر کے مہمان محمد صبیح بخاری نے صدف کے قطر میں رسم اجرا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے رقم زیادہ معنی نہیں رکھتی۔ میں محبان اردو میں شامل ہوں اور میں اردو کو صرف قطر ہی نہیں بلکہ امریکہ، یوروپ اور افریقہ بھی لے جانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے اس بات کا اعلان بھی کیا کہ قطر میں بھی اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کیا جائے گا۔ پروگرام کے اگلے اجلاس میں پروفیسر ناز قادری کی شخصیت اور خدمات پر مقالے پیش کیے گئے۔ جبکہ آخر میں سلطان اختر کی صدارت میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس میں شعرا نے حاضرین سے خوب خوب داد وصول کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اپریل 2016

دھلی

محفل گنگ وجمن

نئی دھلی: محفل گنگ وجمن رجسٹرڈ کے زیر اہتمام غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں نئے قلم کاروں کی کتابوں کے اشاعتی مسائل اور محفل مزاح کے موضوع پر جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر صادق نے کی۔ اس موقعے پر محفل گنگ وجمن کے ایگزیکٹیو حبیب سیفی نے تنظیم کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ سینئر ایگزیکٹیو ڈاکٹر ظفر نے ممبران کو عمدہ اور نیا لکھنے کے مشورے کے ساتھ شاعری کے علاوہ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے فرمایا کہ محفل گنگ وجمن بتدریج ارتقا کی طرف بڑھ رہی ہے۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے ڈائرکٹر اے رحمٰن نے پبلشرس اور قلم کاروں کے درمیان کمزور ہوتے رشتے اور دوری کو کم کرنے کی مناسبت سے تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تمام پبلشرز کی ذہنیت کتاب بیچنے اور مالی منافع کمانے کی غرض تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ہندی اور اردو کے معروف ادیب پروفیسر صادق نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اگر معیاری ادب کی کتابیں کم قیمت پر چھپیں گی تو وہ ضرور بکیں گی۔ تخلیقی ادب، شاعری، ناول، کہانی، افسانہ، مزاح اور طنزیہ شاعری معیاری ہوگی خواہ اردو میں ہوں یا ہندی اور پنجابی میں اسے لوگ خرید کر پڑھیں گے۔ محفل مزاح میں کلام پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر جی آر کنول، پروفیسر صادق، اسرار جامعی، متین امروہوی، قمر بدر پوری، حبیب سیفی، راز سکندر آبادی، اسرار رازی، منوج بے تاب، اجے عکس، علی اصغر ادریسی، کالی شنکر سومئے قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اپریل 2016

مضامین (اردو کی) کی سائٹ کا افتتاح

نئی دھلی: مرکز جماعت اسلامی ہند کے میڈیا ہاؤس میں 'mazameen.com' کے نام سے اردو کی ایک سائٹ کا افتتاح مولانا سید جلال الدین عمری، امیر جماعت اسلامی ہند کے ہاتھوں ہوا۔ یہ سائٹ خالد سیف اللہ اثری فلاحی اور عرفان وحدی کی ذاتی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس پروگرام میں پروفیسر اختر الواسع کمشنر لسانی اقلیات، پروفیسر شہپر رسول، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، قاسم سید، اٹل چڑیا، ڈائرکٹر میڈیا اسٹڈی گروپ، کرشنا مینن، جوائنٹ ڈائرکٹر راجیہ سبھا، ڈاکٹر قاسم رسول الیاس، صدر ویلفیئر پارٹی آف انڈیا، ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، حقانی القاسمی، ڈاکٹر مطر یف شہباز ندوی اور دیگر بہت سے شائقین علم وادب شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اپریل 2016

ذاکر حسین کالج میں سالانہ جلسہ کا انعقاد

نئی دھلی: ذاکر حسین دہلی کالج میں سالانہ جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں نامور ماحولیاتی کارکن اور پدم شری چنڈی پرساد بھٹ نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ذاکر حسین دہلی کالج کی اپنی ایک تابناک تاریخ رہی ہے۔ یہ

کالج، ادب، سائنس، آرٹ اور کلچر کا ایک تاریخی ادارہ ہے۔ انھوں نے اساتذہ اور طلبہ سے گذارش کی کہ وہ ماحولیات کے تحفظ میں اپنی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے کالج کی تابناک وراثت کو قائم رکھنے کے لیے اساتذہ و طلبہ کو مبارک باد پیش کی۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پربھا کر راؤ نے مہمان خصوصی چنڈی پرساد بھٹ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر کالج کے پرنسپل نے سالانہ رپورٹ میں کالج کے

اساتذہ اور طلبہ کی کامیابیوں کی تفصیل پیش کی۔ اس موقعے پر متعدد شعبے میں بہتر کارکردگی کے لیے طلبہ کو آفتاب کالج، کالج کلکر، کالج کریسٹ، میرٹ ایوارڈ، این سی سی ایوارڈ اور اسپورٹس ایوارڈ وغیرہ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ متعدد شعبہ جات سے شائع ہونے والے رسائل بشمول شعبۂ اردو کا مجلّہ 'فکر نو' کا اجرا مہمانِ خصوصی چنڈی پرساد بھٹ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ یہ رسائل اردو، ہندی، انگریزی اور بنگالی زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ شعبۂ انگریزی کے استاد اور ایوارڈ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر بودھ پرکاش نے انعامات کا اعلان فرمایا۔ شعبۂ سائنس کی استاد ڈاکٹر رتنم وائل نے جلسے کی نظامت کی اور آخر میں اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں طلبہ اور اساتذہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اپریل 2016

اردو زبان کے تدریسی مسائل

نئی دھلی: غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین اولیا میں 'اردو زبان کے تدریسی مسائل' پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں آل انڈیا ملی کونسل کے مرکزی و صوبائی اراکین کے ساتھ متفرق اسکولوں کے اساتذہ، نمائندگان، پرنسپل حضرات اور اردو میڈیم اسکولوں کے فکرمند اساتذہ کی شرکت ہوئی۔

قیصر صدیقی سمستی پوری نے سمینار کے تناظر میں ایک عمدہ نظم 'فرہاد' پڑھی جس سے اردو زبان کی موجودہ صورت حال کی عکاسی ہوتی ہے۔ کنوینر مشرف حسین نے کہا کہ حالانکہ اردو برصغیر سے باہر نکل کر اپنے نئے ٹھکانے اور نئے چاہنے والے تلاش کر رہی ہے اور اس طرح گلوبلائزیشن کے دور میں خود کو 'گلوبل لینگویج' ثابت کرنے کے مرحلے میں ہے اور مشرق و مغرب کی بے شمار نئی بستیوں میں اردو کے چراغ روشن ہو رہے ہیں لیکن دہلی کی سطح پر اگر اردو کی تدریسی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ابتدائی سطح پر اپنی مادری زبان میں تعلیم کے حصول یا اختیاری مضمون کی حیثیت سے اس زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق نہیں دیا جاتا، جس کی وجہ سے اردو زبان ترویج و ترقی سے تہی دست رہ جاتی ہے۔ آج اردو میڈیم اسکولوں میں بھی سبجیکٹ ٹیچرس کا فقدان ہوتا جا رہا ہے اور اس طرح کے اسکولوں میں بھی اردو کی جگہ ہندی میڈیم میں بچوں کے داخلے ہو رہے ہیں۔ انھوں نے اساتذہ اردو اور بالخصوص کارپوریشن اسکولوں کے اردو ٹیچروں کو بھی آواز دی کہ وہ دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیں۔ ایڈووکیٹ آن ریکارڈ سپریم کورٹ، مشتاق احمد علیگ نے کہا کہ ہم اس روش اور چلن کو ختم کریں کہ زبان اردو بہت ستم رسیدہ ہے۔ آل انڈیا ملی کونسل کے نائب صدر اور سکدوش آئی اے ایس، حسیب احمد نے کہا کہ ڈپلوما ان ایجوکیشنل کے داخلہ امتحان کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ، اردو سبجیکٹ کا بھی امتحان لے تاکہ اردو کی اچھی استعداد والے ہی کو اردو کوٹے میں جگہ ملے۔ اس موقعے پر ایم سی ڈی کے ڈپٹی ڈائریکٹر ارشاد قمر، ڈاکٹر نگر سینئر سیکنڈری اسکول کی انگریزی معلّمہ محترمہ نگار مولانا جاوید سکریٹری جمعیۃ علماء دہلی، صدر آل انڈیا ملی کونسل صوبہ دہلی ڈاکٹر پرویز میاں و دیگر سرکردہ شخصیات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ قبل ازیں سمینار کا آغاز مولانا قاری محمد اختر کی تلاوت قرآن کریم سے ہوا، سمینار کی صدارت ڈاکٹر پرویز میاں، صدر آل انڈیا ملی کونسل صوبہ دہلی نے کی اور نظامت ملی کونسل صوبہ دہلی کے سکریٹری شکیل الرحمٰن نے انجام دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اپریل 2016

اتر پردیش

تعلیمی اعتماد اور ادبی سرقہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے زیر اہتمام ٹرنٹین یو ایس اے اور آئی گروپ انفوٹیک نوئیڈا کے تعاون سے 'تعلیمی اعتماد اور ادبی سرقہ' موضوع پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں یونیورسٹی کے 180 سے زائد ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ نے حصہ لیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں پرووائس چانسلر بریگیڈیئر ایس احمد علی نے تعلیمی و تحقیقی کاموں میں ادبی سرقہ سے متعلق سافٹ ویئر کے استعمال پر طلبا کو اپنے تجربات سے روشناس کرایا۔ آسٹریلیا سے آئے خصوصی مقرر مسٹر جیک بریزل نے ادبی سرقہ کو پکڑنے والے کمپیوٹر سوفٹ ویئر کے استعمال اور حاصلات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ یہ سوفٹ ویئر کس طرح ان کے تحقیقی کاموں میں معاون ثابت ہوگا۔ مسٹر بریزل نے ٹرنٹین یو ایس اے سے آئے اپنے دو معاونین کے ساتھ ادبی سرقہ اور برابری کے موضوع پر ایک ورکشاپ کا نظم بھی کیا۔ سمینار میں آئی گرپو انفوٹیک نوئیڈا کے نیشنل سیلس منیجر مسٹر نرمل بینگانی نے ادبی سرقہ، کاپی پیسٹنگ اور اس سے متعلق سوفٹ ویئر کے استعمال پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے طلبا کو یہ بھی بتایا کہ مذکورہ سوفٹ ویئر کی مدد سے کس طرح ادبی مضامین میں سرقہ کے حصوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی لائبریرین ڈاکٹر نبی حسن نے مہمانان کا خیر مقدم کرتے ہوئے سمینار کی کامیابی کے لیے اپنے معاونین کا شکریہ ادا کیا۔ اسسٹنٹ لائبریرین ڈاکٹر شائستہ بیدار نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور ڈپٹی لائبریرین ڈاکٹر امجد علی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 اپریل 2016

بہار

اردو صحافت کل آج اور کل

پٹنہ: 'اردو صحافت: کل آج اور کل' کے موضوع پر 17 اپریل کو بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام ایک شاندار سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ سمینار کا پہلا اجلاس جناب فاروق ارگلی، جناب ریاض عظیم آبادی اور جناب عبدالقادر کی مشترکہ صدارت میں شروع ہوا جس میں ڈاکٹر ابرار رحمانی، محترمہ وسیم راشد، جناب عابد انور، جناب منصور خوشتر، جناب نواب عتیق الزماں اور جناب انواراللہ نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر جناب عبدالقادر نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو صحافت کی مجموعی روش پر کچھ اہم سوالات کی طرف توجہ دلائی اور محض جوش و جذبات سے سوچنے اور خود احتسابی سے کام لینے کی ضرورت پر زور دیا۔ جناب ریاض عظیم آبادی نے اپنی صدارتی تقریر میں صحافتی اخلاقیات کے تعلق سے اہم نکات کی نشاندہی کی اور کہا کہ ہمیں روزناموں کے سرکولیشن بڑھانے کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ جناب فاروق ارگلی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ بہار میں ذہانت اور سیاست اگتی ہے اور ہمیں دیگر باتوں کے ساتھ ان حقائق کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے جو اردو صحافت کی مجبوریوں کے مصداق ہیں۔ پہلے سیشن کے اختتام پر جناب سلطان اختر کے دست مبارک سے مقالہ

خواں حضرات و دیگر مہمانوں کے درمیان مومنٹو کی تقسیم عمل میں آئی۔

دوسرے اجلاس کی مشترکہ صدارت ڈاکٹر جاوید حیات، جناب احمد جاوید اور جناب سہیل انجم نے فرمائی اور جناب سہیل انجم، جناب فیضان احمد، ڈاکٹر ریحان غنی، جناب نوشاد مومن، جناب شہباز عالم، جناب محفوظ عالم، جناب احمد جاوید نے اپنے اپنے مقالات سے سامعین کو نوازا۔ جناب سہیل انجم نے جہاں صدارتی تاثرات کی صورت میں صحافتی اصول و اقدار کی پاسداری پر متوجہ کیا وہیں جناب احمد جاوید نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو صحافت کے وسیع منظرنامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ہمیشہ صحت مند پیغام رسانی پر متوجہ رہنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر جاوید حیات نے اپنے صدارتی کلمات میں لفظ صحیفہ سے صحافت کا رشتہ بتاتے ہوئے اس کے تقدس پر توجہ دلائی۔ دوسرے اجلاس کے اختتام پر بھی حسب سابق مقالہ خواں و دیگر حضرات کو نائب صدر اکادمی جناب سلطان اختر کے دست مبارک سے مومنٹو دیے گئے۔ تیسرے اور آخری اجلاس کی مشترکہ صدارت کے فرائض جناب خورشید ہاشمی، جناب ایس ایم اشرف فرید اور ڈاکٹر مشتاق احمد نے انجام دیے اور جناب نورالسلام ندوی، جناب شرف الہدیٰ، جناب شمس تبریز قاسمی، جناب خورشید پرویز صدیقی، جناب اشرف استھانوی اور جناب دانش ریاض نے اپنے اپنے مقالات سے سامعین کی ضیافت کی۔ جناب خورشید ہاشمی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ صحافی کو بہرحال بردبار اور حلیم ہونا چاہیے۔ صحافت کا تجارت بنانا برا نہیں بلکہ بے قاعدگی سے تجارت بنانا برا ہے۔ جناب ایس ایم اشرف فرید نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو صحافت کی تاریخ سرتاپا قربانیوں کی تاریخ ہے اور اردو اخبار نکالنا جہد مسلسل کے مصداق ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد نے اپنے صدارتی خطاب میں جہاں ایک طرف اس سمینار کے مقالات کا علمی تجزیہ کرتے ہوئے انھیں معیاری بتایا وہیں راہ صحافت میں ہر لحاظ سے محتاط رویہ اپنانے پر توجہ دلائی۔ تیسرے اجلاس کے اختتام پر بھی حسب سابق مقالہ خواں و دیگر حضرات کو نائب صدر اکادمی جناب سلطان اختر کے دست مبارک سے مومنٹو پیش کیا گیا۔ اجلاس کی نظامت کے فرائض محترمہ شگفتہ یاسمین نے انجام دیے۔ سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری کے کلمات تشکر پر سمینار کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 19 اپریل 2016

بہار میں اردو کا فروغ لمحہ فکر و عمل

وسائل اور امکان

دربھنگہ: اردو کے فروغ کے لیے جو کام کرنا چاہیے

حکومت اس سے زیادہ کر چکی ہے۔ ہم نے حکومت سے اردو کی ترقی کے لیے جب بھی کوئی کام کرنے کو کہا حکومت نے کر دیا۔ ہم نے اپنی آمدنی کا ایک فیصد کا عشر عشیر بھی اردو زبان کے فروغ کے لیے استعمال نہیں کیا ہے۔ یہ باتیں وزیر اقلیتی فلاح ڈاکٹر عبدالغفور نے سوشل سروسیز ٹرسٹ کے زیر اہتمام اور بہار اردو اکادمی کے اشتراک سے شہر کے ادبی مرکز شیر محمد بھیگو واقع قومی سمینار ہال میں اردو کا فروغ لمحہ فکر و عمل اور وسائل و امکانات کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ نوشاد عالم نے کہا کہ اس حکومت میں یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اردو میں کچھ بہتر سے بہتر کیا جائے۔ صرف سرکار کی کوشش سے اردو کی ترقی نہیں ہوسکتی ہے جب تک ہم اپنے گھروں میں اردو کا استعمال نہیں کریں گے اردو کا فروغ نہیں ہوگا۔ جب تک ہم اپنے گھروں میں اردو اخبارات و رسائل نہیں رکھیں گے، اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دلائیں گے اردو کا فروغ ممکن نہیں ہے۔ اردو ایک طاقتور زبان ہے۔ اس کے ذریعے دوسری زبانوں پر بھی عبور حاصل کیا جاسکتا ہے۔

پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر سید ممتاز الدین نے کہا کہ اردو زبان کا تعلق ہماری تہذیب اور تمدن سے ہے۔ اس لیے ہمیں اپنی زبان کے تحفظ کے لیے خود ہی کوشش کرنی ہوگی۔ انھوں نے بچوں کے رسالوں کو بھی فروغ دینے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس وقت جو کتابیں آرہی ہیں اس کی زبان بڑی مشکل ہوتی ہے، اسے آسان بنانے کی ضرورت ہے۔

پروگرام کا افتتاح وزیر اقلیتی فلاح ڈاکٹر عبدالغفور، مہمان خصوصی اقلیتی فلاح کے سابق وزیر نوشاد عالم، پروی سی پروفیسر سید ممتاز الدین، پروفیسر طیب صدیقی اور عتیل صدیقی کے ہاتھوں شمع روشن کر کے ہوا۔ پروگرام کی نظامت عبدالمتین قاسمی نے کی۔ پروگرام کا اختتام آرگنائزر ڈاکٹر عتیل صدیقی کے اظہار تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 28 اپریل 2016

بہار میں اردو صحافت، سمت و رفتار

دربھنگہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ دربھنگہ کے زیر اہتمام ملت کالج دربھنگہ میں قومی سمینار 'بہار میں اردو صحافت: سمت و رفتار' کا افتتاح سابق وزیر محمد علی اشرف فاطمی، پرو وائس چانسلر پروفیسر سید ممتاز الدین اور پرنسپل ڈاکٹر محمد رحمت اللہ نے کیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض عبدالمتین قاسمی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نے استقبالیہ نظم پیش کرتے ہوئے تشریف آوری کے لیے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ ٹرسٹ کے سکریٹری منصور خوشتر نے ٹرسٹ کی کارکردگی بیان کرتے ہوئے کہا کہ 125 سے زائد ادبی و شعری نشست، 6 کل ہند ریاستی سمینار، دربھنگہ ٹائمز کی اشاعت وغیرہ اس ٹرسٹ کا اہم کارنامہ ہے۔ وہیں مہمان خصوصی سابق وزیر محمد علی اشرف فاطمی نے کہا کہ اردو ملک کو جوڑنے والی زبان ہے۔ اردو کو پورے ملک میں مرکزیت حاصل ہے۔ زبانیں وہی زندہ رہتی ہیں جس کو روزگار سے جوڑا جائے اور اس لیے میں نے اپنی وزارت میں اس کی پہل بھی کی۔ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے کہا کہ اس وقت پورے بہار میں صحافت پر سمینار کا انعقاد اس لیے کیا جارہا ہے کہ صحافت کو دو سو سال پورے ہوگئے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ صحافت صرف قلم کو کاغذ پر گھسیٹنے کا نام نہیں بلکہ ایک عبادت ہے۔ ہمیں اردو اخبار ضرور پڑھنا چاہیے۔ پروفیسر سید ممتاز الدین نے کہا کہ بہار میں اردو صحافت کا

سنہرا ماضی رہا ہے اور حال بھی روشن ہے لیکن اس کے باوجود تسلیم کرنا چاہیے کہ یہاں معیار میں کمی آئی ہے۔ ڈاکٹر محمد رحمت اللہ نے کالج میں سمینار کے انعقاد پر شکریہ ادا کیا اور اردو صحافت پر گفتگو کی۔ پروگرام کا اختتام المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے سکریٹری ڈاکٹر منصور خوشتر کے اظہار تشکر پر ہوا۔ پروگرام کے درمیان بہار اردو اکادمی پٹنہ کے سکریٹری مشتاق احمد نوری کے ہاتھوں 2014 میں کتابوں پر انعام پانے والے دربھنگہ کے ڈاکٹر منصور خوشتر اور ڈاکٹر قیام نیر کو شٹفلیٹ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر شرکا میں نیاز احمد سابق اے ڈی ایم، ڈاکٹر عطاء الرحمن، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر شمیم احمد باروری، ڈاکٹر شوکت انصاری، سلطان احمد انصاری (سابق ایم ایل اے)، عطا عابدی کے علاوہ دیگر شخصیات موجود تھیں۔ وہیں سمینار کے ٹیکنیکل سیشن میں عبدالمتین قاسمی، احتشام الحق، انوار اللہ، نورالسلام ندوی، احسان عالم، ڈاکٹر قیام نیر، فردوس علی، ڈاکٹر جاوید رحمانی، ڈاکٹر فیاض احمد وجیہ، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر منصور خوشتر، کامران غنی صبا اور سلمان عبدالصمد وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کی صدارت انوار الحسن وسطوی، ڈاکٹر سید شہباز عالم، ریحان غنی، پروفیسر شاکر خلیق اور ریاض دانش نے کی اور انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں بہار کی موجودہ صورت حال پر اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے کی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 22 اپریل 2016

عصمت چغتائی اور ان کے اثرات

علی گڑھ: انجمن ترقی پسند مصنفین کی علی گڑھ اکائی کے زیر اہتمام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سوشل سائنس فیکلٹی کے آڈیٹوریم میں 'عصمت چغتائی اور ان کے اثرات: علی گڑھ کے افسانہ نگار' موضوع پر منعقدہ عالمی سمینار سے

خطاب کرتے ہوئے امریکہ کی نیکساس یونیورسٹی کی پروفیسر کیتھلین میری لونگ واٹرس نے کہا کہ عصمت چغتائی نے جو ناول اور کہانیاں تخلیق کی ہیں انھوں نے سماج میں بیداری پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ دور میں اس کی اہمیت کا ذکر کیا۔ انھوں نے علامہ اقبال پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال ترقی پسند تھے کیونکہ ترقی پسند ادبا کی طرح وہ بھی بدلاؤ چاہتے تھے، اگرچہ ان کا نظریہ اسلامی تھا۔ پروفیسر لونگ واٹرس نے کہا کہ آج اگر عصمت چغتائی باحیات ہوتیں تو ان کا قلم خاموش نہیں رہتا۔ انھوں نے کہا کہ عصمت چغتائی خواتین قلم کاروں کے لیے نہ صرف باعث ترغیب ہیں بلکہ دنیا بھر کے قلم کاروں کے لیے بھی نظریاتی تخلیق کی بڑی مثال ہیں۔ پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار نے کہا کہ عصمت چغتائی اردو ادب کی پہلی خاتون قلم کار ہیں جنھوں نے جنون اور آئیڈیالوجی کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے لیے راہ ہموار کی۔ عصمت کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ عصمت چغتائی کی محاوراتی تحریرات کو سو سال کے بعد بغیر محاوراتی لغت کے سمجھانا ناممکن ہوگا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی علی گڑھ اکائی کے سکریٹری شعبۂ انگریزی کے پروفیسر محمد عاصم صدیقی نے عصمت چغتائی اور پی ڈبلیو اے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے سماجی پابندیوں کے خلاف قلم اٹھایا اور ادبی فریضوں سے واقف کرایا۔ پروفیسر صدیقی نے ترقی پسند تحریک سے وابستہ قلم کاروں کا بھی ذکر کیا۔ معروف کہانی نویس ڈاکٹر نیتا سنگھ نے کہا کہ دور حاضر میں ترقی پسند مصنفین کی سخت ضرورت ہے کیونکہ یہی قلم کار سماج کے سلگتے مسائل کو اجاگر کر کے ملک میں پنپ رہے نفرت کے ماحول کو ختم کر سکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ترقی پسند تحریک کی بنیاد 10 اپریل 1936 کو لکھنؤ میں پڑی جس میں پریم چند کے علاوہ ہندی کا کوئی مصنف نہیں تھا مگر جب 1938 میں دوسرا اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا تب اس میں ہندی کے کئی مصنفین نے شرکت کی۔ شعبۂ انگریزی کی پروفیسر سمیع رفیق نے کہا کہ قلم کار اپنے ضمیر کی آواز پر تخلیقی عمل کو انجام دیں۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر افتخار عالم نے کہا کہ ایک بڑا ادیب ہمیشہ اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی نظام کا مخالف ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ بدلاؤ چاہتا ہے۔ انھوں نے عصمت چغتائی کی ان کہانیوں کا بھی ذکر کیا جن میں ترقی پسند خیالات پائے جاتے ہیں۔ آخر میں جوگندر پال کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 اپریل 2016

پنجاب

کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم سے مالیرکوٹلہ کے وفد کی ملاقات

مالیرکوٹلہ: انجمن فروغ اردو کا ایک وفد جس میں ڈاکٹر سلیم زبیری صدر، جناب ایم انوار انجم جنرل سکریٹری، جناب ماسٹر عبدالحمید اور ماسٹر صابر علی زبیری، محمد جمیل خازن، کاشف جاگیردار سکریٹری، مشتاق جوش اور

محمد رفیق پر مشتمل ممبران کی ملاقات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ارتضیٰ کریم سے ہوئی۔ کونسل کے ڈائریکٹر نے نہایت دلچسپی سے وفد کی پوری بات سنی۔ جب انجمن کی جانب سے ڈائرکٹر ارتضیٰ کریم کے سامنے مشاعرہ کی تجویز رکھی گئی تو انھوں نے کہا کہ آپ آل انڈیا نہیں بلکہ انٹرنیشنل مشاعرہ کروائیں اور ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک سے بھی شعرا حضرات کو بلائیں آپ کو کونسل کی جانب سے مکمل تعاون دیا جائے گا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ آئندہ جب مشاعرہ کروائیں گے تو کونسل کی جانب سے وہاں کونسل کی کتابوں کی نمائش بھی لگائی جائے گی انھوں نے انجمن کو گذشتہ سالوں کی طرح طلبا کے کوئز وغیرہ کروانے کا مشورہ دیا۔

روزنامہ 'ہند سماچار' جالندھر، 29 اپریل 2016

اعزاز و اکرام

ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ

لکھنؤ: زبان و ادب کی بہت اہمیت و افادیت ہوتی ہے۔ اس میں بھی مادری زبان کی اہمیت، افادیت، اثر انگیزی اور جاذبیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنا کوئی بھی مواد، ادب، اپنی مادری زبان میں ملے گا تو وہ سمجھ میں

بھی خوب آئے گا اور اس کا اثر بھی زیادہ ہوگا۔ ہندی اور اردو ہندوستان کی زبانیں ہی نہیں چھوٹی بڑی بہنیں ہیں۔ ان خیالات کا اظہار گورنر اتر پردیش رام نائک نے ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے تحت 4 روزہ 27 ویں بین الاقوامی ادبی میلے کی افتتاحی تقریب میں کیا۔ انھوں نے کمیٹی کے بانی اطہر نبی ایڈووکیٹ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ جس مرض سے مقابلہ کرتے ہوئے ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ اس موقعے پر کمیٹی کی جانب سے گورنر نے عالمی شہرت یافتہ شاعر منور رانا کو 'نشانِ غالب' اعزاز اور نغمہ نگار کنور بے چین کو 'نرالا سمان' سے نوازہ۔ اس کے علاوہ پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، ڈاکٹر زبیر فاروق (دبئی)، احمد صبیح بخاری (قطر)، حبیب النبی، ادریس عنبر بہرائچی، خان مسعود خان اور ڈاکٹر طارق قمر کو 'اردو ادب' ایوارڈ سے نیز ڈاکٹر وگیندر نرائن، سریش رتو پرنا، سرویش استھانا، بلدیو بھائی شرما، گورو کرشن بنسل اور ساگر ترپاٹھی کو 'ساہتیہ شرومنی سمان' سے سرفراز کیا۔ اس موقعے پر کمیٹی کے بانی اطہر نبی ایڈوکیٹ نے کمیٹی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے 27 ویں اجلاس کی ترتیب پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے قلم کاروں کا مختصر تعارف بھی کرایا۔ تقریب کی نظامت حسن کاظمی اور سرویش استھانہ نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 اپریل 2016

'فخر صحافت پنجاب' ایوارڈ

چنڈی گڑھ: صوبہ پنجاب کے نائب وزیر اعلیٰ سردار سکھبیر سنگھ بادل کی صدارت میں اقلیتی کمیشن پنجاب

حافظ تحسین احمد کی جانب سے پنجاب کے لدھیانہ میں منعقد ایک بڑے پروگرام میں جالندھر سے شائع ہونے والا روزنامہ ہند سماچار کے سب ایڈیٹر و رپورٹر نوجوان صحافی محمد مظہر عالم مظاہری کو 'فخر صحافت پنجاب' ایوارڈ 2015-16 سے سرفراز کیا گیا اور ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ اس موقعے پر ممبر اقلیتی کمیشن اور جج کمیٹی پنجاب حافظ تحسین احمد نے کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے اور پنجاب سرکار نے اردو کے فروغ کے لیے کافی اقدامات کیے ہیں۔ پنجاب سرکار ہر سال اردو صحافیوں کو اعزاز دیتی ہے۔ یہ ایوارڈ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امارت شرعیہ پنجاب کے چیئرمین اور سابقہ ڈی جی پی پنجاب محمد اظہار عالم نے کہا کہ اس علاقے میں 'ہند سماچار' اردو کا واحد اخبار ہے جو ملکی مسائل کے ساتھ ساتھ ملت اسلامیہ کے مسائل کو بھی زوردار طریقے سے اٹھاتا آ رہا ہے۔ پنجاب کے نائب وزیر اعلیٰ سردار سکھبیر سنگھ بادل نے کہا کہ اردو کے فروغ میں وہ کوئی کسر باقی نہیں رکھیں گے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 اپریل 2016

اردو اکادمی کا 2015 کے لیے انعامات کا اعلان

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کی ایگزیکیٹو کمیٹی نے زیر صدارت وائس چیئرمین اکادمی ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے 2015 کی کتابوں پر انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ اس سال اکادمی کو موصول 29 کتابوں میں سے جن کتابوں کا انتخاب عمل میں آیا ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے: پہلے انعام کے لیے منتخب کتابیں: اداریہ نویسی اور میرے اداریے (ڈاکٹر ابرار رحمانی)، روشنی ہی روشنی (ابرار کرت پوری)، مولانا محمد علی جوہر سیاست، صحافت، شاعری (ڈاکٹر منور حسن کمال)، وہ جن کی یاد آتی ہے (انیس امروہوی)، الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت (ڈاکٹر تنزیل اطہر)، قرۃ العین حیدر کرفن (ڈاکٹر شیفتہ پروین)، اردو صحافت کی موجودہ صورت حال (فلاح الدین فلاحی)، نکات سخن حسرت موہانی (ذکیہ خشندہ)، ادبی صحافت (عبدالحی)۔

دوسرے انعام کے لیے منتخب کتابیں: شگفتگی کی تلاش (انجم عثمانی)، بتکلف برطرف (سالک دھامپوری)، جوگندر پال کی افسانہ نگاری (ڈاکٹر ابوظہیر ربانی)، دہلی کے 50 صحافی (ظفر انور)، ساحر لدھیانوی شخصیت اور فن (ڈاکٹر ظفر اعجاز عباسی)، نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (ڈاکٹر وسیمہ سلطانہ)، قطرہ قطرہ بحر عقیدت (اعظم عباس شکیل)، اودھ اخبار کی ادبی اور علمی خدمات (ڈاکٹر سلطانہ فاطمہ واحدی)، آخری راستہ (ڈاکٹر فرح جاوید)، جن سے روشن ہے کائنات (ڈاکٹر عبدالقادر شمس)، شام سے پہلے (وسیم نادر)۔ اس کے علاوہ منشی نول کشور انعام برائے ناشر کے لیے 'حالی پبلی کیشن' کو منتخب کیا گیا۔ تمام انعام یافتگان کی خدمت میں نقد انعامات کے علاوہ اکادمی کا نشان (مومنٹو) اور سرٹیفکیٹ پیش کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اکادمی میں موصول 36 مسودات میں سے 27 مسودات پر مالی تعاون دینے کا فیصلہ کیا گیا جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے: متن شناسی: پروفیسر عبدالحق، تکلم: پروفیسر عتیق اللہ، اردو صحافت اور علما: سہیل انجم، ایڈیٹن: ڈاکٹر فریاد آزر، کتاب عرض ہے: سید تحسین منور، امتیازات: ڈاکٹر احمد امتیاز، افکار و تاثرات: ڈاکٹر شمیم احمد، ممتاز مفتی: ایک مطالعہ: ڈاکٹر علاء الدین خان، ادب اور احتساب: ڈاکٹر شازیہ عمیر، اردو ادب اور دہلی کی مشترکہ تہذیب: ڈاکٹر عفیفہ بیگم، اردو غزل پر اقبال کی شاعری کے اثرات: ڈاکٹر افسانہ حیات، تجربات حیات: ماسٹر نثار احمد، سفر خامہ: شاہد الاسلام، اطلاعاتی تکنالوجی و سوشل میڈیا: مظہر حسنین، چند برگزیدہ صوفیائے کرام: رضوان لطیف خان، ذرا دور چلنے کی حسرت رہی ہے: تبسم فاطمہ، حد جاں سے گزرنے تک: ساحر داؤدنگری، منزل کی جستجو: محمد عمر حنیف، نام کی تلاش: ورد دہلوی، مذاقاً: اقبال فردوسی، صلیب نیم شب: ایم رحمٰن، کشمکش زندگی: چشمہ فاروقی، ادویہ حیوانیہ: حکیم عباس علی، اردو میں خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر عائشہ طلعت خلجی، زندگی کا خزانہ: محمد رضی الاسلام ندوی، حال دل: طفیل احمد، لہلہان اردو افسانہ: سید عینین علی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 اپریل 2016

23 صحافیوں کو ماتر شری ایوارڈ

نئی دھلی: ملک کی مشہور خبر رساں ایجنسی یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (یو این آئی) کی ہندی سروس کے اجے کمار 'وشوکرما' انگریزی کے نکھل وہاس اور یو این آئی اردو سروس کے سعید انجم سمیت 23 صحافیوں کو 41 ویں ماتر شری ایوارڈ

سے نوازہ گیا۔ ایوارڈ تقریب کے مہمان خصوصی پارلیمانی امور کے مرکزی وزیر مختار عباس نقوی نے صحافیوں کو اس باوقار ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ پنجاب کیسری کے ڈائریکٹر 'آدتیہ نرائن چوپڑا' بھی اس تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ یو این آئی کے تین صحافیوں کے علاوہ پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے سرکردہ فوٹو گرافر کمل کشور 'بھاشا کے امیش سنگھ اور سماجی خدمت کے شعبہ میں کام کرنے والے نجی ملک کو بھی اس ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ فلم 'نیرجا' کو جس میں سونم کپور نے کام کیا ہے، بہترین فیچر فلم کا ایوارڈ دیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اپریل 2016

نعمان شوق کو شاد عظیم آبادی ایوارڈ

دوحہ: سماجی وثقافتی تنظیم انڈین ایسوسی ایشن آف بہار اینڈ جھارکھنڈ (آئی اے بی جے) ملحقہ انڈین کلچرل سینٹر قطر کی جانب سے جشن یوم بہار کے موقعے پر گذشتہ دنوں عالمی مشاعرے کا انعقاد ریڈیسن بلو ہوٹل کے جیوانا ہال میں ہوا۔ آئی اے بی جے نے اس موقعے

پر ادبی خدمات کے اعتراف میں معروف شاعر نعمان شوق کو شاد عظیم آبادی ایوارڈ پیش کیا جس میں شیلڈ کے علاوہ 21 ہزار روپے نقد بھی پیش کیے گئے۔ آئی اے بی جے نے یہ طے کیا ہے کہ ہر سال سرزمین بہار سے وابستہ کم از کم دو شعرا کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ پیش کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ نعمان شوق کا ادبی اور تخلیقی سفر گذشتہ 35 برسوں سے جاری ہے۔ اردو اور ہندی میں ان کے پانچ مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں جن میں اجنبی ساعتوں کے درمیان، جلتا شکارا ڈھونڈنے میں، فریزر میں رکھی شام اور اپنے کہے کنارے شامل ہیں۔ نعمان شوق آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بھی وابستہ ہیں اور سینئر براڈ کاسٹر ہیں۔ معروف ادبی ویب سائٹ ریختہ میں بھی ان کی خدمات بہت نمایاں اور قابل قدر ہیں۔ مذکورہ بالا ایوارڈ مہمان خصوصی ڈینش یودینیا، معتمد اول سفارت خانہ ہند اور مہمان اعزازی خالد غامدی، چیئرمین الوماسا گروپ نے پیش کیے۔ اس موقعے پر آئی اے بی جے کے سرپرست اعلیٰ اور چیف آرگنائزر سید شکیب ایاز، مشاعرے کے کوآرڈی نیٹرس سجاد عالم، افتخار راغب اور غفران محمد بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اپریل 2016

ڈاکٹر رحمٰن اختر کو اعزاز

جالندھر: پنجابی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر رحمٰن اختر کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نامور روزنامہ ہند سماچار پتر سموہ کے چیف ایڈیٹر پدم شری وجے کمار چوپڑہ نے ان کو نشان اعزاز دے کر عزت افزائی کی۔ ساتھ ہی ان کی نئی کتاب کی رسم اجرا بھی پدم شری وجے کمار چوپڑہ نے اپنے دست مبارک سے کی۔ ڈاکٹر رحمٰن اختر نے نمایاں کامیابی حاصل کر کے جہاں پنجابی یونیورسٹی کے اردو فارسی ڈیپارٹمنٹ میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر اپنی خدمات بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ وہیں انھوں نے پنجاب اور اردو کے حوالے سے تقریباً 12 کتابیں ادب کی جھولی میں ڈالی ہیں۔ اس موقعے پر ان کے ہمراہ مالیر کوٹلہ سے نامہ نگار محمد انوار محبوب اور ایڈووکیٹ محمد فاروق بھی خاص طور پر موجود تھے۔

روزنامہ 'ہند سماچار' لدھیانہ، 14 اپریل 2016

سالانہ انعامی مقابلہ

نئی دھلی: دہلی کے قدیم ترین تعلیمی ادارہ جامعہ ریاض العلوم کے طلبہ کا سالانہ انعام پروگرام کا اہتمام کیا گیا جو مقابلہ قرأت، مقالہ نگاری، جنرل نالج، عربی اردو ہندی تقاریر پر مشتمل تھا، جس میں طلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صدر نگراں بورڈ شیخ صلاح الدین مقبول احمد مدنی نے اپنے خطاب میں بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی اسلام کی صحیح تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ یہی ہمارے مدارس و مساجد تھے جہاں بیٹھ کر ہمارے جیالوں نے آزادی کا خواب دیکھا اور اسی تحریک کی بدولت اسے حاصل بھی کیا، ہمیں احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے بلکہ عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ بعدہ جامعہ کے استاذ شیخ عبدالمبین ندوی کے مجموعہ مقالات 'متاع لوح وقلم' کا اجرا صدر جمعیت شیخ صلاح الدین مقبول احمد مدنی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مفتی جامعہ مولانا عبدالتواب مدنی حفظہ اللہ کے دعائیہ کلمات پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اپریل 2016

بہار اردو اکادمی میں شبیر احمد کو استقبالیہ

پٹنہ: شبیر احمد اردو ادب کے علاوہ بنگلہ ادب پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق بنگال سول سروس سے ہے۔ انھوں نے کئی مشہور و معروف بنگالی ناولوں کا اردو ترجمہ کیا ہے جس میں سنیل گنگوپادھیائے کے ناول کا ترجمہ 'اور اس وقت' بھی ہے جو ابھی حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس کتاب پر بنگلہ ادب کا ساہتیہ اکادمی انعام ملا تھا اور ساہتیہ اکادمی نے اس کا اردو ترجمہ شبیر احمد سے کرایا۔ نریندر ناتھ چکرورتی کا ناول 'صاحب لباس' اور سبھاش مکھوپادھیائے کا ناول 'چلتے چلتے' کا اردو ترجمہ بھی شبیر احمد نے ساہتیہ اکادمی کی فرمائش پر کیا ہے۔ اسی طرح صلاح الدین پرویز کی اردو کتاب 'آئیڈنٹٹی کارڈ' کا بنگلہ ترجمہ بھی شبیر احمد نے ہی کیا تھا۔ ابھی حال میں شبیر احمد کی ایک اہم کتاب 'بچوں کے راہنر ناتھ' بھی شائع ہوئی ہے جس کا بنگلہ سے اردو ترجمہ شبیر احمد نے کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار سکریٹری اردو اکادمی مشتاق احمد نوری نے یہاں ایک پریس ریلیز میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو اور مختلف زبانوں کے اہم فنکاروں کی پذیرائی بہار اردو اکادمی کی روایتوں میں شامل رہی ہے۔ یہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 23 اپریل 2016

رسم اجرا

فکر

نئی دھلی: جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری اور شیخ الہند ٹرسٹ کے چیئرمین مولانا محمود مدنی نے جدید انداز کی ایک کتاب 'فکر' کے عنوان سے شائع کی ہے جس کا اجرا نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے کیا۔ مولانا محمود مدنی کی سرپرستی میں قائم نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فیتھ لیڈرشپ جیسے ادارے کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اس کتاب کا مقصد دین اسلام اور علمائے کرام کے تعلق سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کرنا اور اسلام کی صحیح تعلیمات کو عام کرنا ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کا اجرا کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے کہا کہ مجھے اس تقریب میں شرکت کرتے ہوئے انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ فکر جیسی کتاب کا اجرا کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بہت ہی خوب صورت پریزنٹیشن ہے۔ انھوں نے الہیریائی فلاسفر اور دانشور محمد ارکون کا حوالہ پیش کرتے ہوئے کہا وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ جدیدیت اور اسلام کو ہم آہنگ ہونا چاہیے اور میرے خیال سے یہ کتاب اسی کا نمونہ ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے جمعیۃ علماء ہند اور دارالعلوم دیوبند کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے مدارس اسلامیہ کی خدمات اور ان کی قربانیوں کا ذکر کیا۔ کتاب کو جدید انداز میں پیش کرنے والی تنظیم ڈیزائن فیکٹری انڈیا کے سربراہ سوربھ گپتا نے مولانا محمود مدنی کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ

جمعیۃ علماء ہند نے ہمیں اس نیک کام میں شریک کیا۔

بی جے پی کے قومی ترجمان ایم جے اکبر نے کہا کہ اسلام فساد یا دہشت گردی کی اجازت نہیں دیتا اور جو لوگ یہ کرتے ہیں وہ اسلام نہیں جانتے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا محمود مدنی اس قسم کی فکر کو پیش کر کے اسلام کی خدمات نہیں بلکہ انسانیت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آخر میں اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے مولانا محمود مدنی نے کہا کہ اسلام کے نام پر جو لوگ قتل و غارت گری کر رہے ہیں اور اسے جہاد قرار دے رہے ہیں دراصل ہم نے ان کے خلاف جہاد شروع کیا ہے کیونکہ اسلام میں قتل و غارت گری کی اجازت نہیں ہے۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر روی شنکر پرساد، سابق مرکزی وزیر کے رحمن خان، کمال فاروقی، رام جیٹھ ملانی، شیوراج سنگھ پاٹل، سیتا رام یچوری، سراج الدین قریشی، منی شنکر ایر، پی اے انعامدار، مولانا نیاز فاروقی، محمود پراچہ ایڈوکیٹ، حسین دلوائی کے علاوہ کئی اہم شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اپریل 2016

ہیریٹیج آف میوات

نوح / میوات: میوات کی تاریخ اور آثار قدیمہ پر مبنی وسیع پیمانے پر تحقیقی کتاب 'ہیریٹیج آف میوات' میوات کی

تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوگا اور میوات علاقے میں آج خستہ ہو چکے قلعے، باؤڑی، مقبروں اور صوفیا کی آرام گاہوں کو ایک لڑی میں پرونے کے کام کو پروفیسر اعجاز نے کیا ہے۔ یہ میوات کی تاریخ میں بڑی پہل ہے۔ یہ خیال یاسین میوڈگری کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد امتیاز نے ہفتہ کو نوح کالج میں پروفیسر اعجاز کی لکھی گئی کتاب 'ہیریٹیج آف میوات' کی رسم اجرا کے بعد صحافیوں سے کیا۔ اس کتاب کی اشاعت میوات ڈیولپمنٹ ایجنسی نے کی ہے۔ پرنسپل ڈاکٹر محمد امتیاز نے کہا کہ پروفیسر اعجاز احمد نے جو کتاب میوات کی تاریخ اور آثار قدیمہ پر لکھی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ یہ کتاب میوات کی تاریخ کی پہلی کتاب ہوگی جس میں میوات کی تاریخ اور آثار قدیمہ کے حقائق کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہیریٹیج آف میوات کے مصنف ڈاکٹر اعجاز احمد یاسین میوڈگری کالج، نوح میں شعبۂ تاریخ کے سیکشن انچارج ہیں۔ پروفیسر اعجاز اس کتاب کے علاوہ 6 اور دوسری کتابیں اور 10 ریسرچ بک لکھ چکے ہیں۔ ہیریٹج آف میوات کے بارے میں پروفیسر اعجاز احمد نے بتایا کہ میوات آثار قدیمہ اور تاریخ کے میدان میں مالا مال ہے۔ پروفیسر اعجاز نے کہا کہ ان کی اس مہم میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور میوات کے اس وقت کے ڈپٹی کمشنر بلراج سنگھ مور نے کافی تعاون کیا بلکہ ڈی سی مور نے ہیریٹج آف میوات کو میوات ڈیولپمنٹ ایجنسی سے شائع بھی کروایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 مارچ 2016

کلیات تمکین امروہوی

نئی دہلی: تحقیق بے حد دقت طلب کام ہے اور وہ بھی کسی کلیات کی تحقیق و تدوین کا بیڑا اٹھانا ایک مشکل امر ہے۔ سید علی ذہین نقوی نے اپنے پردادا کا کلام 'کلیات تمکین امروہوی' شائع کیا جس کے لیے وہ یقیناً مبارکباد

کے مستحق ہیں۔ ان خیالات کا اظہار 'کلیاتِ تمکین امروہوی' کے اجرا کے موقعے پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر خالد محمود نے بطور مہمان اعزازی جلسے میں کیا۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد عزیز الدین نے کہا کہ زمینداری کے دور میں عام طور پر لوگ علم سے دور ہو چکے تھے لیکن تمکین امروہوی نے نہایت ہی عمدہ علمی و ادبی کام کیا۔ 'کلیات تمکین امروہوی' کا اجرا کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ نئی نسل عموماً کلاسیکی اصناف سے واقف نہیں ہے۔ اس کلیات میں تمام ہیئتیں اور اصناف موجود ہیں جس کے نتیجے میں یہ کتاب بے حد اہم ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر توقیر احمد خان، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر کوثر مظہری اور ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے بھی اظہار خیال کیا۔ جلسے کی نظامت پروفیسر شہزاد انجم نے کی جبکہ مہمانوں کا شکریہ ریسرچ اسکالر سلمان فیصل نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 اپریل 2016

برفیلی زمین کا سورج

نئی دہلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز اور نیشنل سروس اسکیم ممبئی یونیورسٹی کے اشتراک سے شنکر راؤ چوہان آڈی ٹوریم، ممبئی یونیورسٹی کالینہ کیمپس کے شاندار وسیع و عریض ہال میں تاجدار تاج کے تیسرے شعری مجموعے 'برفیلی زمین کا سورج' کی تقریب رونمائی کا انعقاد کیا گیا۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع کمشنر لسانی اقلیتی کمیشن نے کتاب کے اجرا کی خوشگوار رسم انجام دی۔ ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے اپنے تبصراتی مقالے میں کہا کہ ان کی شاعری میں سماجی، تہذیبی اور معاشرتی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں، تاریخی و عمرانی واقعات کا عکس بھی مل جاتا ہے اور فلسفیانہ گہرائیاں و گیرائیاں بھی۔ اس موقعے پر سپریم کورٹ کے وکیل اور عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین عبدالرحمن اور روزنامہ 'انقلاب' کے مدیر معروف صحافی شاہد لطیف نے اپنے تاثر پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اپریل 2016

دھوپ چھاؤں

نئی دہلی: فاؤنڈیشن فار کریٹیو ایج اینڈ کمیونی کیشن کی کلچرل ونگ پرواز کے زیر اہتمام اور عرشیہ پبلی کیشنز کے تعاون سے فہیم جوگاپوری کے تازہ ترین مجموعہ کلام دھوپ چھاؤں کی تقریب رسم اجرا ارشاد الحق بلاک تیکونہ پارک جامعہ نگر میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت پروفیسر کوثر مظہری نے کی اور فصیح اکمل بطور مہمان خصوصی موجود رہے، نظامت کے فرائض ڈاکٹر رحمان مصور نے ادا کیے۔

اس موقعے پر پروفیسر کوثر مظہری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ فہیم جوگاپوری کی شاعری میں گہرا جمالیاتی شعور ہے۔ وہ دور حاضر کی تلخ سچائیوں کو لفظوں کے پیرائے میں ڈھال کر ایسی شاعری کی تخلیق کرتے ہیں جو سیدھے قارئین کے دل میں اتر جاتی ہے۔ فصیح اکمل نے فہیم جوگاپوری کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے یہاں شاعری صرف من بہلاؤ کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ حقیقتوں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر گفتگو کرنے کا نام ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 13 اپریل 2016

رسالہ 'تمثیل نو'

دربھنگہ: ماہنامہ تمثیل نو دربھنگہ کے اردو صحافت پر خصوصی شمارہ کی رسم اجرا ڈاکٹر عابد معز نے انجم دی۔ ماہنامہ تمثیل نو کے 416 صفحات پر مشتمل اس خصوصی شمارے میں اردو صحافت کے مختلف گوشوں پر سرکردہ صحافیوں، ادیبوں اور دانشوروں کے مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ گوشہ مضامین میں مختلف موضوعات پر نگارشات شامل ہیں۔ گوشہ نظم میں ممتاز شعرا کا کلام شائع کیا گیا ہے۔ 50 سے زائد کتابوں پر تبصرے شائع کیے گئے ہیں۔ جبکہ ادبی دنیا سے رخصت ہونے والے 69 شخصیات سے متعلق معلوماتی خبرنامہ اس خصوصی شمارے کی خاصیت ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اس موقعے پر 21 ویں صدی کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر عابد معز نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 12 مارچ 2016

'اقبال ایک رودِرواں'

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری کے ہاتھوں ڈاکٹر محمد سلیم کی تصنیف 'اقبال ایک رودِرواں (بائیوگرافی آف علامہ اقبال)' کی رونمائی وائس پریزیڈنٹ کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ اس موقعے پر نائب صدر جمہوریہ نے ڈاکٹر محمد سلیم کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک محنتی شخص ہیں، جنھوں نے اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ مجھے حیرت ہے کہ میرے 60 سالہ مطالعہ کے باوجود میں جو نہ کر سکا وہ ڈاکٹر سلیم نے 2 سال میں تین کتابیں لکھ کر دکھا دیا۔ ڈاکٹر محمد سلیم نے اپنی کتاب کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کی سوانح سے متعلق میں نے کئی کتابیں پڑھیں ان میں کئی کمیاں ملیں اور میں نے محسوس کیا کہ ایسی کتاب لکھوں جس میں ان کی شخصیت کے مطابق پرانی کتابوں کا نچوڑ ہو۔ اس کتاب میں اقبال کی خوبیوں کو ایمانداری سے پیش کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر مولانا محب اللہ ندوی نے اظہار تشکر کیا اور نظامت کے فرائض عبدالحفیظ نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اپریل 2016

اردو ادب اور انسانی اقدار کی بازیافت

مالیرکوٹلہ: پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے شعبۂ اردو فارسی کی ریسرچ اسکالر عمرانہ خاتون کے تنقیدی مضامین پر مشتمل مجموعہ 'اردو ادب اور انسانی اقدار کی بازیافت' کی رسم اجرا مالیرکوٹلہ کلب میں منعقدہ خصوصی تقریب میں عمل میں آئی۔ رسم اجرا تقریب کے مہمانوں میں اظہار عالم گورلولین سنگھ سدھوآئی۔ ہرجیت سنگھ سوہی کے علاوہ کثیر تعداد میں اردو قلمکار موجود تھے۔ اس موقعے پر جن دانشوروں نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی ان میں پروفیسر ڈی ڈی بھٹی، نریندر پال سنگھ، ڈاکٹر محمد جمیل، منکت سنگھ، ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر فرزانہ خلیل، ڈاکٹر محمد شکیل اختر، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ڈاکٹر محمد سلیم زبیری، ایم انوار انجم، ڈاکٹر منظور حسن کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 اپریل 2016

آنند نرائن ملا حیات وکمالات

نئی دھلی: گرین پیجز پبلشنگ کمپنی اور مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو کے زیر اہتمام آصف اعظمی اور عزیز نبیل کی تحقیق وتدوین پر مشتمل کتاب 'آنند نرائن ملا حیات وکمالات' کی باوقار رونمائی بدست محمد حامد انصاری، نائب صدر جمہوریہ ہند ان کی رہائش گاہ پر عمل میں آئی۔ تقریب کی صدارت معروف وکیل وممبر پارلیمنٹ مجید میمن نے کی جبکہ مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو کے بانی وسرپرست شکیل احمد صبر حدی شکریہ کے کلمات ادا کیے۔ اسٹیج پر موجود آنند نرائن ملا کی صاحب زادی چترا کول ملا بھی حاضرین کی توجہ کا مرکز تھیں۔ تقریب میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات، اساتذہ، صحافی، شعرا اور

ارباب فکر ونظر موجود تھے، جن میں انجمن محبان اردو قطر کے سرپرست حسن عبدالکریم چوگلے، بزم اردو قطر کے سرپرست محمد صبیح بخاری، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر فاروق، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر تبسم نقوی، شبیہ حیدر، جگدیش پرکاش، دھمیندر پرکاش، راما پانڈے، طلعت عزیز، رخشندہ روحی، سراج نقوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نائب صدر جمہوریہ ہند، محمد حامد انصاری نے کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے آنند نرائن ملا کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا اور آصف اعظمی اور عزیز نبیل کی اس مشترکہ کاوش کو ایک تاریخ ساز کارنامے سے تعبیر کیا۔ صدر محفل مجید میمن نے کہا کہ اردو ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب اور جمہوری قدروں کی آئینہ دار ہے۔ جنھوں نے نہ صرف اپنے خون جگر سے گلشن اردو کی آبیاری کی بلکہ اپنے اعمال وافکار سے آج بھی زبان زد خاص وعام ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 مئی 2016

پانچویں سمت

بنگلور: 27 اپریل سلمی صنم کے افسانے موجودہ عہد کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے آج کی عورت کے نہ صرف مظلوم ومجبور چہرے سے نقاب کشائی کی ہے بلکہ انہیں ظلم کے خلاف احتجاج بلند کرنے کی طاقت بھی عطا کی ہے۔ یہ جملے صدر شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے تھے۔ وہ دارالسلام عمارت کے لیکچر ہال میں محترمہ سلمی صنم کے تیسرے افسانوی مجموعے پانچویں سمت کا اجرا

بطور مہمان خصوصی کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے مزید کہا کہ سلمی صنم کے افسانے ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سائنس کا استعمال انہی ان کے ہمعصروں میں ممیز وممتاز کرتا ہے۔ ان کے متعدد افسانے 'پانچویں سمت' میری تھکی ہوئی ناری، طور پر گیا ہوا شخص، پت جھڑ کے لوگ، مٹھی میں بند چڑیا، سورج کی موت، آدھا خدا وغیرہ انھیں بطور افسانہ نگار مستحکم بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ جلسے کے دوسرے مہمان محترم عزیز اللہ بیگ چیرمین، کرناٹک اردو اکادمی نے اس موقعے پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ سلمی صنم نے کرناٹک کا نام روشن کیا ہے۔ ان کے افسانے ہمارے آس پاس کے زندہ واقعات ہیں۔ ہمیں ان سے کافی توقعات ہیں۔ صدارت کرتے ہوئے محترم پروفیسر م ن سعید صاحب نے اس موقعے پر سلمی صنم کے افسانوں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ سلمی صاحبہ کے افسانے خواتین کے مسائل کو نہ صرف اٹھاتے ہیں بلکہ ان کا تدارک بھی پیش کرتے ہیں اور یہ بات خاصی اہم ہے۔ محفل اجرا کی ابتدا مہمان خصوصی کی تلاوت کلام پاک سے ہوئی۔ بعد ازاں محترم منیر احمد جامی نے نعت پیش کی اور ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور دیگر مہمانوں کے ہاتھوں سلمی صاحبہ کے افسانوی مجموعے کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر صاحب کتاب نے ایک افسانہ 'گدھ' سنایا جسے سامعین نے کافی سراہا۔ محفل کو کیرلہ سے آئے کے پی شمس الدین نے بھی خطاب کیا۔

نظامت کے فرائض محترم منیر احمد جامی نے بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیے۔ آخر میں سلمیٰ صنم صاحبہ کی بیٹی فاطمہ ام ہانی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام میں خاصی تعداد میں ادبا و شعرا اور علمی شخصیتوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' نئی دہلی، 24 مئی 2016

کلیات کلیم عاجز

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شام شہریاراں کے موقعے پر معروف ادیب و نقاد اور محقق فاروق ارگلی کی مرتبہ کتاب 'کلیات کلیم عاجز' پر شام شہریاراں کے موقعے پر رسم اجرا کے ساتھ ساتھ ایک اہم مذاکرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ پروفیسر کلیم عاجز ایک مقبول لب و لہجے کے شاعر تھے چونکہ عوامی زندگی سے بہت قریب تھے لہٰذا ان کی شاعری میں سماجی پہلو بھی کافی نظر آیا ہے۔ اس بات کے بھی معترف ہیں کہ وہ اپنے عہد کے بڑے شاعر تھے۔ پروفیسر اختر الواسع جو اس جلسے میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے آپ نے بھی اس کلیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کلیم عاجز کے کلام کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں دکھ بھروں کی حکایتیں اور حزن و ملال کی کہانیاں ہیں۔ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے بھی شرکت کی اور اپنے خیالات پیش کیے۔ اس موقعے پر کلیات کلیم عاجز کے مرتب فاروق ارگلی نے بھی اس بات کا اظہار کیا کہ کلیم عاجز ہمیشہ سے میرے پسندیدہ شاعر رہے، ان کی تخلیقات منتشر تھیں میں نے فرید بک ڈپو کے تعاون سے ان کے تمام مجموعوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ ان کا کلام اردو شاعری کے خزانے میں ایک قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں تہنیت پیش کرتا ہوں فاروق ارگلی کو کہ انھوں نے کلیم عاجز کے شعری سرمائے کو یکجا کرکے ہمیں ایسا علمی تحفہ دیا ہے جسے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ معروف شاعر متین امروہوی نے بھی اس محفل میں اپنے منظوم کلام سے کلیم عاجز کو خراج عقیدت پیش کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 اپریل 2016

ادب جہاں

27 مارچ 2016 مغربی بنگال اردو اکادمی کے مولانا آزاد آڈیٹوریم میں بزمِ شہر نشاط کے زیر اہتمام ڈاکٹر معصوم شرقی کی تیسری پُر وقار تصنیف 'ادب جہاں' کی رسم رونمائی ہوئی۔ اس موقعے پر قیصر شمیم، پروفیسر سلیمان خورشید، کریم رضا مونگیری،

بلال حسن کے علاوہ دیگر شرکا نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ جلسے کی صدارت حضرت قیصر شمیم نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے انجام دیے۔ جن کی شائستگی اور شگفتہ بیانی کو سامعین نے خوب خوب سراہا۔ ممتاز معالج اور سکریٹری الحمد ایجوکیشنل آرگنائزیشن ڈاکٹر نہال احمد کی تلاوت کلام پاک سے محفل کا آغاز ہوا اور بزمِ شہر نشاط کے معتمد شمس افتخاری کے ہدیۂ تشکر سے جلسے کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: سید حسن، مدرس مسلم پریسی ڈینسی ہائی اسکول، کولکاتا 3 مئی 2016

وفیات

معروف شاعر ملک زادہ منظور احمد

لکھنؤ: ''عجیب درد کا رشتہ ہے ساری دنیا سے، کہیں ہو جلتا مکاں اپنا گھر لگے ہے مجھے۔'' اس دنیا کے درد کو اپنا درد سمجھنے والے عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے 22 اپریل بروز جمعہ کو دوپہر مقامی جگرانی اسپتال میں اس جہانِ فانی کو الوداع کہہ دیا۔ وہ گذشتہ کئی دنوں سے علیل تھے۔ ان کے انتقال کی خبر عام ہوتے ہی ان کے اور اردو کے چاہنے والوں میں غم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انور جلال پوری کے مطابق دیر رات خرم نگر واقع مسجد فاطمی میں نماز جنازہ ادا ہوئی اور بعد میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں ان کو وہیں قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد 17 اکتوبر 1929 میں امبیڈکر نگر کے بھدہڑ میں پیدا ہوئے اور 87 سال کی عمر میں 22 اپریل 2016 کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ اپنے پیچھے دو بیٹے اور 6 بیٹیاں چھوڑ گئے ہیں۔ ان میں چار بیٹیوں کی شادیاں ہو گئی ہیں۔ بڑے بیٹے ملک زادہ جاوید شاعر ہیں اور چھوٹے بیٹے ملک زادہ پرویز اسلامیہ کالج میں تاریخ کے لیکچرر ہیں۔ ڈاکٹر ملک زادہ نے 1963 میں مولانا ابوالکلام آزاد پر پی ایچ ڈی کی تھی۔ بڑی تعداد میں ان کو تمام ایوارڈوں سے نوازا گیا تھا۔ حال ہی میں غالب ایوارڈ ملا تھا۔ ملائم سنگھ حکومت میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اردو اکادمی کے صدر بھی رہے۔ انھوں نے 10 کتابیں بھی لکھیں۔ مشاعروں کی نظامت میں سامعین کو باندھ دیتے تھے۔ ملک زادہ منظور احمد اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ شخص نہیں بلکہ شخصیت تھے۔ ان کا انتقال پوری اردو دنیا کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ صوبے کے گورنر رام نائک اور سماجوادی پارٹی کے سربراہ ملائم سنگھ یادو نے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے انتقال پر تعزیت پیش کرتے ہوئے ان کو بہترین شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر ملک زادہ کا دنیا سے رخصت ہونا اردو ادب کا بہت بڑا نقصان ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اپریل 2016

جوگیندر پال

نئی دهلی: اردو کے ممتاز فکشن نگار جوگیندر پال کا 23 اپریل 2016 کو انتقال ہو گیا۔ ان کی آخری رسومات لودھی روڈ شمشان گھاٹ میں پوری کی گئیں جہاں شریک حیات کرشنا، بیٹی اور بیٹے کے علاوہ اہل خانہ، دوستوں اور ادیبوں نے نمناک آنکھوں رخصت کیا۔ ان کی آخری رسومات میں ڈاکٹر عبدالحی، حقانی القاسمی اور شاہد اختر انصاری پر مشتمل قومی کونسل کے ایک وفد نے بھی شرکت کی۔ پروفیسر جوگیندر پال 5 ستمبر 1925 کو سیالکوٹ (پاکستان) میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ غربت کے باوجود انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور 1941 میں گنڈا سنگھ ہائی اسکول، سیالکوٹ سے میٹرک اور مرے کالج سیالکوٹ سے 1945 میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ جب تقسیم وطن عمل میں آئی تو جوگیندر پال کا خاندان سیالکوٹ سے انبالہ منتقل ہو گیا۔ ان کی شادی نیروبی کی ہندوستانی دوشیزہ کرشنا سے 1948 میں ہوئی اور 1949 میں جوگیندر پال اپنی شریک حیات کے ساتھ افریقی ملک کینیا کے لیے روانہ ہو گئے۔ 1955 میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر انگریزی زبان سے ایم اے کیا۔ 1963 میں ہندوستان واپس آ گئے اور 1964 میں سرسوتی بھون پوسٹ گریجویٹ کالج اورنگ آباد میں پہلے انگریزی کے پروفیسر اور صدر شعبہ پھر ایک سال بعد کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ 1978 میں نوکری چھوڑ کر پروفیسر جوگیندر پال دہلی آ گئے اور آخری وقت تک یہیں قیام کیا۔ پرفیسر جوگیندر پال فکری اعتبار سے ترقی پسند ادبی تحریک کے حامی تھے اور اسی نظریے کے تحت اردو ادب میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ 1995 سے 1999 تک کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر بھی رہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1944 سے ہوتا ہے۔ ان کی پہلی کہانی 'تعبیر' 1944 میں مرے کالج میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی پہلی مطبوعہ کہانی 'تیاگ سے پہلے' 1945 میں ماہنامہ ساقی دہلی میں

شائع ہوئی۔ جوگیندر پال نے اپنے ادبی سفر میں افسانہ، افسانچہ اور ناول، ناولٹ فکشن قلم بند کیے جو اردو دنیا میں کافی مقبول ہوئے۔ دھرتی کا لال 1961، میں کیوں سوچتی ہوں 1962، رسائی 1969، مٹی کا ادراک 1970، لیکن 1977، بے محاورہ 1978، بے آمد و رفت ناولٹ، ایک بوند لہو کی 1962، ناد ید 1983، خواب رو 1991، ناول اور سلوٹیں 1975، کتھا نگر افسانچوں کا مجموعہ کے علاوہ رابطہ 1997، بے اصطلاح 1998 تنقیدی مضامین، آپ بیتی، سفرناموں اور مکالموں پر مبنی کتابیں بھی ان کے ادبی آثار میں شامل ہیں۔ پروفیسر جوگیندر پال کی بیشتر تخلیقات ہندی، انگریزی اور پنجابی زبان میں ترجمہ ہوکر شائع ہوگئی ہیں۔ جوگیندر پال کو غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے غالب ایوارڈ اور دہلی اردو اکادمی کی جانب سے سب سے بڑا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے علاوہ کئی دوسرے بڑے ایوارڈ بھی ملے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 24 اپریل 2016

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

علی گڑھ: معروف دانشور، نقاد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے سبکدوش پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا 4 مئی 2016 کو 91 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ دوپہر تین بجے انھیں یونیورسٹی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا جہاں وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ)، پرووائس چانسلر بریگیڈیئر ایس احمد علی (ریٹائرڈ) سمیت سیکڑوں سبکدوش اساتذہ، سینئر اساتذہ اور ان کے رشتے داروں اور غم گساروں نے ان کے آخری سفر میں حصہ لیا۔ وہ 1925 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ پروفیسر انصاری نے دنیا کے باوقار تعلیمی ادارے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی جس کے بعد وہ اے ایم یو کے شعبہ انگریزی میں استاد کے عہدے پر فائز ہوئے اور 1985 میں یہیں سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی کئی کتب امریکہ اور لندن سے شائع ہوئی تھیں۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ وہ اردو کے بھی بڑے دانشور، محقق اور نقاد تھے۔ سرسید احمد خاں، غالب اور علامہ اقبال پر انھوں نے کافی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ وہ اردو جریدے 'نقد و نظر' کے مدیر و پبلشر تھے۔ پروفیسر انصاری کی مذکورہ قابل قدر خدمات پر انھیں ساہتیہ اکادمی اور اردو اکادمی سے بھی انعامات حاصل ہو چکے ہیں۔ 2006 میں گورکھپور یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا تھا۔ پسماندگان میں ان کی دو بیٹیاں پروفیسر روشن آرا (فلسفہ) اور پروفیسر عفت آرا (ویمنس کالج) ہیں۔

روزنامہ 'جدید خبر'، دہلی، یکم مئی 2016

شکیل الرحمٰن

نئی دھلی: اردو کے ممتاز ادیب و نقاد اور سابق مرکزی وزیر صحت ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا 9 مئی کی شب کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم 85 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ مرحوم کی طبیعت کافی دنوں سے ناساز چل رہی تھی۔ فورٹس اسپتال (گڑگاؤں) میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم ڈاکٹر شکیل نے کوئی 25 کتابیں تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ اسٹیج ٹی وی اور ریڈیو کے لیے 50 سے زیادہ تمثیلی کاوشیں بھی انجام دیں۔ درون ملک جہاں وہ ایک سے زیادہ قومی ایوارڈوں سے نوازے گئے وہیں پاکستان میں انھیں احمد ندیم قاسمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ مرحوم بہار، متھلا اور کشمیر کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی رہے۔ پٹنہ سے ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹر شکیل اڈیشہ میں لکچرار ہوئے پھر سرینگر (جموں کشمیر) چلے گئے۔ مرحوم نے 1961 میں پریم چند کی افسانہ نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھا جس پر انھیں ڈی لٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا گیا۔ مرحوم جمالیات کے زبردست اسکالر تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے 'قرآن حکیم جمالیات کا سرچشمہ' نامی ایک کتاب بھی لکھی اور موت کے تصور میں بھی جمالیات کی دریافت تک آگے بڑھے۔ مجموعی طور پر وہ نفسیات کو تمام علوم سے مربوط سمجھتے تھے۔ 'آشرم' ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی منفرد خودنوشت سوانح حیات ہے جو 1956 تک کے واقعات پر محیط ہے۔ آشرم کی نثر پر قاری کو شاعری کا گماں گزرتا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن کی نماز جنازہ 11 مئی کو جامع مسجد ادھ چینی اربندو مارگ نزد ایس ای آر ٹی میں ادا کی گئی اور شیخ نجیب الدین متوکل چشتی خلیفہ اور برادر حقیقی فریدالدین شکرگنج کے مزار سے متصل قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کی تجہیز و تکفین میں دہلی کی جامعات کے اساتذہ، طلبا کے علاوہ ڈاکٹر شمس اقبال، شاہنواز خرم، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری، حقانی القاسمی پر مشتمل قومی کونسل کے وفد نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'جدید خبر'، دہلی، 11 مئی 2016

اسلم محمود

لکھنؤ: لکھنؤ کی معروف ادبی شخصیت اور کتابوں سے والہانہ عشق رکھنے والے اسلم محمود کا یکم مئی 2016 کو شب میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین 2 مئی کو لکھنؤ کے نشاط گنج پیپر مل قبرستان میں ہوئی۔ پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ بیٹا ساجد محمود ہیں۔ اسلم محمود ریلوے بورڈ کے ایڈیشنل ممبر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ وہ کسی زمانے میں

نارتھ ایسٹ ریلوے کے ڈی آر ایم بھی تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اندرا نگر لکھنؤ میں مقیم تھے۔ اسلم محمود مرحوم کو بچپن سے کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا اور اس وقت ان کی ذاتی لائبریری میں پندرہ ہزار سے زائد نادر و نایاب کتابیں ہیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور فارسی کی کتابیں بھی ان کے یہاں تھیں۔ انھوں نے اودھ اور لکھنوی تہذیب و تاریخ پر علیحدہ سے ایک الماری بنا رکھی تھی۔ ان دنوں اودھ کی تاریخ و تہذیب اور ادبی اصناف کے حوالے سے انگریزی زبان میں ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے جو آخری مراحل میں تھی۔ ان کے انتقال پر مختلف علمی اور ادبی شخصیات نے گہرے رنج کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، 4 مئی 2016

فرید نعمانی

رامپور: ملک گیر پیمانہ پر مشاعروں کو رونق بخشنے والے معروف شاعر فرید نعمانی کا 8 اپریل 2016 انتقال ہوگیا۔ تقریباً 56 سالہ مرحوم محکمہ سیل ٹیکس میں ملازم تھے۔ انتہائی سادگی سے زندگی بسر کرنے والے فرید نعمانی نے ہندوستان کے ان گنت مشاعروں میں اپنے کلام پر داد و تحسین حاصل کی۔ مرحوم کی نماز جنازہ رات 10 بجے مزار ٹاٹ شاہ میاں کی مسجد میں ادا کی گئی بعد ازاں مزار سے ملحق قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ تدفین کے موقع پر معروف شعرا اظہر عنایتی، سید سعید رامش، مرتضیٰ ساحل، نعیم عجمی، س ش عالم، طاہر فراز، جاوید نسیمی، سدا فتخار طاہر، منظر واحدی، سید شکیل غوث، عرفان دانش، ثاقب رامپوری، شکیب ماہر شفائی سمیت کثیر تعداد میں علم و ادب سے منسلک شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 19 اپریل 2016

سید محمد احمد قادری

سہارنپور: ممتاز حکیم، الحاج سید محمد احمد قادری کا 16 اپریل 2016 کو اپنی رہائش گاہ جامعہ غوثیہ رضویہ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 75 سال تھی۔ پسماندگان میں 100 سالہ والدہ کے علاوہ

اہلیہ ایک بیٹی اور چار بیٹے ہیں اور مرحوم قادری، چشتی اور صابری سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت علامہ سید خلیل کاظمی خاکی امروہی کے خلیفہ تھے۔ مریدین اور متعلقین کا حلقہ کافی وسیع ہے جو ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ مرحوم کا بحیثیت طب نباض اطبا میں شمار ہوتا تھا اور روزانہ صبح اور شام کی نشست میں ایک ہزار مریضوں کو دیکھنے کا معمول تھا۔ مرحوم انتہائی خوش اخلاق ملنسار عبادت گزار اور نیک طبیعت شخص تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اپریل 2016

ایاز محمود

نئی دھلی: پرانی دہلی کی معروف سیاسی، سماجی شخصیت اور صحافی ایاز محمود کا 16 اپریل 2016 کو علی الصبح انتقال ہوگیا۔ وہ ان دنوں مسلم لیگ سے وابستہ تھے اور اردو کے

مجاہد، نیک سیرت، ملنسار طبیعت کے مالک تھے اور روزنامہ اخبار مشرق کے نمائندہ بھی تھے۔ 4 روز قبل دماغ کی نس پھٹ جانے کی وجہ سے انھیں اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز عصر ڈی ڈی اے فلیٹ ماتا سندری روڈ کی مسجد فرش والی میں ادا کی گئی اور تدفین قبرستان اہل اسلام دہلی گیٹ پر عمل میں آئی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں بتائی جاتی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اپریل 2016

پروفیسر عضد الدین

نئی دھلی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے پروفیسر عضد الدین کا 17 اپریل 2016 کو ذاکر باغ جامعہ نگر نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم ملنسار، بااخلاق اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان کی عمر 76 برس تھی۔ ان کے پسماندگان میں 4 بیٹے

اور 2 بیٹیاں ہیں۔ اہلیہ کا پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے۔ مرحوم کا تعلق اعظم گڑھ کے منگراوہ گاؤں سے تھا۔ ان کی نماز جنازہ ذاکر باغ کی مسجد میں بعد نماز ظہر ادا کی گئی اور تدفین بعد نماز عشا اے ایم یو کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اپریل 2016

شاہد علی خاں کی اہلیہ کا انتقال

نئی دھلی: مکتبہ جامعہ کے سابق جنرل منیجر اور معروف جریدے 'نئی کتاب' کے ایڈیٹر شاہد علی خاں کی اہلیہ کا 17 اپریل 2016 کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 60 برس تھی اور وہ تقریباً 6 ماہ سے علیل تھیں۔ پسماندگان میں شوہر شاہد علی خاں کے علاوہ دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ مرحومہ کی تدفین بٹلہ ہاؤس جامعہ قبرستان میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اپریل 2016

حراج عقیدت

ذیشان لودھی

نئی دھلی: سینئر صحافی اور کئی اردو جرائد کے بانی مدیر ذیشان لودھی کے انتقال پر سینئر اردو صحافیوں نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ شاہد صدیقی نے کہا کہ ذیشان

لودھی ہر قسم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے تھے اور انھیں مشکل سے مشکل کام کو انجام دینے سے گریز نہیں تھا۔ م افضل نے کہا کہ ذیشان لودھی نے ایک مثالی زندگی گزاری اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اردو صحافت کی ترقی کے لیے صرف کیں۔ معصوم مرادآبادی نے کہا کہ ذیشان لودھی ایک انتہائی مخلص اور بے لوث انسان تھے اور وہ اپنے دوستوں پر سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ واضح رہے کہ ذیشان لودھی کا برین ہیمرج سے انتقال ہوگیا۔ وہ کچھ عرصے سے ایک پیچیدہ ذہنی بیماری کا شکار تھے۔ ان کی عمر 59 برس تھی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ان کی تدفین نئی دہلی کے بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم نے اردو کے کئی معیاری جرائد نکالے ہیں جن میں 'الف لیلیٰ' ماہنامہ 'پاکیزہ' اور 'عالمی جرائم' کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اپریل 2016

مشتاق کمال پوری

سکندر آباد: کہنہ مشق استاد شاعر اور بزم خلوص ادب کے سکریٹری مشتاق کمال پوری کے انتقال کی خبر سے ادبی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی مقامی اور ضلع کے متعدد شعرائے کرام ان کے جنازے میں شریک ہوئے اور انھیں خراج عقیدت

پیش کیا۔ مرحوم مشتاق کمال پوری کی شاعری میں قدیم وجدید کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے انتقال پر انجمن محبان اردو (رجسٹرڈ) کے جنرل سکریٹری مقصود جالب، امان اللہ خالد، بزم خلوص وادب کے بانی ع م کوثر، ناصر برنی، لیاقت کمال پوری، یوسف صحرائی، ارشاد احمد شرر، رہبر برنی، اسرار برنی، مومن اکبر پوری، زبیر شاد وغیرہ نے اظہار تعزیت پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 اپریل 2016

گوالیار میں پروفیسر آفاق احمد کی یاد میں ایک ادبی وتعزیتی نشست

گوالیار: 24 اپریل 2016 بروز اتوار 10 بجے دن میں انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ گوالیار کی جانب سے جیواجی یونیورسٹی کیمپس میں پروفیسر آفاق احمد کی یاد میں ایک ادبی، تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت

پروفیسر وی پی سکسینا (سابق وائس چانسلر، جیواجی یونیورسٹی۔ گوالیار) نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری (صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کملا راجا گرلز پی جی آٹونامس کالج، گوالیار) نے انجام دیے۔ تمہیدی کلمات اور تعارفی گفتگو کرتے ہوئے کہا ''آفاق صاحب نہ صرف بھوپال بلکہ صوبہ مدھیہ پردیش کے وقار وافتخار تھے۔'' محقق وناقد جناب وقار صدیقی (سکریٹری انجمن ترقی اردو، سابق پرنسپل گورنمنٹ اسکول، گوالیار) نے فرمایا ''موصوف اردو کے فروغ کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔ نشست کے صدر پروفیسر وی پی سکسینا نے بتایا کہ ''آفاق صاحب کے انتقال سے میرے لیے بھوپال خالی ہوگیا، اب ہمارا فرض ہے کہ آفاق صاحب کی خواہش کے مطابق گوالیار میں اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے ہم سب مل کر کوششیں کریں''

پریس ریلیز: وسیم افتخار انصاری، 29 اپریل 2016

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

وحشت کلکتوی (مونوگراف)

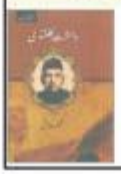

مصنف: کلیم حاذق
صفحات: 140
قیمت: -/82 روپے

عصمت جاوید (مونوگراف)

مصنف: غضنفر اقبال
صفحات: 102
قیمت: -/68 روپے

بیگم سلطان جہاں (مونوگراف)

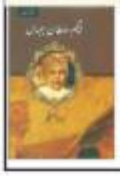

مصنف: سیما صغیر
صفحات: 144
قیمت: -/83 روپے

راجیندر منچندا بانی (مونوگراف)

مصنف: عمیر منظر
صفحات: 122
قیمت: -/76 روپے

سراج اورنگ آبادی (مونوگراف)

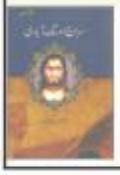

مصنف: سید یحییٰ نشیط
صفحات: 129
قیمت: -/78 روپے

جگت موہن لال رواں (مونوگراف)

مصنف: صغیر افراہیم
صفحات: 146
قیمت: -/86 روپے

میر غلام حسن دہلوی (مونوگراف)

مصنف: قاضی عبدالرحمٰن ہاشمی
صفحات: 128
قیمت: -/77 روپے

محمد حسین آزاد (مونوگراف)

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 152
قیمت: -/85 روپے

غلام رسول نازکی (مونوگراف)

مصنف: قدوس جاوید
صفحات: 87
قیمت: -/65 روپے

رام لعل: حیات وفن (مونوگراف)

مصنف: مظہر محمود
صفحات: 201
قیمت: 105 روپے

شاد عارفی (مونوگراف)

مصنف: مظفر حنفی
صفحات: 142
قیمت: 85 روپے

آغا حشر کاشمیری (مونوگراف)

مصنف: یعقوب یاور
صفحات: 132
قیمت: -/81 روپے

شیخ محمد ابراہیم ذوق (مونوگراف)

مصنف: کوثر مظہری
صفحات: 109
قیمت: -/72 روپے

ملا رموزی (مونوگراف)

مصنف: محمد نعمان خاں
صفحات: 128
قیمت: -/80 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد دوازدہم)

مصنف: محمد انصار اللہ
صفحات: 572
قیمت: -/243 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد سیزدہم)

انتخاب: محمد انصار اللہ
صفحات: 618
قیمت: -/259 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد چہاردہم)

انتخاب: محمد انصار اللہ
صفحات: 505
قیمت: -/215 روپے

ملاقاتیں (مشاہیر کے انٹرویو)

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 578
قیمت: -/241 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, June-2016, Vol.18, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/05/2016**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025